

جلد نمبر ۳



حسین نجفی جارا
علامہ

مکتبہ الوارث النجف دریاخان ضلع بہار

جلد سوم - غفر

فہرست

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۷۲	عورت کی ضرر رسانی سے باز رہنے کا حکم	۷۲	سوال و جواب	۷	پارہ ۲ رکوع ۸
۷۵	رکوع ۱۲	۷۵	رکوع ۱۱	۸	آلی محمد البواب اللہ ہیں
۷۶	ناجائز رواج	۷۶	مرتد کی قسمیں اور احکام	۹	حکم جہاد
۷۷	مطلقہ کا حق رضاع اور نان نفقہ	۷۷	شراب و جوئے کی حرمت کا بیان	۱۱	ہلاکت سے بچنے کا حکم
۸۲	عدت و نفات کا بیان	۵۰	یتیموں کی اصلاح کا حکم	۱۲	حج کا بیان
۸۳	عدت کے اندر پیغام نکاح کی ممانعت	۵۰	یتیموں کے مال کی حفاظت کا حکم	۱۳	کیفیت حج اور اس کے بعض مسائل
۸۴	غیر مدخولہ عورت کی طلاق	۵۱	مومن کا کافر سے رشتہ ناجائز ہے	۲۳	تمام اور کمال میں فرق
۸۶	نماز وسطیٰ کی تاکید	۵۲	رکوع ۱۲	۲۴	رکوع ۹ نکات علیہ
۸۷	نماز وسطیٰ کی تاویل	۵۳	حیض کا بیان	۳۰	آیت من یشرب
۹۰	دعائے قنوت کا بیان	۵۶	ازدواجی زندگی کا حقیقی مفاد	۳۱	رجعت کا بیان
۹۱	نماز خوف کا بیان	۵۹	ایلاہ کا بیان	۳۲	رکوع ۱۰
۹۲	طلاق شدہ عورتوں کے بعض احکام	۶۰	مطلقہ کی عدت کا بیان	۳۳	بنی آدم کے اختلاف پر اصولی و عقلی بحث
۹۳	نسوانی زندگی پر اسلام کے احسان	۶۱	مرد و عورت کے حقوق	۳۵	حقیقت انسان
۹۴	مسئلہ مسادات کی توضیح	۶۲	دورِ حاضر میں عورت کی آزادی کا تصور	۳۶	دجہ اختلاف
۹۷	سلسلہ نکاح	۶۵	رکوع ۱۳	۳۷	اختلاف کا علاج
۹۸	تعدد نکاح	۶۵	طلاق عدت و طلاق سنت کا طریقہ	۳۸	دجہ اشتباہ
۹۹	مسئلہ عدل اسلامی	۶۶	طلاق کی شرائط	۳۸	ضرورت دین
۱۰۱	عدت کی مصلحت	۶۸	طلاق عقل کی روشنی میں	۳۹	مصلحت جہاد
۱۰۲	خلاصہ بحث	۶۹	خلع و مبارات	۴۰	دینی اختلافات
۱۰۳	اشتراکیت کا پس منظر	۷۰	خلع و مبارات کے صحیحے	۴۱	ضرورت نبی
۱۰۸	موت کے بعد زندگی اور پھر موت	۷۱	نکتہ لطیفہ (تین طلاقیں)	۴۲	آزمائش کی پیش کش
۱۱۰	راہِ خدا میں خرچ	۷۲	طلاق بائن	۴۳	دعوت جہاد

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	حضرت یحییٰ کی حضرت عیسیٰ سے مشابہت	۱۶۱	سود کھانے والے کا عذاب	۱۱۲	طاہرات کا قصہ اور معیار انتخاب خداوندی
	کلام ملکوتی اور وسوسہ شیطانی میں فرق	۱۶۵	مقروض تنگدست کو مہلت دینا	۱۳۰	تابوت بنی اسرائیل
	حضرت یحییٰ کا شکم مادر میں بولنا	"	نقدی کی مصلحت	۱۳۲	طاہرات اور جالوت کی لڑائی
	انتخاب مریم	۱۶۷	رکوع نمبر	۱۳۳	حضرت داؤد کی شجاعت
	جناب بتول معطرہ کی سیادت	۱۸۲	قرضے کا بیان	۱۳۷	فلسفہ جذب و دفع
	سوال و جواب	۱۸۷	شب معراج کی باتیں		پارہ ۳
	بشارت عیسیٰ	۱۸۸	سورۃ آل عمران	۱۳۲	رکوع نمبر
	مسیح کی وجہ تسمیہ	۱۹۰	انجم اعظم		رکوع نمبر
	نبی اور رسول میں فرق	۱۹۱	انوار علمیہ	۱۳۵	تفسیر آیت الکرسی
	حیات مسیح		حکامات و مشابہات کا بیان	۱۳۶	آیت الکرسی کے خواص
	موت اور وفات میں فرق		راسخون فی العلم	۱۳۸	علیٰ نمکتہ
	نصاریٰ بھران کے قول کی تردید		تاویل قرآن کا مطلب	۱۳۹	العروۃ الوثقیٰ کی تاویل
	تفسیر آیت مباہلہ		رکوع ۱۰	۱۴۲	رکوع ۳
	واقعہ مباہلہ کے متعلق روایات		جنگ بدر کی طرف اشارہ		نمود کا حضرت ابراہیم سے مناظرہ
	رکوع ۱۵		مقام توحید	۱۴۵	موت کے بعد زندگی
	رکوع ۱۶		فضیلت اہل علم	۱۴۶	بخت نصر کا قصہ
	عباد و عبید میں فرق		دین اسلام	۱۴۷	انجام بخت نصر
	کتاب داہل کتاب		رکوع ۱۱	۱۴۸	حضرت ارمیاء کی موت
	تورات اور یہودیت		انوار علمیہ	۱۵۱	حضرت ابراہیم کا پرندوں کو زندہ ہوتے دیکھنا
	نصرانیت اور انجیل		جواز تکبیر	۱۵۲	رابطہ آیات و علمی نکات
	میشاق انبیاء		رکوع ۱۲	۱۵۳	رکوع نمبر
			آیت اعطفاہ	۱۵۴	خدا کی راہ میں خرچ کرنا
			حضرت مریم کی ولادت	۱۶۰	رکوع نمبر پاکیزہ رزق
			نکات علمیہ	۱۶۵	اسلام اور سرمایہ داری
			حضرت ذکریا کو حضرت یحییٰ کی بشارت	۱۶۹	رکوع ۶ - سود کھانے کا گناہ اور
					چند مسائل

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاَهْلِ ط قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ط

اور آپ سے دریافت کرتے ہیں پہلی رات کے چاندوں کے متعلق فرما دیجئے کہ یہ تعیین اوقات کا ذریعہ ہیں لوگوں کے لئے

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ

اور حج کے لئے اور نیکی یہ نہیں کہ تم گھروں میں آؤ پیچھے سے لیکن نیکی اس

الْبِرِّ مَنْ اتَّقَى وَاتَّوَابَ الْبُيُوتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ط وَاتَّقُوا اللَّهَ

کی ہے جو تقویٰ کرے اور آؤ گھروں میں دروازوں سے اور اللہ سے ڈرو

لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ ﴿۱۸۹﴾

تاکہ صلاح پاؤ

تفسیر رکوع ۸

يَسْأَلُونَكَ :- اس کے شان نزول کے متعلق وارد ہے کہ معاذ بن جبل نے عرض کی - یا رسول اللہ! یہودی لوگ ہم سے چاند کی بابت دریافت کرتے ہیں کہ یہ چھوٹا بڑا کیوں ہوتا رہتا ہے اور ہمیشہ یکساں حالت سے کیوں نہیں رہتا تب یہ آیت اتری - قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ :- خداوند کریم نے چاند کی کمی اور زیادتی کی مصلحت کو اس کے جواب میں ارشاد فرمایا - کہ اسی کمی و بیشی کی وجہ سے لوگوں کے وقتوں کی تعیین ہوتی ہے - روزوں کا زمانہ، افطار کا زمانہ، حج کا وقت، عورتوں کی عذت، حمل کا زمانہ اور ذودھ پلانے کی ميعاد وغیرہ - یہ سب باتیں اسی سے معلوم ہوتی ہے - اگر چاند ہمیشہ ایک حالت میں رہتا تو اس سے اوقات کی تعیین نہ کی جاسکتی - یعنی تمہارے سامنے علم ہیت کی باریکیاں اور علم الافلاک کی گتھیاں سلجھانے کی ضرورت نہیں - اور نہ تمہیں چاند کی زیادتی کے واقعی علل و اسباب پر اطلاع حاصل کرنا چنداں مفید ہے - البتہ اس کی مصلحتوں کا علم تمہارے لئے کسی حد تک فائدہ مند ہے اور وہ ہم بتائے دیتے ہیں -

وَلَيْسَ الْبِرُّ :- اس کے معنی میں کئی وجہیں بیان کی گئی ہیں -

۱۔ عرب لوگ احرام کے زمانے میں اپنے گھروں کے اندر دروازوں کے بجائے پیچھے کی طرف سے دیواروں میں نقب لگا کر آمد و رفت کرتے تھے بعض کہتے ہیں کہ قریش کا یہی دستور تھا پس یہ آیت اتری کہ نیکی کا معیار یہ نہیں ہے تم نے سمجھا ہوا ہے بلکہ نیکی تقویٰ کا نام ہے

(۲) بیوت سے مراد امور ہیں اور معنی یہ ہے کہ ہر کام کو اُسے طریقے سے کرنا خوبی کی بات نہیں۔ بلکہ خوبی و اچھائی اس میں ہے کہ تمام امور کی بجا آوری صحیح طریقہ سے ہو۔

(۳) مراد یہ ہے کہ نا اہل سے اچھائی کی اُمید رکھنا اچھا نہیں۔ بلکہ معروف کی امید اہل معروف سے ہی ہونی چاہیے۔

آل محمد ابواب اللہ ہیں | وَأَتُوا الْبَيْوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا : مجمع البیان میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آل محمد اللہ کے ابواب وسیلہ جنت کی طرف بلانے والے اور قیامت تک رہبری کرنے والے ہیں۔

اور جناب رسالت آپ نے فرمایا۔ اَنَا مَدِينَةُ الْعِلْمِ وَعَلَى بَابِهَا۔ وَلَا تُؤْتِي الْمَدِينَةَ إِلَّا مِنْ بَابِهَا۔ (میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے اور شہر میں دروازہ ہی سے داخل ہوا جاتا ہے۔ اور بردایت البصیر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ اوصیاء ہی اللہ کے وہ دروازے ہیں۔ جن سے آنے کا حکم ہے۔ اور اگر یہ نہ ہوتے تو اللہ کی معرفت نہ حاصل کی جاسکتی اور انہی کے ذریعہ سے خدائے مخلوق پر حجت تمام فرمائی ہے۔ اسود بن سعید سے مروی ہے کہ میں امام محمد باقر علیہ السلام کے پاس حاضر تھا۔ میرے پوچھے بغیر آپ نے ارشادات عالیہ کو یوں زبان سے جاری فرمایا کہ نَحْنُ حُجَّةُ اللَّهِ وَبَابُ اللَّهِ وَنَحْنُ لِسَانُ اللَّهِ وَنَحْنُ وَجْهُ اللَّهِ وَنَحْنُ عَيْنُ اللَّهِ وَنَحْنُ وَلَاؤُا أَمْرِ اللَّهِ فِي عِبَادِهِ (ہم حجت اللہ، باب اللہ، لسان اللہ، وجہ اللہ اور عین اللہ ہیں اور ہم اللہ کے بندوں میں اولی الامر ہیں۔

احتجاج طبرسی سے منقول ہے۔ اصبح بن نباتہ سے مروی ہے کہ میں حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا کہ ابن کو آیا۔ اور اس نے آنجناب سے اسی آیت کی تفسیر دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ وہ گھر ہم ہیں جن کے دروازوں سے آنے کا حکم ہے۔ ہم اللہ کا دروازہ ہیں اور وہ گھر ہیں جن میں آنے کا حکم ہے۔ پس جس نے ہماری بیعت کی اور ہماری ولایت کا اقرار کیا۔ پس وہ گھر میں دروازوں سے داخل ہوا۔ اور جس نے ہماری مخالفت کی اور غیر کو ہم پر ترجیح دی تو وہ گویا گھر میں پشتوں سے داخل ہوا۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جو آل محمد کے پاس آیا۔ گویا وہ صاف چشے پر وارد ہوا۔ جو اللہ کے علم کے ساتھ جاری ہے اور خداوند کریم نے آل محمد کو اپنے دروازے قرار دیا اور انہی سے اس کی بارگاہ میں پہنچا جاسکتا ہے اور اسی قسم کی روایات بکثرت موجود ہیں۔ لیکن اختصار کے پیش نظر انہی پر اکتفا کی جاتی ہے۔

تنبیہ :- آیت مجیدہ کے پہلے معانی اور اس معنی میں منافات نہیں سمجھنی چاہیے کیونکہ وہ معانی تفسیر ظاہری کے لحاظ سے تھے اور یہ معنی تفسیر باطنی کے طور پر ہے۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا

اور لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو تم سے لڑیں اور تجاوز نہ کرو

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ وَأَقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ

تحقیق اللہ کو پسند نہیں جو تجاوز کریں اور ان کو قتل کرو۔ جہاں ان کو پاؤ

وَأَخْرِجُوهُمْ مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمُ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ

اور نکال دو ان کو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا۔ اور فتنہ زیادہ سنگین (بڑھ) ہے

مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تَقْتُلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ

قتل سے اور نہ لڑو ان سے مسجد الحرام کے پاس۔ یہاں تک

يُقْتَلُوكُمْ فِيهِ فَإِن قُتِلُوكُمْ فَأَقْتُلُوهُمْ ۚ كَذٰلِكَ

کہ وہ لڑیں تم سے اس میں۔ پس اگر وہ تم سے لڑیں تو تم ان کو قتل کرو۔ اسی

حَزَّاءُ الْكَافِرِينَ ۝

طرح جزا ہے۔ کافروں کی

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بر شان نزول کے متعلق تفسیر مجمع البیان میں ابن عباس سے مروی ہے کہ یہ آیت صلح حدیبیہ کے بارے میں نازل ہوئی کہ جب آنحضرتؐ بمعہ اپنے چودہ کلو صحابہ کے عمرہ ادا کرنے کے لئے مقام حدیبیہ پر فوج کش ہوئے تو مشرکین نے مکہ کے داخلے سے روک دیا۔ چنانچہ آپؐ نے قربانیوں کو وہاں نحر کر دیا اور مشرکین سے اس بشرط پر صلح ہوئی کہ اس سال واپس پلٹ جائیں اور اگلے سال تشریف لائیں اور یہ طے ہوا کہ مشرکین تین روز کے لئے وہاں سے نکل جائیں گے اور آنحضرتؐ اپنے منارک حب منشا ادا فرمائیں گے پس حضورؐ واپس مدینہ تشریف لائے اور اگلے سال عمرہ قضا کے لئے بمعہ صحابہ تیار ہو کر روانہ ہوئے لیکن یہ ڈر تھا کہ کہیں مشرکین اپنے عہد کو توڑ کر روکاؤٹ پیدا کر کے لڑائی نہ چھیڑ دیں۔ اور مہینہ کی حرمت کا خیال بھی ساتھ تھا۔ پس یہ آیتیں اتریں کہ جو لوگ تم سے لڑائی کی ابتداء کریں۔ ان سے بے شک لڑائی کرو۔ اور اس سے تجاوز نہ کرو۔ صلح حدیبیہ کی تفصیل تفسیر کی جلد ۱۱ ص ۶۷ تا ۷۱ اور ص ۷۱ تا ۷۲ ملاحظہ فرمائیں۔

فَإِنْ أَنْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ

پس اگر باز آجائیں۔ تو تحقیق اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے اور ان سے لڑو یہاں تک

لَا تَكُونُ فِتْنَةً وَيَكُونا الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنْ أَنْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ

کہ فتنہ باقی نہ رہے اور اللہ کا دین (عام) ہو جائے پس اگر باز آجائیں تو نہیں جائز ہے

إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿۱۹۳﴾ الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَتُ

کوئی زیادتی مسکرم ظالموں پر حرمت والا مہینہ بدے حرمت والے مہینے کے ہے اور حرمتیں ایک

قِصَاصٌ فَمَنْ اخْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اخْتَدَىٰ

دوسری کا بدلہ ہیں۔ پس جو زیادتی کرے تم پر، تو تم بھی زیادتی کر سکتے ہو اس پر جس قدر اس نے زیادتی کی ہو

عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿۱۹۴﴾

تم پر اور اللہ سے ڈرو اور پیتین جانو کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔

فَإِنْ أَنْتَهَوْا ۖ یعنی اگر وہ تائب ہو جائیں تو خدا ان کی سابقہ لغزشوں کو معاف فرما دے گا۔ اور ان کی توبہ مقبول ہوگی۔

فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا ۖ اس آیت میں ظالمین کی باطنی تاویل حضرت امام حسینؑ کے قاتلین اور ان کی اولاد سے کی گئی ہے۔ چنانچہ تفسیر بہان میں اس مضمون کی متعدد روایات منقول ہیں۔

عبدالسلام بن صالح ہروی کہتا ہے کہ میں نے حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب حضرت قائم آل محمد علیہ السلام تشریف لائیں گے تو حضرت امام حسین علیہ السلام کے قاتلین کی اولاد سے قصاص لیں گے اور ان کو قتل کریں گے کیا یہ درست ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ہاں! درست ہے میں نے عرض کیا کہ خدا فرماتا ہے ۖ

لَا تَزِدْوا فِي دِينِ رَّبِّكَ ذِكْرًا أُخْرٰی ۖ کا پھر کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ خدا نے سچ فرمایا ہے۔ لیکن امام حسین علیہ السلام کے قاتلوں کی اولاد اپنے باپ دادا کے فعل پر راضی ہے اور ان کے فعل پر فخر کرتے ہیں اور جو شخص کسی کے فعل پر راضی ہو۔ تو وہ بھی اسی جیسا مجرم ہوا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ایک شخص مشرق میں کسی کو قتل کرے اور مغرب میں رہنے والا شخص اس پر راضی ہو تو وہ بھی اس میں برابر کا شریک ہے۔ پس حضرت قائم آل محمدؑ ان کو اس

وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ ۚ

اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور نہ بڑھاؤ اپنے ہاتھ ہلاکت کے اور نیکی کرو

وَاحْسِنُوا إِلَى الْوَالِدَيْنِ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۹﴾

تحقیق اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

لئے قتل کریں گے کہ وہ اپنے باپ دادا کے فعل پر راضی ہوں گے۔

وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ ۚ۔ اس کے معنی میں دو جہیں بیان کی گئی ہیں۔

۱) قریش نے اس بات پر فخر کیا تھا کہ ہم نے رسول اللہ کو ماہ ذیقعدہ میں بحالت احرام واپس کر دیا ہے۔ اور اُن کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیا۔ خداوند کریم نے اسی ماہ میں باذن قتال مکہ میں داخل ہونے کا حکم دیا تاکہ یہ پہلے سال کا عوض اور حرمت والے مہینہ میں واپسی کا بدلہ حرمت والے مہینہ ہی کا داخلہ ہو جائے۔

۲) حرمت حرمت کا بدلہ ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر کوئی حرمت والے مہینہ کا احترام نہ کرتے ہوئے خواہ مخواہ تمہیں پھیرے تو تم بھی اس سے بے شک (دور) کوئی تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس کو جیسے کا بدلہ تیسرا اسی ماہ میں دے سکتے ہو۔

ہلاکت سے بچنے کا حکم

وَلَا تُلْقُوا ۚ۔ اس کے کئی معانی کئے گئے ہیں :-

۱) بخل کر کے ہلاکت میں اپنے ہاتھ نہ ڈالو ۲) حد سے زیادہ خرچ کر کے اپنے ہاتھ ہلاکت (بھوک) میں نہ ڈالو۔

۳) گناہوں کے ارتکاب سے اپنے ہاتھ ہلاکت میں نہ ڈالو ۴) بلا وجہ لڑائی پھیر کر ہلاکت میں نہ پڑو۔ بہر کیف تمام معافی مراد لئے جاسکتے ہیں۔

سوال :- اس آیت کی رو سے جن طرح جناب رسالتؐ نے حدیبیہ میں اور حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے صفین میں اور حضرت امام حسن علیہ السلام نے معاویہ سے صلح کمر لی تھی تو حضرت امام حسین علیہ السلام نے صلح کیوں نہ کمر لی؟

جواب :- اسباب ظاہریہ اور حالات حاضرہ سے حضرت امام حسین علیہ السلام کو یقین تھا کہ عبید اللہ بن زیاد میرے قتل سے باز نہ آئے گا جس طرح کہ اُس نے حضرت امیر مسلم کو قتل کر دیا تھا۔ پس ان حالات میں صلح کرنا ذلت کی موت خریدنے کے مترادف تھا اور صلح نہ کرنا عزت کی موت کو پسند کرنے کا نام تھا۔ پس آپؑ نے ذلت کی موت سے عزت کی موت کو ترجیح دی۔

وَاتِمُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ فَإِنْ أُخْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ

اور تمام کرو حج اور عمرہ کو اللہ کے لئے پس اگر تم روک دیئے جاؤ (بوجہ بیماری یا دشمن کے) تو جو میسر ہو قربانی کر دو

وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحَلَّهُ ۖ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا

اور نہ منڈواؤ اپنے سر میاں تک کہ پہنچ جائے قربانی اپنے مقام پر پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا

أَوْ بِهِ آذَىٰ مِّن رَّأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ ۖ فَإِذَا أَمِنْتُمْ

اس کے سر میں تکلیف ہو (تو سر منڈوالے) اور فدیہ دے روزے یا صدقہ یا نسیک پس جب تم با امن ہو

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ

تو جو شخص تمتع کرے ساتھ عمرہ کے طواف کے تو جو کچھ میسر آئے قربانی (کرے) لیکن جس کو نہ مل سکے

فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ ۖ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ ۚ ذَٰلِكَ

تو روزے رکھے تین دن دوران حج میں اور سات روزے جب واپس آؤ یہ ہیں دس پورے یہ اس

لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ

شخص کے لئے ہے جس کے اہل خانہ مسجد الحرام کے قریب نہ ہوں اور اللہ سے ڈرو تحقیق اللہ

اللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۱۶۶﴾

سخت سزا دینے والا ہے۔

حج کا بیان

فَإِنْ أُخْصِرْتُمْ ۖ بِیعنی اگر تم روک دیئے جاؤ تو قربانی کر لو۔ روکاوٹ دو قسم کی ہوا کرتی ہے۔

(۱) بیماری کی وجہ سے (۲) دشمن یا درندہ یا کسی ظالم و جاہل کی وجہ سے

اصطلاح فقہاء میں پہلی قسم کی روکاوٹ کو حصر کہتے ہیں اور دوسری قسم کو صد کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے اُحْصِرْتُمْ جس کا معنی ہے کہ تم حصر کی وجہ سے روک جاؤ تو ایسا کرو لیکن یہاں پر مراد عام ہے یعنی روکاوٹ خواہ حصر (مرض کی وجہ) سے ہو یا

صد (خوف دشمن) کی وجہ سے ہو۔ ہر دو صورت میں قربانی کر کے احرام سے باہر آؤ۔

فَمَا اسْتَيْسَرَ۔ قربانی کے جانور تین ہیں (۱) اونٹ (۲) گائے (۳) بکری

ان میں سے حسبِ حیثیت جو بھی میسر ہو سکے اسی کی قربانی کر لے۔ اور احرام سے حلال ہو جائے۔

وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ۔ یعنی حصر یا صد کی صورت میں قربانی کرنے کے بعد سر منڈوائے اور احرام کھول دے۔ ورنہ جب تک احرام کی حالت باقی ہو اس وقت تک سر منڈوانا یا باقی حجامت کرنا ممنوع ہے اور اسی کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ سر منڈوانا جائز نہیں ہے جب تک کہ قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے تفصیل اس کی یہ ہے کہ احرام کی دو قسمیں ہیں (۱) احرام حج اور (۲) احرام عمرہ اور ہر دو صورتوں میں روکاوٹ یا حصر (بیماری) سے ہوگی یا صد (خوف دشمن وغیرہ) سے تو یہ کل چار صورتیں بنتی ہیں

(۱) پس اگر احرام حج کا ہو اور روکاوٹ کی وجہ بیماری ہو جس سے آگے نہ جاسکتا ہو تو اس صورت میں اپنی حسبِ حیثیت قربانی روانہ کر دے اور اس کے ذبح کا محل مقام منیٰ ہے۔ اور قربانی لے جانے والے کے ساتھ وقت کی تعیین کر لے کہ دسویں ذوالحجہ کے دن فلاں وقت میں اس قربانی کو ذبح یا نحر کرنا ہے۔ پس یہ بیمار دسویں کے دن اس وقت تک انتظار کرے جس میں قربانی کے ذبح کا وعدہ کیا تھا اور جب وہ وقت آجائے تو یہ اپنے احرام کو کھول دے اور حجامت وغیرہ کرالے لیکن اس وقت سے پہلے نہ سر منڈوا سکتا ہے اور نہ کوئی دوسرا کام کر سکتا ہے جو احرام کے منافی ہو۔

(۲) اگر احرام حج کا ہو اور روکاوٹ دشمن وغیرہ کی وجہ سے ہو گئی ہو کہ آگے نہ جاسکے تو جس مقام پر اسے روکا گیا ہے وہیں قربانی کر کے احرام سے سبکدوش ہو جائے۔

(۳) اگر احرام عمرہ کا ہو اور روکاوٹ بیماری کی ہو تو قربانی مکہ میں بھیج دے اور تاریخ اور وقت مقرر کر لے کہ مثلاً فلاں روز فلاں وقت مکہ میں میری قربانی کو ذبح یا نحر کر دینا۔ پس یہ مریض اس وقت کی انتظار کرے اور وقت گزر جانے کے بعد اپنے آپ کو احرام سے آزاد سمجھے اور سر وغیرہ منڈوالے۔

(۴) اگر احرام عمرہ کا ہو اور روکاوٹ دشمن کی وجہ سے ہو تو جس مقام پر روکاوٹ لاحق ہوئی ہو۔ اسی مقام پر قربانی کر کے احرام کھول دے جس طرح کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جناب رسالتؐ نے مقام حدیبیہ پر اپنی قربانی ذبح کر لی اور صحابہ کو بھی ایسا کرنے کا حکم دیا۔

پس قرآن مجید کے اس حکم کا مطلب واضح ہو گیا کہ سر نہ منڈواؤ۔ جب تک کہ قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حج کے احرام میں قربانی کا مقام منیٰ ہے اور عمرہ کے احرام میں قربانی کا مقام مکہ ہے۔ اور یہ دونوں صورتیں حصر (بیماری) کی وجہ سے رک جانے والے کے لئے ہیں۔ ورنہ صد (خوف دشمن) کی صورت میں حج کا احرام ہو یا عمرہ کا ہو۔ قربانی کا مقام وہی ہے جہاں صد واقع ہوا ہے۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ۔ اگر کوئی شخص بیماری یا سر میں جوڑوں کے پڑ جانے کی وجہ سے سر منڈوانے کا محتاج ہو اور مبر

نہ کر سکتا ہو تو وہ اس صورت میں سرمنڈوا سکتا ہے۔ لیکن اس پر کفارہ لازم ہے اور وہ یہ ہے کہ یا تین دن روزے رکھے یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ بعض روایات میں دس مسکینوں کو کھانا کھلانے کا حکم ہے اور یا ایک بکری ذبح کرے ان تینوں چیزوں میں سے اس کو اختیار ہے جو چاہے کرے۔

فَإِذَا أَصَبْتُمْ بيماری یا دشمن وغیرہ کا خوف نہ ہو اور حج کرنے والا صحیح اعمال حج کے بجالانے پر موفق ہو۔ تو حج تمتع کرنے والے پر ہدی (قربانی) واجب ہے اور اگر قسربانی دستیاب نہ ہو سکے تو اس کے بدلہ میں اس پر دس روزے واجب ہیں۔ جن میں سے تین روزے وہیں ایام حج میں رکھتے پڑتے ہیں اور ان کا پے درپے رکھنا ضروری ہے۔ مگر ایک صورت میں اور وہ یہ کہ آٹھویں اور نویں کو روزہ رکھا ہے اور دسویں کو رکھ نہیں سکتا۔ کیونکہ عید ہے تو یہ شخص تیسرا روزہ ایام تشریق کے گزر جانے کے بعد رکھ لے۔ اس صورت کے علاوہ ان روزوں میں اگر پے درپے ہونے کی شرط نہ پائی گئی تو باطل ہو جائیں گے۔ اور دس روزے سفر حج سے واپس اگر گھر پر رکھنے ضروری ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص گھر نہ پڑے اور وہاں ٹھہر جائے تو پھر اتنے ایام صبر کرے جتنے گھر تک پہنچنے کے لئے درکار تھے اور اس کے بعد بقیہ روزے رکھ لے۔ یہ کل دس روزے ہیں۔ جو قسربانی حج تمتع کا بدلہ ہیں۔

ذَلِكَ لِمَنْ لَمْ يَكُنْ۔۔۔ یہ حج تمتع ان لوگوں کا فریضہ ہے جن کی اہل مسجد الحرام کے حاضرین سے نہ ہو حاضرین مسجد الحرام سے مراد ہے کہ مکہ سے اڑتالیس میل کے فاصلہ کے اندر ہوں۔ بعض علمائے کرام نے بارہ میل کا قول اختیار فرمایا ہے۔

کیفیت حج اور اس کے بعض مسائل

حج کے اقسام | حج کی تین قسمیں ہیں حج تمتع، حج انسداد، حج قسربان۔ ان ہر قسموں میں سے حج تمتع افضل ہے جو لوگ مکہ یا اس کے ۴۸ میل کے فاصلہ کے اندر رہتے ہیں ان کا فریضہ حج افراد یا حج قسربان ہوتا ہے اور جو لوگ مکہ سے ۴۸ میل سے زیادہ فاصلہ پر آباد ہوں۔ ان کا فریضہ حج تمتع ہے۔ جس طرح قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ یہ حج (تمتع) ان لوگوں کا فریضہ ہے جن کی اہل مسجد الحرام کے حاضرین سے نہ ہو۔ حج تمتع میں پہلے عمرہ بجالانا پڑتا ہے اور یہ عمرہ عمرہ تمتع کہلاتا ہے اور حج انسداد اور حج قرآن میں صرف حج کے اعمال کو بجالانا پڑتا ہے اور اس کے بعد عمرہ علیحدہ کیا جاتا ہے اور اس کو عمرہ مفردہ کہتے ہیں۔

عمرہ۔۔۔ عمرہ کے واجبات یہ ہیں۔ احرام۔ طواف۔ دو رکعت طواف۔ سعی۔ تقصیر۔ احرام۔۔۔ حاجی کے لئے میقات سے احرام باندھنا ضروری ہے۔

میقات :- اس مقام مخصوص کو کہا جاتا ہے جہاں سے احرام باندھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

میقات کلی جچے ہیں۔

(۱) حجۃ بن شام کے راستے سے حج کو جانے والوں کے لئے یہی میقات ہے۔

(۲) مسجد شجرہ :- مدینہ کے راستے سے حج کرنے والوں کا میقات ہے اگر حاجی یہاں سے احرام نہ باندھ سکے ۔ تو مقام حجۃ سے احرام باندھ سکتا ہے۔

(۳) وادی عقیق :- عراق کے راستے سے حج کرنے کا میقات ہے۔

(۴) طائف والوں کے لئے فترن المنازل (۵) یمن والوں کے لئے یلملم ہے۔

(۶) جس شخص کا گھر ان مقررہ میقاتوں کی بہ نسبت مکہ کے زیادہ قریب ہو تو اس کا میقات اپنا گھر ہے یعنی وہ وہاں سے احرام باندھ لے۔

مسئلہ :- اگر کوئی شخص ایسے راستے سے حج کو جائے کہ کسی میقات سے نہ گذرتا ہو تو وہ شخص جب ان میقاتوں

میں سے کسی ایک کی محاذات (برابری) میں پہنچے تو احرام باندھ لے۔

مسئلہ :- جنب، حیض، نفاس احرام سے مانع نہیں ہیں۔

مسئلہ :- اگر محلول کر بغیر احرام باندھنے کے میقات سے آگے گذر جائے تو اس پر واجب ہے کہ واپس اگر میقات

سے احرام باندھ کر جائے۔ ہاں اگر واپسی ناممکن ہو تو جس مقام پر یاد آیا ہے وہیں سے احرام باندھ کر آگے چلے۔

مسئلہ :- احرام کے لئے تین چیزیں واجب ہیں۔ احرام کے کپڑوں کا پہنتا۔ نیت اور لبیک کہنا۔

مسئلہ :- احرام کے کپڑے دو سوتی سفید چادریں ہوتی ہیں۔ ایک زیر ناف سے پاؤں تک ڈھانپنے کے لئے

اور دوسری کندھوں پر اوڑھنے کے لئے۔

مسئلہ :- احرام کی چادروں کا کپڑا ایسا باریک نہیں ہونا چاہیے کہ نظر اس سے پار ہو کر چپڑے تک پہنچ سکے۔

مسئلہ :- مستحب ہے کہ پہلے حجامت کروائے اور جسم سے بالوں کو صاف کر دے اور پھر غسل کر کے احرام باندھے

مسئلہ :- نماز ظہر کے بعد احرام باندھنا بہتر ہے۔ ورنہ کسی قریضہ نماز کے بعد باندھے۔ اور اگر ایسا کرنا ناممکن ہو تو

پھر چھ رکعت نماز نافلہ احرام پڑھ کر بعد میں احرام باندھے اور یہ بھی نہیں تو کم از کم دو رکعت نافلہ پڑھ کر احرام باندھے۔

مسئلہ :- غسل کرنے اور احرام باندھنے کے وقت منقولہ دعاؤں کا پڑھنا اللہ کی حمد و ثنا اور درود پڑھنا

باعث ثواب ہے۔

مسئلہ :- احرام کے کپڑے پہن لینے کے بعد نیت کرے کہ عمرۃ تمتع کے لئے میں نے قربۃً الی اللہ احرام

باندھا ہے اور اس نیت کے بعد فوراً اپنی زبان پر کلمات لبیک کو جاری کرے اور کہے :-

لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ لَبَّيْكَ - إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكُ لَا شَرِيكَ لَكَ لَبَّيْكَ -

مسئلہ :- لبیک کہتے ہوئے مکہ کو جائے اور مکہ کے مکانات جب دکھائی دینے لگیں تو لبیک کہنا ختم کر دے۔

مسئلہ :- حالت احرام میں مندرجہ ذیل چیزوں سے بچنا چاہیے۔

(۱) جنگلی جانور کا شکار۔ خود کرنا۔ کسی کو حکم دینا۔ مشورہ دینا۔ اشارہ کرنا اور ذبح کرنا وغیرہ محرم کے لئے سب حرام ہیں اور محرم کا ذبح شدہ شکار مردار کی طرح حرام ہوا کرتا ہے۔ اس کا کھانا ہر ایک پر حرام ہے۔

(۲) عورت :- عورت سے ہمبستری کرنا، بوس و کنار کرنا یا بنظر شہوت اس پر نظر کرنا حرام ہے۔

مسئلہ :- اگر کوئی شخص حالت احرام عمرہ میں سعی کرنے سے پہلے اپنی عورت سے ہمبستری کرے تو اس پر ایک کفارہ واجب ہے اور اس سال اس کی حج بھی فاسد ہے۔ لہذا اس پر واجب ہے کہ یہ حج بھی پوری کرے اور آئندہ سال اس کی قضا بھی کرے۔

مسئلہ :- اگر احرام حج میں وقوف مشعر سے پہلے عورت کے ساتھ ہمبستر ہو جائے تو حج بھی فاسد اور اونٹ کا کفارہ بھی واجب ہے۔ لیکن اس سال اس حج فاسد کو پورا کرنا واجب ہے اور اگلے سال اس کی قضا بھی ضروری ہے۔

مسئلہ :- عورت کے ساتھ بوس و کنار سے بھی اونٹ کا کفارہ واجب ہے اور نظر شہوت کرنے سے اگر خود بے

ممنی ہو جائے تب بھی واجب ہے کہ اونٹ کفارہ دے۔

(۳) عورت سے نکاح کرنا۔ یا کسی اور کا نکاح پڑھنا محرم پر حرام ہے بلکہ خواستگاری کرنے اور کسی کے نکاح میں شریک ہونے اور گواہ بننے اور گواہی دینے سے بھی پرہیز کرے۔

(۴) استمنا۔ یعنی مشت زنی یا اسی قسم کے کسی کرتوت سے منی کا خارج کرنا۔

(۵) خوشبو، مشک زعفران وغیرہ کا سونگھنا، بدن پر ملنا اور کھانا وغیرہ (اس کا کفارہ ایک گوسفند ہے)

(۶) سیاہ ہوا لباس۔ یا وہ جو مثل سٹے ہوئے کے ہو جس طرح نمدہ وغیرہ

(۷) بقصد زینت سیاہ سرمہ لگانا۔

(۸) آئینہ دیکھنا۔

(۹) جراب یا موزہ یا جوتا وغیرہ جو پاؤں کے ظاہر حصہ کو ڈھانپ لیں۔ البتہ نعل عربی میں کوئی حرج نہیں۔

(۱۰) جھوٹ بولنا۔

(۱۱) قسم کھانا۔ مثلاً لاؤ اللہ۔ جے واللہ کہنا۔

مسئلہ :- جھوٹی قسم کا کفارہ پہلی بار ایک گوسفند۔ دوسری بار ایک گائے۔ اور تیسری دفعہ ایک اونٹ ہے۔

اور سچی قسم کے لئے پہلی دو دفعہ حثرت توڑنا استغفار ہی کافی ہے اور تیسری بار اگر کرے تو ایک گوسفند کفارہ ہے۔

(۱۳) ٹھیکر، جوں، اور کھٹل وغیرہ کا مارنا۔ بلکہ ایک حصہ جسم سے دوسرے غیر محفوظ حصہ پر اس کا منتقل کرنا بھی خلاف احتیاط ہے۔

(۱۴) مہندی لگانا، زینت کے لئے بلکہ احرام سے پہلے مہندی لگانا بھی ٹھیک نہیں اگر اس کا اثر احرام کے بعد تک رہنے والا ہو۔

(۱۵) عورت کا حالت احرام میں زینت کے لئے زیورات کا استعمال کرنا۔

(۱۶) تیل یا گھی یا دیگر روغنی چیزوں کا ملنا اگرچہ خوشبودار نہ بھی ہو۔

(۱۷) اپنے بدن سے یا کسی دوسرے حرم کے بدن سے بال دور کرنا۔

مسئلہ :- اگر کسی کی آنکھ میں بال پیدا ہو جائے تو اس کو دور کرنا جائز ہے اسی طرح وضو یا غسل وغیرہ سے اگر کوئی بال جدا ہو جائے تو حرج نہیں نیز سردردی وغیرہ کی وجہ سے اگر سر منڈوا لیا جائے تو بھی گناہ نہیں۔

مسئلہ :- جسم سے بال دور کرنے کا کفارہ ایک گوسفند ہے اگر مجبوری کی وجہ سے ایسا کیا ہو۔ تو تین روزے یا دس مکہ کفارہ دے۔

مسئلہ :- سر یا وارحمی پر ہاتھ پھیرنے سے اگر کوئی بال گر جائے تو ایک مٹھی گندم صدقہ دے۔

(۱۸) مرد کا سر کو ڈھانپنا حالت احرام میں حرام ہے اور اس کا کفارہ ایک گوسفند ہے۔

(۱۹) عورت کا حالت احرام میں منہ کو ڈھانپنا اور اس کا کفارہ بھی ایک گوسفند ہے۔

(۲۰) مرد کا حالت احرام میں اپنے سر پر سایہ کرنا۔

مسئلہ :- اگر کسی بیماری یا کمزوری یا کسی تکلیف کی وجہ سے سایہ میں بیٹنا ضروری ہو جائے تو اس صورت میں سایہ کے نیچے بیٹھ سکتا ہے۔ لیکن ایک گوسفند کفارہ دینا ہوگا۔ حج اس کی صحیح ہوگی۔

(۲۱) اپنے بدن سے خون نکلنا۔ اور اس کا کفارہ ایک گوسفند ہے۔

(۲۲) ناخن لیٹنا۔ ایک ناخن کا کفارہ ایک مڈ ہے۔ اور پورے ہاتھوں اور پاؤں کے ناخن اتارنے سے ایک گوسفند کفارہ دینا ہوگا۔

(۲۳) دانت نکلوانا۔ اس کا کفارہ بھی ایک گوسفند ہے۔

(۲۴) حرم کے درخت یا گھاس وغیرہ کاٹنا۔ درخت کاٹنے کا کفارہ ایک گوسفند ہے۔

عمہ متع کا احرام باندھنے کے بعد جب مکہ میں داخل ہو تو مکہ میں داخلے کے لئے غسل مستحب کرے اور پھر مسجد الحرام کے داخلے کے لئے ایک اور غسل مستحب کرے اور طواف واجب کرے اور طواف بیت اللہ

طواف

کے گرد سات چکر پھرنے کا نام ہے۔ طواف میں طہارت جسم (حدث اور خبث سے) اور طہارت لباس اور اس کا مباح ہونا ضروری ہے۔ مرد کا بغیر ختنہ کے طواف باطل ہوتا ہے طواف کرنے سے پہلے نیت یہ کرے کہ عمرۃ تمتع کا طواف قربۃ الی اللہ تجاللاتا ہوں۔ اور نیت کا دل میں ہونا ضروری ہے۔ اس کا زبان پر جاری کرنا لازم نہیں۔

طواف کا طریقہ یہ ہے کہ نیت کر کے حجر اسود سے طواف شروع کرے اس لحاظ سے اس کا ہر چکر حجر اسود تک پورا ہوگا۔ اور یہ خیال رہے کہ حالت طواف میں اس کا بایاں کندھا بیت اللہ کے سامنے رہے۔ لہذا ہر کونہ سے موڑ کاٹتے ہوئے اپنے جسم کو ترچھا رکھ کر اپنے کندھے کو کعبہ کی سیدھ سے ہٹتے نہ دے۔ اسی طرح اگر أثناء طواف بیت اللہ کو بوسہ دینے کا ارادہ رکھتا ہو۔ تو یہ خیال رکھے کہ اپنا کندھا کعبہ کی سیدھ میں رہے۔ ورنہ اگر غفلت ہو جائے اور کندھا بیت اللہ کی سیدھ سے ہٹ جائے اور اسی حالت میں طواف کا کچھ حصہ گزر جائے تو طہافت ہونے کے بعد اس پر واجب ہے کہ اسی مقام سے طواف کو دوبارہ شروع کرے جہاں سے یہ بے اعتدالی واقع ہوئی تھی۔ اور پھر طواف کو صحیح طریقہ سے ادا کرے۔

مسئلہ :- طواف میں ضروری ہے کہ ایک طواف کے لئے سات چکر پورے کرے اگر سات چکروں سے عداکم یا زیادہ کرے گا تو طواف باطل ہوگا۔

مسئلہ :- حالت طواف میں زبان کو ذکر خدا سے تر رکھے۔ بے ہودہ باتیں نہ کرے۔ نیز منقول دعاؤں کا پڑھنا مستحب ہے۔

نماز طواف طواف کے بعد دو رکعت نماز طواف پڑھنی چاہیے۔ طواف واجب کے لئے نماز طواف واجب اور طواف مستحب کے لئے مستحب ہے۔ طواف کے فوراً بعد مقام ابراہیم پر جا کر دو رکعت نماز طواف ادا کرے۔ مقام ابراہیم سے مراد وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں مبارک کا نشان باقی ہے اگر لوگوں کی بھیڑ کی وجہ سے وہاں جگہ نہ مل سکے تو اس کے قریب دائیں یا بائیں جانب دو رکعت نماز طواف ادا کرے۔ **مسئلہ :-** دو رکعت نماز طواف میں مستحب ہے کہ پہلی رکعت میں حمد کے بعد سورۃ قل ہو اللہ احد اور دوسری رکعت میں حمد کے بعد قل یا ایہا الکافرون پڑھے اور اس کے بعد اپنے گناہوں سے توبہ کر کے اللہ سے معافی طلب کرے۔

سبعی صفا مردہ کے درمیان = دو رکعت نماز طواف سے فارغ ہو کر صفا اور مردہ کے درمیان سعی کرنا واجب ہے سعی کو کوہ صفا سے شروع کرے اور کوہ مردہ پر ختم کرے۔ شروع کرتے وقت کوہ مردہ کے کچھ حصہ کے اوپر چڑھ جائے۔ سعی کے بھی سات چکر واجب ہیں۔ لیکن صفا سے مردہ تک جانا ایک چکر اور واپس صفا تک آنا دوسرا چکر شمار ہوتا ہے۔ لہذا ساتواں چکر کوہ مردہ پر ہی ختم ہوگا۔ سعی کو شروع کرنے سے پہلے نیت کر لینا ضروری ہے۔ لیکن طہارت بدن و لباس اس میں شرط نہیں ہے۔ سعی کرنا حج کا رکن ہے۔

تقصیر صفا اور مروہ کے درمیان سعی کر لینے کے بعد تقصیر کی نیت کر کے سر کے بال تھوڑے سے کٹوائے اور اسی کا نام تقصیر ہے لیکن سر منڈوانا اس مقام پر حرام ہے۔ اب احرام میں جتنی چیزیں اس پر حرام تھیں۔ وہ سب حلال ہو گئیں یہ تھا عمرہ تمتع جس کے اعمال کی بجا آدمی ہو گئی۔ اس کے بعد مکہ میں ٹھہرا رہے پھر جب حج کے احرام کا وقت آئے گا تو مکہ سے دوسرا احرام باندھ کر عرفات و منیٰ کی طرف جائے اور وہاں حج کے اعمال بجالائے۔

حج کے واجب افعال چودہ ہیں :-

افعال حج (۱) احرام (۲) وقوف عرفات (۳) وقوف مشعر (۴) افاضہ (۵) رمی جمرہ عقبہ (۶) نحر یا ذبح (۷) سر منڈوانا (۸) مکہ میں اگر طواف زیارت (۹) دو رکعت نماز طواف (۱۰) سعی درمیان صفا و مروہ (۱۱) طواف نساً (۱۲) دو رکعت نماز طواف (۱۳) مبیت منیٰ (۱۴) رمی جمار ثلث۔

احرام حج احرام باندھنے کا طریقہ۔ کپڑے۔ نیت وغیرہ وہی ہیں جو پہلے بیان ہو چکے ہیں اور جو چیزیں احرام کی حالت میں حرام ہو جاتی ہیں ان کا بیان گزر چکا ہے۔

مسئلہ :- حج کا احرام مکہ معظمہ کے جس مقام سے باندھے جائز ہے لیکن مسجد الحرام میں مقام ابراہیم سے باندھنا افضل ہے۔
مسئلہ :- احرام حج ایسے وقت میں باندھے کہ نویں ذوالحجہ کو وقوف عرفات کے لئے وہاں پہنچ سکے اور بہتر یہ ہے کہ آٹھویں ذوالحجہ کو احرام باندھ کر روانہ ہو جائے اور رات کو مقام منیٰ میں رہے اور نویں کے روز وہاں سے روانہ ہو کر عرفات کے مقام پر جائے۔ اور احرام باندھ کر لبیک کے کلمات گزشتہ کو زبان پر جاری کرے۔ اور جب مقام ابطح پر پہنچے تو با آواز بلند لبیک پڑھے۔

وقوف عرفات نویں ذوالحجہ کو زوال سے لے کر غروب شمس تک عرفات میں ٹھہرنے کا نام وقوف عرفات ہے اور یہ حج کا رکن ہے اس کے فوت ہونے سے حج فوت ہو جاتی ہے۔ جس کی تفصیل کتب فقہیہ میں موجود ہے۔
مسئلہ :- عرفات میں ظہر سے مغرب تک ٹھہرنا واجب ہے خواہ وہاں کھڑا رہے یا بیٹھا رہے یا چلتا رہے۔
مسئلہ :- وقوف کی نیت کرے کہ وقوف عرفات حج تمتع کے لئے کرتا ہوں۔ تہربۃ الی اللہ

مسئلہ :- وقوف عرفات غروب آفتاب تک ہے اگر کوئی شخص غروب سے پہلے عرفات سے باہر نکل جائے تو اس پر واپس پلٹ کر غروب تک وقوف کرنا واجب ہے ورنہ اس کا کفارہ ایک اونٹ ہے اور اگر یہ ناممکن ہے۔ تو اٹھارہ روز سے پے در پے رکھے۔

مسئلہ :- اگر بصورت سہو قبل از غروب عرفات سے چلا جائے اور غروب تک ملتفت نہ ہو یا جہالت مسئلہ کی صورت میں ایسا کرے اور غروب تک اس کو مسئلہ کا علم نہ ہو سکے تو اس پر کوئی کفارہ نہیں۔ لیکن اگر بروقت اس کو علم ہو جائے۔

تو واپس اگر غروب تک وقوف کرنا واجب ہے اور بصورت مخالفت کفارہ لازم ہے۔

مسئلہ :- اگر حکومت وقت کے قاضی نے پابند کے ثبوت کا حکم دے دیا ہو لیکن مذہب شیعہ کی رو سے شرعاً چاند اس تاریخ پر ثابت نہ ہو اور تقیہ حکومت وقت کے قاضی کے حکم کے موافق عمل کرنے کا مقتضی ہو تو ایسی صورت میں انشاء فریضہ حج ادا ہو جائے گا۔

مسئلہ :- وقوف عرفات سے پہلے غسل کرنا مستحب ہے اول وقت میں اذان کے بعد نماز ظہر و عصر کو پڑھے اور اس مقام پر تمام مذاہب اسلامیہ بلا اختلاف جمع بین الصلوٰتین پر عمل کرتے ہیں جس میں مذہب شیعہ کی صداقت کی پُر زور عملی تائید ہے۔ پس چاہیے کہ نہایت دل جمعی سے باطہارت وہاں غروب تک کھڑے ہو کر اور ایسا نہ کر سکے تو قبلہ رخ بیٹھ کر تا غروب ذکر خدا میں مشغول رہے۔ اللہ اکبر ایک سو بار۔ الحمد للہ ایک سو بار۔ سبحان اللہ ایک سو مرتبہ، لا الہ الا اللہ ایک سو دفعہ، آیتہ الکرسی ایک سو دفعہ، دُرود شریف ایک سو دفعہ سورہ اِنَّا آتَزْنٰکَ اِکَ سُوْمَرْتَبَہٗ، لَا حَوْلَی وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ ایک سو دفعہ اور سورہ توحید ایک سو دفعہ پڑھنا مستحب ہے۔ اپنے گناہوں کو اپنے سامنے رکھ کر اللہ سے ان کی معافی مانگے اپنے والدین و قریبیوں و دیگر برادران ایمانی کے لئے دعا طلب کرے۔ کیونکہ جو شخص غائبانہ طور پر اپنے مومن بھائیوں کے لئے دعا کرتا ہے تو فرشتے اس کے لئے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ مقام عرفات گناہ معاف کرانے کے لئے بہترین مقام ہے اور بد بخت انسان ہے وہ جو مقام عرفات سے واپس آئے اور اپنے گناہوں کی بخشش طلب نہ کر سکے روایت میں ہے کہ ماورضان میں جس کے گناہوں کی بخشش نہیں ہو سکتی تو اس کی بخشش ہو ہی سکتی۔ مگر یہ کہ عرفات جانے پر موفق ہو اور وہاں اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرے۔

اس مقام پر آئمہ معصومین علیہم السلام سے جو دعائیں منقول ہیں۔ ان کو پڑھنا مستحب ہے۔

افاضہ :- غروب شمس کے بعد عرفات سے مشعر کی طرف روانگی کا نام افاضہ ہے۔

وقوف مشعر :- غروب شمس کے بعد عرفات سے روانہ ہو کر مشعر الحرام میں پہنچے اور وہاں اذان کے بعد دو تو نمازیں مغرب و عشا بجالائے۔ اس مقام پر بھی تمام مسلمان مغرب و عشا کو جمع کر کے پڑھتے ہیں وقوف مشعر سے پہلے غسل مستحب ہے اس مقام پر منقولہ دعائیں پڑھے اور اپنے گناہوں کی اللہ سے مغفرت طلب کرے اور حمد و ثنا پروردگار سے اپنی زبان معطر رکھے۔ نیت کرے کہ وقوف مشعر کرتا ہوں۔ حج تمتع کے لئے قربتہ الی اللہ طلوع صبح صادق سے لے کر طلوع شمس تک وقوف کرنا لازم ہے۔ البتہ عورتیں اور ضعیف مرد اور بیمار لوگ جن کو طلوع شمس کے بعد روانہ ہونے میں لوگوں کے اثر دھام کی وجہ سے تکلیف کا خطرہ ہو تو وہ طلوع صبح سے پہلے بھی منیٰ کی طرف روانہ ہو سکتے ہیں۔ اور اگر یہ خوف نہ ہو تو پھر طلوع شمس کے بعد روانہ ہونا چاہیے۔

منیٰ کے اعمال :- طلوع شمس کے بعد مشعر الحرام سے روانہ ہو اور اگر اس سے پہلے روانہ ہو جائے تو وادی

محسّر کو طلوع شمس سے پہلے عبور نہ کرے اور میاں سے تین جسدوں کو مارنے کے لئے ستر سنگریزے چُن لئے اگر دو چار زیادہ اٹھالے تو بہتر ہے۔ مٹی کے اعمال تین ہیں۔

(۱) رمی جمرہ عقبہ (۲) ترابانی (۳) حلق

مٹی میں پہنچ کر پہلے پہل جمرہ عقبہ کو نیت کر کے سنگریزے مارے۔ سنگریزوں میں شراب ہے کہ پہلے استعمال شدہ نہ ہوں اور بہتر ہے کہ رنگ برنگے ہوں اور حذف کے طریقہ سے مارے یعنی انگشت شہادت کے ناخن اور انگوٹھے کے درمیان رکھ کر کم از کم سات ذراع کے فاصلہ سے جمرہ کی طرف منہ اور قبلہ کی طرف پشت کر کے پایادہ بادھو یکے بعد دیگرے مارے اور مارتے وقت منقول دعا بھی پڑھے۔

حج تمتع کرنے والے پر واجب ہے کہ جمرہ عقبہ کو سنگریزے مار چکنے کے بعد حسب حیثیت اونٹ یا گائے یا بکری وغیرہ کی قربانی کرے اور ہر شخص کو جدا جدا قربانی کرنی چاہیے۔

مسئلہ :- ترابانی کے جانور کی عمر یہ ہوں۔ بھیڑ یا دنبی کی عمر سات ماہ سے زائد ہو اور گائے بکری وغیرہ دوسرے سال میں داخل ہو۔ اونٹ چھ سال میں داخل ہو۔

مسئلہ :- ترابانی کا جانور دُبلّا بیمار، عیب دار نہ ہو۔ لہذا اندھے کانے، سنگڑے، کن کٹے، بیمار اور دُبلے جانور کی قربانی ناکافی ہے۔ قربانی کا جانور خسی بھی نہیں ہونا چاہیے۔

مسئلہ :- قربانی کے گوشت میں سے کچھ صدقہ دے۔ اور کچھ مومنین کو ہدیہ دے اور ہدیہ یا صدقہ کو ایک تہائی سے کم نہیں ہونا چاہیے۔

مسئلہ :- ترابانی کے وقت یہ دعا مستحب ہے۔

وَحَبَّهْتُ وَحَبَّهْتُ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا مُسْلِمًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ إِنَّ صَلَواتِي وَنُصْرَتِي وَغِيَايَ وَمَا بَيْنِي بِلِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَكَفَّ يَسْمِ اللّٰهِ وَيَا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنِّيْ۔

اگر قربانی کرنے والا خود ذبح کا طریقہ نہ جانتا ہو تو ذبح کرنے والے کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھے اور دعائے مذکور پڑھے۔

مسئلہ :- اونٹ نحر کئے بغیر حلال نہیں ہوتا۔ اور دوسرے جانور ذبح سے حلال کئے جاتے ہیں۔

ترابانی کر چکنے کے بعد سر منڈوانا چاہیے یا تقصیر کرنی چاہیے۔ یعنی مونچھوں یا سر کے بالوں میں سے کچھ بال کٹوائے یا ناخن اترالے۔ اگر پہلی دفعہ کا حاجی ہے تو اس کے لئے حلق اور منڈوانا

حلق یا تقصیر

افضل ہے۔ عورتوں پر حلق نہیں ہے۔ بلکہ ان کے لئے تقصیر ہے۔

حلق کے وقت قبلہ رخ بیٹھے اور یہ دعا پڑھے :- اَللّٰهُمَّ اَعْطِنِيْ بِكُلِّ شَعْرَةٍ نُّوْسًا يُّوْمَ الْقِيَامَةِ
مسئلہ :- حلق یا تقصیر کے بعد احرام کی وجہ سے جتنی چیزیں حرام ہوتی تھیں۔ صرف خوشبو۔ بیوی اور شکار کے علاوہ
سب حلال ہو جائیں گی۔

طواف زیارت منیٰ کے اعمال سے فارغ ہونے کے بعد مکہ معظمہ کا رُح کرے اور طواف زیارت بحالائے طواف
کے لئے غسل مستحب ہے۔ باقی شرائط و طریقہ وہی ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ صرف نیت
یہ کرے گا کہ حج تمتع کے لئے طواف زیارت کرتا ہوں۔ وترتہ الی اللہ۔

دو رکعت نماز طواف :- طواف سے فارغ ہو کر دو رکعت نماز طواف مقام ابراہیم پر پڑھے جس طرح مذکور ہو چکا ہے۔
سعی ہر طواف و نماز طواف کے بعد صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے جیسا کہ عمرہ کے بیان میں گذر چکا ہے۔
مسئلہ :- سعی کے بعد اس پر خوشبو لگانا حلال ہو جائے گا۔

طواف نساہ سعی کے بعد بیت اللہ کا طواف کرے اور اس کو طواف النساہ کہا جاتا ہے۔ نیت یہ کرے کہ
طواف نساہ کرتا ہوں یا کرتی ہوں حج تمتع کے لئے وترتہ الی اللہ۔ اور طواف کے بعد دو رکعت
نماز طواف مقام ابراہیم پر پڑھے۔

مسئلہ :- طواف نساہ کرنے سے عورت اور شکار بھی حلال ہو جائیں گے۔ اگر طواف نساہ کو ترک کیا جائے تو عورت
کے لئے مرد اور مرد کے لئے عورت حرام رہے گی۔ جب تک کہ یہ طواف نہ کیا جائے اور شیعہ حاجیوں کو اس کا خاص
طور پر خیال رکھنا چاہئے۔

مبیت منیٰ اعمال منیٰ سے فارغ ہو کر مکہ معظمہ میں جا کر طواف زیارت اور سعی اور طواف نساہ وغیرہ کے اعمال
بحالائے اور اس کے بعد واپس مقام منیٰ پر آجائے اور نیت وترتہ الی اللہ کر کے ۱۲ ذوالحجہ،
۱۲ ذوالحجہ کی دو راتیں یہاں ٹھہرے۔

مسئلہ :- اگر جان بوجھ کر یہ راتیں مقام منیٰ میں نہ رہے تو ایک گوسفند فی شب قربانی دینا اس کا کفارہ ہے۔
مسئلہ :- جو شخص حالت احرام میں شکار اور بیوی سے بچ چکا ہے اس پر تیرہویں کی رات منیٰ پر رہنا ضروری نہیں
پس ۱۲ ذوالحجہ کو بعد از ظہر منیٰ سے جاسکتا ہے اور اگر ۱۲ ذوالحجہ کے دن منیٰ میں غروب ہو جائے تو پھر ۱۳ ذوالحجہ
کی رات کا وہاں مقام منیٰ میں ٹھہرنا ضروری ہے۔

رمی جمار ۱۱ ذوالحجہ کو تینوں حجروں کو نیت قربت سے سنگریزے مارے۔ پہلے حجرہ اولیٰ پھر حجرہ وسطیٰ اور
پھر حجرہ عقبیٰ کو سات سات سنگریزے مارے اور ترتیب یہی رکھتے۔ اور عملاً اس کی خلاف درزی نہ کرے

اگر ۱۳ کی شب منی میں ہو تو ۱۳ کے دن بھی تینوں جہڑوں کو اسی ترتیب سے سنگریزے مارے اور اگر ۱۲ کی ظہر کے بعد وہاں سے روانہ ہو جائے تو باقی ماندہ سنگریزوں کو دفن کر دے۔

مسئلہ ۱: مقام منی میں رہائش کے دوران میں نماز ہائے واجبہ و مستحبہ کو مسجد خیف میں ادا کرنا مستحب ہے روایت میں ہے کہ وہاں ایک سورکعت نماز نافلہ پڑھنا ستر برس کی عبادت کے برابر ہے۔

ان اعمال سے فارغ ہو کر مستحب ہے کہ پھر مکہ معظمہ میں داخل ہو اور طواف و دُاع کرے۔

طواف و دُاع

اور زیادہ سے زیادہ طواف کرنے کی کوشش کرے اور ۳۶۰ طواف کرنا مستحب ہے اور اگر یہ نہ کر سکے تو ۳۶۰ چکر مستحب ہیں۔ بیت اللہ میں طواف کرنا نافلہ پڑھنے سے افضل ہے۔ وہاں اپنے گناہوں کی معافی طلب کرے۔ والدین تیریہوں اور دیگر مومن بھائیوں کے لئے دعا طلب کرے۔ کعبہ کے اندر داخل ہو کر ذکر خدا بجالائے۔

مسئلہ ۲: ہر طواف میں خواہ واجب ہو خواہ مستحب حجر اسود کو بوسہ دینا مستحب ہے اگر بھیڑ و اثر و دھام وغیرہ کی وجہ سے بوسہ دینے پر قدرت نہ ہو تو ہاتھ سے مس کرے دیوار کعبہ سے اپنے جسم کو مس کرنا بہتر ہے خصوصاً تمام ارکان سے چھٹنا مستحب ہے اور ان تمام حالات میں حمد و ثناء پروردگار اور درود شریف کے ذکر غیر سے اپنی زبان کو تر رکھے۔ بیت اللہ کو اس طرح دُاع کرے جس طرح اپنے انتہائی قریبی دوست سے دُاع کر رہا ہو اور خدا سے دوبارہ حج پر موفق ہونے کی دعا طلب کرے۔ روانگی کے وقت کچھ کھجوریں خرید کر صدقہ کرے۔ آب زمزم کو واپسی پر شفا کے لئے ہمراہ لانا خوب ہے۔

مسئلہ ۳: حج بیت اللہ سے فارغ ہونے کے بعد یا حج سے پہلے مدینہ منورہ میں جناب رسالتاًؐ اور دیگر معصومین کی زیارت کو جانا مستحب ہے اور حضور رسالتاًؐ کا فرمان ہے کہ مَنْ حَجَّ وَكَمَّ يَزِمُنِي فَقَدْ جَفَانِي۔ یعنی جو حج کرے اور میری زیارت کو نہ آئے تو تحقیق اُس نے میرے اوپر جفائی کی۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ رَفَعْتُ حَجَّ بَيْتِكَ الْحَرَامِ وَ زِيَارَةَ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ۔

تمم۔ ہر تمام اور کمال میں مشرق

تمامیت: ہر کسی مرتب کے بعض اجزاء شروع ہو جانے کے بعد اس کے آخری جزء تک انضمام کا نام ہے۔

کمال: تمامیت کے بعد ایک دصف کے ساتھ اس کا متصف ہونا جس پر اُس شے کے آثار کا ترتیب موقوف ہو۔

مثلاً انسان کے تمام اجزاء کا پورے طور پر موجود ہونا یہ اس کی تمامیت ہے اور اس کا عالم یا شجاع ہونا مثلاً اس کا کمال ہے پہلی صورت میں انسان تمام ہے اور دوسری صورت میں انسان کامل ہوگا۔ اس مقام پر حکم ہے کہ حج اور عمرہ کے شروع کرنے کے بعد اس کو تمام کر دے۔ یعنی تمام اس کے اجزاء بجالاؤ۔

الْحَجَّةُ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَاتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ

حج کے مہینے معلوم (مقرر شدہ) ہیں۔ پس جس نے ان مہینوں میں حج واجب کیا (اپنے اوپر) تو وہ قرب عورت

وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللَّهُ ۖ

جھوٹ اور سچی یا جھوٹی قسموں سے دوران حج میں بچے اور جس قدر تم نیکیاں کرو گے اللہ اُن کو جانتا ہے

وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ وَالتَّقْوَىٰ يَأُولَى الْأَلْبَابِ ﴿۱۹۶﴾

اور زاد راہ تیار کرو۔ تحقیق بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے اور مجھ سے ڈرو اے صاحبانِ عقل

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ ۖ فَإِذَا أَفَضْتُمْ

نہیں ہے تم پر کوئی گناہ۔ کہ طلب کرو فضل اپنے رب سے پس جب تم افاضہ کرو

مِّنْ عَرَفَاتٍ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۖ وَاذْكُرُوا كَمَا

عرفات سے تو ذکر کرو اللہ کا نزدیک مشعر الحرام کے اور اس کا ذکر کرو جس طرح اس نے تمہیں

هَدَاكُمْ ۚ وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَئِن الضَّالِّينَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ أَفِضُوا

ہدایت کی۔ اگرچہ تم اس سے پہلے (احکام شرعیہ) سے گمراہ تھے پھر افاضہ کر دو تم۔ جہاں سے

مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۹۹﴾

افاضہ کرتے ہیں لوگ۔ اور بخشش طلب کرو اللہ سے تحقیق اللہ غفور رحیم ہے

سوال :- قربانی کے نہ ملنے کی صورت میں جہاں دس روزوں کا حکم دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ تین روزے حج کے دوران میں اور سات روزے واپس پہنچ کر۔ پس یہ دس کامل ہوں گے۔ حالانکہ گذشتہ فرق کے پیش نظر سات روزوں کے ملنے سے دس کو تمام کہنا چاہیے۔

جواب :- تین اور سات روزوں کا حکم جدا جدا ہے گویا یہاں تین روزوں کا حکم اپنے مقام پر تمام ہے۔ البتہ ان کا کمال اور قائم مقام قربانی کا ہونا۔ ان سات روزوں کے رکھنے پر موقوف ہے لہذا یہ سات روزے پہلے تین روزوں کے لئے کمال ہیں۔

رکوع ۹۔ اَلْحَيِّ اَشْهَرُ مَعْلُومَاتٍ۔ حج کے مہینے تین ہیں، ذوالحجہ، ذوالقعدہ، ذوالحجہ۔ لہذا حج تمتع کے عمرہ کا احرام ماہ شوال سے پہلے نہیں باندھا جاسکتا۔

فَمَنْ فَرَضَ بِہ اپنے اوپر حج فرض کرنے سے مراد ہے کہ جس شخص نے حج کا احرام باندھ لیا تو پھر آئندہ ذکر ہونے والی چیزوں سے اس کو بچنا لازم ہے۔

وَلَا فَسُوۡقَیۡ۔ اس سے مراد جھوٹ ہے اور ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ تمام گناہ مراد ہیں اور بعضوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہے کسی کو بُرے نام سے پکارنا۔ بعضوں نے گالی گلوچ مراد لے ہیں اس مقام پر تمام معافی مراد لے جاسکتے ہیں اور حالت احرام میں ان سب سے اجتناب کرنا واجب ہے۔

وَلَا جِدَالَ۔ اس سے مراد لادالہ اور بے ڈالہ کے الفاظ ہیں۔ خواہ جھوٹ میں کہے یا سچ میں کہے، اور بعضوں نے مطلق جھگڑا اور گالی گلوچ مراد لیا ہے۔

نکتہ علمیؑ۔ آیت مجیدہ میں حج کے لفظ کو تین دفعہ دہرایا گیا ہے۔ حالانکہ پہلی دفعہ ذکر کرنے کے بعد باقی دونوں مقامات پر ضمیر کا لانا کافی تھا۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں حج سے مراد ہر سہ مقامات پر ایک نہیں ہے۔ پہلی جگہ لفظ حج سے مراد زمان حج ہے اور دوسری جگہ افعال حج مراد ہیں اور تیسری جگہ افعال حج کا زمانہ مقصود ہے اگر لفظ حج کو نہ دہرایا جاتا۔ بلکہ ضمیر کو لایا جاتا تو عبارت میں طول ہو جاتا۔ کیونکہ دوسری جگہ بجائے لفظ حج کے اَفْعَالٌ اور تیسری مقام پر بجائے لفظ حج کے اَفْعَالٌ کہنا پڑتا۔ اور اس میں شک نہیں کہ لفظ حج کے دہرانے سے اس طول کی ضرورت نہیں تھی۔ اَنْ تَبْتَغُوْا۔ امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ فضل سے مراد رزق ہے یعنی جب احرام سے فارغ ہو جائے اور اپنے مناسک حج ادا کر لے اور تو اس کے لئے خرید و فروخت کی مخالفت نہیں ہے اور کہتے ہیں کہ جو لوگ زمان حج میں کریدار اور مزدور ہوا کرتے تھے تو ان کو دوسرے ساتھی کہا کرتے تھے کہ تمہاری حج میں نہیں ہوتی کیونکہ تم پیسہ کما رہے ہو۔ اور اس بنا پر یہ آیت اتری اور جابر نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ فضل سے مراد یہاں مغفرت ہے کہ ان ایام میں خدا سے بخشش و مغفرت طلب کرو۔

شَمَّ اَفِیْضًا۔ اس کے معنی میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ افاضہ سے مراد وہی عرفات سے افاضہ کرنا ہے۔ کیونکہ قریش لوگ وقوف عرفات نہیں کرتے تھے اور لوگوں کے ہمراہ رہنا اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ لہذا وہ شعر میں وقوف کر کے وہاں سے منیٰ کی طرف افاضہ کرتے تھے تو یہ آیت اتری کہ تم اسی جگہ سے افاضہ کرو جہاں سے اور لوگ افاضہ کرتے ہیں۔ اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ عرفات سے افاضہ کرنے کا حکم پہلے بھی آچکا ہے تو یہاں تکرار کیوں کیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں تقدیم و تاخیر ہے۔ اصل میں یوں تھا۔ شَمَّ اَفِیْضًا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ فَاِذَا اَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاِذَا كُنْتُمْ اِلٰی عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ یعنی پھر افاضہ کرو جہاں سے افاضہ کرتے ہیں باقی لوگ

فَإِذَا قُضِيَتْ مِنْ أَسْوَاقِكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ وَأَشَدَّ ذِكْرًا ط

پس جب پورا کر دے اپنے اعمال کو تو ذکرِ خدا کا جو طرح اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے ہو یا اس سے بھی زیادہ

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝٢٠

پس بعض لوگ کہتے ہیں۔ اے رب ہمیں عطا کر دنیا میں اور نہیں ہے ان کا آخرت میں کچھ حصہ

وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً

اور بعض ان میں سے کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں عطا کر دنیا میں خیر و خوبی اور آخرت میں خیر و خوبی

وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿٢٠﴾ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نُصِيبُ مِمَّا كَسَبُوا ۖ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٢١﴾

اور بچا ہم کو دوزخ کے عذاب سے ایسے لوگوں کے لئے حصہ ہے اس چیز سے جو انہوں نے کمایا اور اللہ جل جلالہ حساب لینے والا ہے

یعنی دوسرے عرب اور جب عرفات سے افاضہ کر دو تو پھر مشعر الحرام میں پہنچ کر خدا کا ذکر کرو اور دوسرا معنی اس کا یہ ہے کہ اس افاضہ سے مراد مشعر الحرام سے افاضہ کرنا ہے پس دو افاضے واجب ہوئے۔ پہلے عرفات سے مشعر کی طرف اور دوسرا مشعر سے منیٰ کی طرف۔ (از مجموعہ السببان)

روایاتِ اہلبیت میں پہلے معنی کو اختیار کیا گیا ہے اور وجہ یہی ہے کہ قریش مشعر سے افاضہ کرتے تھے اور دوسرے عرب قبائل عرفات سے افاضہ کرتے تھے جب جناب رسالتاً تشریف لائے تو سب کو عرفات سے افاضہ کا حکم ہوا۔ نیز آیت میں ناس سے مراد حضرت ابراہیم و حضرت اسمعیلؑ لئے گئے ہیں۔

فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ ۖ - صحیح البیان - امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب جاہلی عرب ان اعمال سے فارغ ہوتے تھے تو منی میں حج ہو کر اپنے آباؤ اجداد کے کارنامے ذکر کر کے ایک دوسرے پر فخر و مباہات کیا کرتے تھے۔ پس یہ آیت اتری کہ جب مناسک حج کو ادا کر لیا کرو تو اللہ کا ذکر کیا کرو جس طرح اس سے پہلے اپنے باپ دادا کا ذکر کیا کرتے تھے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اور ذکر سے مراد بحیرات ہیں جو عنقریب ذکر کی جائیں گی۔ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ بِر اس کے کئی معانی کئے گئے ہیں۔ (۱) حسنہ دنیا سے مراد نعمات دنیا ہیں اور حسنہ آخرت سے مراد نعمات آخرت ہیں۔ (۲) امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ حسنہ دنیا سے مراد، رزق و معاش کی وسعت اور حسن خلق ہے اور حسنہ آخرت سے مراد اللہ کی خوشنودی و جنت ہے (۳) دنیا میں علم و عبادت اور آخرت میں بہشت (۴) دنیا میں مال اور آخرت میں جنت (۵) دنیا میں نیک عورت اور آخرت میں جنت۔ یہ حضرت امیر علیہ السلام سے مروی ہے اور جناب رسالتاً ص سے مروی ہے کہ جس شخص کو شکر گزار دل۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ اَيّٰمٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۖ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَا اِثْمَ

اور تم ذکر کرو اللہ کا گئے چنے ہوئے دنوں میں پس جو شخص جلدی کرے دو دنوں میں تو اس

عَلَيْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقٰ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا اَنَّكُمْ

پر کوئی گناہ نہیں اور جو تاخیر کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ واسطے اس کے جو پچا ہو اور اللہ سے ڈرو اور جان لو تحقیق تم

اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۳﴾

طرف اسی کے جمع کئے جاؤ گے۔

ذکر کرنے والی زبان اور امور دنیا و آخرت میں امداد کرنے والی مومنہ عورت عطا ہو تو پس اس کو دنیا و آخرت کی خیر و خوبی عطا ہو گئی اور وہ عذاب و دوزخ سے بھی بچ گیا۔

سَرِيْعُ الْحِسَابِ۔ اس کے دو معنی ہیں (۱) انسان کو اپنے اعمال کی جزاء دینے میں جلدی بلکہ خدا بہت جلد اس سے حساب لینے والا ہے کیونکہ ادھر اُس کی موت آئی ادھر اس کا حساب شروع ہوا۔ لہذا حساب لئے جانے میں کوئی دیر نہیں (۲) قیامت کے روز خدا حساب اپنی مخلوق سے جلدی لے گا یعنی ایک ہی وقت میں وہ تمام اہل محشر کا حساب لے لیگا۔ بعض روایات میں ہے ایک پلک بھینکنے کے وقت میں سب حساب لے لے گا۔ کیونکہ وہ ایک ہی وقت میں سب کی سُن سکتا ہے اور سب سے خطاب فرما سکتا ہے وہ اس معاملہ میں آلات و اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ حضرت امیر علیہ السلام سے مروی ہے کہ خدا مخلوق کا حساب ایک ہی وقت میں اس طرح لے گا۔ جس طرح سب کو رزق ایک ہی وقت میں دے دیتا ہے۔

نکۃ لطیفہ :- یہاں ج ذکر کرنے والوں کی نیت میں فرق بیان کیا گیا ہے کہ لوگ حج کے لباس میں بھی دو قسم کے ہوا کرتے ہیں ایک طالب دنیا اور دوسرے طالب دین۔ پہلی قسم کا پہلی آیت میں ذکر فرمایا ہے کہ ان کی دعا صرف منافع دنیاوی کی طلب تک ہی محدود ہے لہذا ان کی طلب میں حسنہ کا کوئی ذکر نہیں کیونکہ اغراض دنیاویہ کے متوالے صرف تکمیل منافع دنیاویہ ہی ان کا مطمح نظر ہوتا ہے خواہ اللہ کے نزدیک وہ اچھی ہو یا بُری۔ کیونکہ ان کو تمام دنیاوی فوائد اچھے ہی اچھے نظر آتے ہیں۔ اور دوسری آیت میں دوسری قسم کے حاجیوں کا ذکر ہے جو خوشنودی خدا کے لئے حج کرتے ہیں اور چونکہ ان کا مطمح نظر اللہ کی رضامندی ہوتی ہے لہذا ان کی دعا میں دنیا و آخرت میں حسنہ کی طلب کا ذکر فرمایا ہے پہلی قسم کے لوگوں کا عمل اگرچہ تمام ہوتا ہے لیکن چونکہ کامل نہیں ہوتا۔ لہذا ان کے متعلق فرمایا کہ ان کا آخرت میں حصہ نہ ہو گا۔ اور دوسری قسم کے لوگوں کا عمل تام بھی ہوتا ہے اور کامل بھی۔ لہذا وہ جزا و ثواب کے مستحق ہیں تو ان کے لئے فرمایا کہ ان کے لئے اُن کے ہونے کا اجر ثابت ہے۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ ۔ اَیّام مَّعْدُوْدٰت یعنی گئے ہوئے دن ان سے مراد اَیّام تشریق ہیں یعنی ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذوالحجہ اور ان اَیّام

میں ذکر کرنے سے مراد تکبیرات ہیں۔ جن کو نماز ہائے فریضہ کے بعد پڑھنا مستحب ہے اور بعض علماء کے نزدیک واجب ہے اور عید کے دن نماز ظہر سے لے کر ۱۳ ذوالحجہ کی نماز صبح تک ان پندرہ نمازوں کے بعد ان کو پڑھنا چاہیے اور وہ یہ ہیں :- اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَللّٰهُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَ لِلّٰهِ الْحَمْدُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ عَلٰی مَا هَذَا اَنَا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی مَا اَوْلٰیْنَا اَللّٰهُ اَكْبَرُ عَلٰی مَا رَزَقْنَا مِنْ بَیْہِمَا الْاَنْعَامِ اور جو لوگ منی میں موجود نہ ہوں۔ ان کے لئے دس نمازوں کے بعد یہی تکبیرات پڑھنی چاہئیں۔ یعنی عید کے دن نماز ظہر سے لے کر بارہویں کی نماز صبح تک۔ گویا حاجیوں کے لئے پندرہ نمازوں کے بعد اور باقی لوگوں کے لئے دس نمازوں کے بعد تکبیرات کا پڑھنا مستحب ہے اور بقولے واجب ہے۔

فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَئِذٍ - ظاہر اس میں نفراؤل کے جائز ہونے کی طرف اشارہ ہے جو شخص ایام تشریق کے دوسرے روز یعنی ۱۲ ذوالحجہ کو منی سے روانہ ہو جائے تو اس پر کوئی گناہ (ہرج) نہیں ہے اور جو تاخیر کرے اور ۱۳ ذوالحجہ کو وہاں سے روانہ ہو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ بارہویں کے دن نفرتا یعنی کوچ کرنا بھی جائز اور تیرہویں کے دن نفرتا بھی جائز ہے لیکن نفراؤل سے نفرتا یعنی تیرہویں کے دن کی روانگی افضل ہے تاکہ جہروں کو سنگریزے اس دن بھی مار کر مقدار پوری کر لے اور بارہویں کے دن اگر نفرتا سے پہلے ناجائز ہے بلکہ زوال کے بعد غروب تک جس وقت چاہے جاسکتا ہے اور غروب اگر منی میں ہو جائے تو پھر رات کو رہنا واجب ہو جائے گا اور تیرہویں کے دن نفرتا کو اختیار کرنا لازم ہوگا۔

آیت کے معانی میں چند قول ہیں۔

(۱) لَا اِسْمَ عَلَیْہِ :- سے مراد ہے کہ اعمال حج کرنے کے بعد اس کے تمام گناہ معاف کر دیئے گئے۔ خواہ نفراؤل کرے یا نفرتا، دونوں صورتوں میں اس کے سابقہ گناہ مغفور ہیں۔

(۲) اِزَالۃُ شُبۡہِہ :- ممکن ہے بعض لوگوں کے دل میں یہ وہم پڑ جائے کہ شاید نفراؤل یعنی بارہویں کو منی سے کوچ کرنا گناہ ہو تو اس وہم کا ازالہ کر دیا گیا ہے کہ نفراؤل یا نفرتا ہر دو میں کوئی ہرج نہیں ہے۔

(۳) امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس کی موت جلدی آجائے اور ان دنوں کے اندر مر جائے تو اس کے ذمہ کوئی گناہ باقی نہیں کیونکہ مناسک حج ادا کرنے کی وجہ سے سب کے سب معاف ہو گئے ہیں اور جس کی موت ان ایام سے مؤخر ہو جائے تو اس کا آئوہ کوئی گناہ نہ محسوب ہوگا۔ بشرطیکہ گناہن کبیرہ سے بچا ہے لَسَمِنَ اَلَّتَقٰی :- اگر پچھلے فقرہ سے مراد نفراؤل اور نفرتا کا جواز ہو۔ (یعنی ۱۲ ذوالحجہ یا ۱۳ ذوالحجہ دونوں ہی تاریخوں میں منی سے روانگی جائز ہے اور حاجی کو اختیار ہے کہ جس دن چاہے روانہ ہو) تو اس صورت میں لَسَمِنَ اَلَّتَقٰی اس کے اختیار کی قید ہے یعنی یہ اختیار اس حاجی کے لئے ہے جو حالت احرام میں تھکارت سے بچا رہے۔ ورنہ جو شخص حالت احرام

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ اللَّهُ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ

اور لوگوں میں سے بعض کہ آپ کو بھلی معلوم ہوتی ہے بات اس کی دنیا میں اور وہ گواہ بنا آتا ہے اللہ کو اور اس کے جو اس کے دل میں ہے

وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ۖ وَإِذَا تَوَلَّى سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ

حالانکہ وہ سخت ترین دشمن ہے اور جب وہ ہر سمت تار آتا ہے تو بھاگ دوڑ کرتا ہے کہ زمین میں فساد برپا کرے اس

الْحَرْثَ وَالشَّالُ ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ ۚ وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ

میں اور برباد کرے کھیتی اور نسل کو اور خدا فساد کو دوست نہیں رکھتا اور جب اس کو کہا جائے کہ اللہ سے ڈر تو غلبہ کرتی

الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ ۚ وَلَبِئْسَ الْيَهَادُ ۚ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ

ہے اس پر حمت ساتھ گناہ کے پس کافی ہے اس کے لئے دوزخ اور وہ بُرا ٹھکانا ہے اور بعض لوگ ہیں جو بیچتے ہیں

لِيَسْرِى نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ رَؤُوفٌ بِالْعِبَادِ ۚ

اپنے نفس کو واسطے طلب رضا مندی خدا کے اور اللہ بڑا مہربان ہے اپنے بندوں پر

میں شکار سے نہ بچ سکا ہو تو اس کے لئے نفا اول جائز نہیں بلکہ نافرمانی اس پر واجب و معین ہے اور اگر پہلے فقرہ میں پہلا یا تیسرا قول اختیار کیا جائے تو اتنی سے مراد گناہان کبیرہ سے اجتناب ہے یعنی حاجی کے تمام سابقہ دلائل گناہ معاف ہو جاتے ہیں بشرطیکہ آئندہ گناہان کبیرہ سے بچا رہے چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی یہی فرمایا ہے۔

رابطہ ہر بیان حج میں گزر چکا ہے کہ لوگوں کی دو قسمیں ہیں ایک طالب دنیا اور دوسرے طالب آخرت تو اس مقام پر بھی لوگوں کی دو قسموں کو بیان فرما رہا ہے۔ ایک منافق قسم کے اور دوسرے خالص مومن۔ پس ان آیتوں کو حج کی آیات سے مناسبت تھی لہذا حج کے بیان کے بعد ان کا ذکر کیا گیا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ ۖ تفسیر عمدۃ البیان میں ہے کہ ایک شخص منافق اخنس نامی جو نہایت خوش گفتار تھا۔ حضرت رسالت اکبر کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوتا اور اللہ کو گواہ کر کے کہتا کہ جو کچھ میرے دل میں ہے وہی میری زبان پر ہے اور میں سچے دل سے مسلمان ہوں۔ آنحضرت کو اس کی چکنی چڑھی باتیں ظاہر کے لحاظ سے پسند آیا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ آنحضرت کی خدمت سے رخصت ہو کر چلا گیا تو کسی مقام پر مسلمانوں کی کھیتی کو آگ لگا دی اور ان کے چوپاؤں کو قتل کر دیا۔ پس یہ آیت نازل ہوئی تفسیر برہان میں معصومین سے مروی ہے کہ باطن کے لحاظ سے اس آیت کے مصداق فلاں فلاں ہیں۔

مساد یہ کہ زمانہ میں جب حدیث سازی کا کام شروع ہوا تو سمر بن جندب کو حکومت نے چار لاکھ درہم صرف اس العام میں دیئے کہ اس نے دوسری سال میں شیعہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا دْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ

اے ایمان والو! (صرف زبانی دعویٰ کرنے والو) داخل ہو جاؤ اسلام میں (دل و جان سے) سب کے سب اور نہ اتباع کرو نقش قدم شیطان

إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿۲۰۸﴾ فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمْ الْبَيِّنَاتُ

کی۔ تحقیق وہ تمہارا ظاہر دشمن ہے پس اگر تم پھسل جاؤ بعد اس کے کہ آپکیں تمہارے پاس روشن دلیلیں تو پس جان لو کہ

فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ

تحقیق اللہ غالب اور حکمت والا ہے وہ نہیں انتظار کرتے مگر اس کی کہ لائے خدا ان پر بادل کے ٹکڑے

فِي ظِلٍّ مِنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿۲۱۰﴾

اور فرشتے (عذاب کے) اور حتمی ہو جائے معاملہ (عذاب کا) اور اللہ کی طرف ہی پھیرے جائیں گے تمام امور

رجعت کا بیان

أَدْخُلُوا فِي السِّلْمِ۔ تفسیر برہان میں آئمہ اہلبیت علیہم السلام کی طرف سے متعدد روایات منقول ہیں جو غالباً حد تو اتار تک پہنچتی ہیں کہ سلم سے مراد اس آیت میں حضرت علیؑ اور اس کی اولاد طاہرینؑ کی ولا کا اقرار ہے اور خطوات شیطان سے مراد دشمنان اہلبیت کی دلاء ہے (یہ تفسیر باطنی اعتبار سے ہے)

هَلْ يَنْظُرُونَ۔ تفسیر آئمہ اہلبیت میں ہے کہ یہ آیت رجعت کے متعلق ہے چنانچہ ایک روایت میں حضرت جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ یوم وقت معلوم میں اہلبیس اپنے تمام مریدوں کو جمع کرے گا اور اس کے مقابلہ میں حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام اپنے شیعوں میں تشریف لائیں گے ان دونوں لشکروں کی ملاقات فرات کے کنارے کوفہ کے قریب مقام روحا پر ہوگی اور سخت ترین لڑائی واقع ہوگی پس اس وقت خدا کا امر بادلوں کے ٹکڑوں میں نمودار ہوگا۔ ملائکہ عذاب اتریں گے اور جناب رسالت تشریف لائیں گے کہ ان کے ہاتھ مبارک میں ایک نورانی حربہ ہوگا۔ جب اہلبیس یہ چیزیں ملاحظہ کرے گا۔ تو فرار کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے پیروکار اس سے بھاگنے کی دجر پوچھیں گے تو جواب میں کہے گا کہ مجھے وہ چیز نظر آرہی ہے جس کو تم نہیں دیکھ رہے ہو۔ پس جناب رسالت اس کو پیچھے سے دونوں کندھوں کے درمیان نیزہ ماریں گے اور وہ واصل جہنم ہوگا۔ اس کے بعد ایک طویل مدت تک حضرت علیؑ حکومت کریں گے جو چونتالیس ہزار سال ہوگی۔ (الخبر)

سَلْ بَنِي إِسْرَءِيلَ كَمَا آتَيْنَهُمْ مِنْ آيَةٍ مُبَيِّنَةٍ ۖ وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ

دریافت کیجئے بنی اسرائیل سے کہ کس قدر دی ہیں ہم نے اُن کو نشانیاں واضح اور جو شخص تبدیل کرے اللہ کی نعمت

اللَّهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۴۱﴾ زَيْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا

کو بعد اس کے کہ اس کے پاس آجائے تو پس تحقیق اللہ سخت عذاب والا ہے زینت دی گئی کافروں کے لئے

الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ

زندگانی دنیا اور وہ لوگ مسخری کرتے ہیں اُن سے جو ایمان لائے اور وہ لوگ جو شقی ہیں ان سے بلند مرتبہ ہوں گے بروز

الْقِيَامَةِ ۚ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

مُحَدَّد اور خدا رزق دیتا ہے جسے چاہے بغیر حساب کے

رکوع ۱۰

ربط آیات :- اصول اسلام بیان کرنے کے بعد خداوند کریم نے یہ فروعی مسائل بیان فرمائے اور عمل کرنے والوں کے لئے وعدہ جنت اور نافرمانی کرنے والوں کے لئے وعید جہنم کا ذکر کیا اور بیان فرمایا کہ لوگوں کی تین قسمیں ہیں :-

(۱) مومن جو دنیا و آخرت کی مصلحتی چاہتے ہوئے نیک اعمال بجالاتے ہیں

(۲) خالص کافر جن کا مصلح نظر صرف منافع دنیاویہ ہیں -

(۳) منافق لوگ جو تیرے سامنے میٹھی میٹھی اور چکی پھڑپی باتیں کرتے ہیں اور باہر جا کر فساد بپا کرتے ہیں - اس کے بعد فرمایا کہ ان لوگوں کی مخالفت اس لئے نہیں کہ حق کی دلیلیں کمزور ہیں بلکہ اُن کا خبیث باطن اور سوسریت اُن کو قبول حق سے روکتی ہے۔ اور تجھ سے پہلے بنی اسرائیل کا ہمیشہ سے یہی دستور رہا ہے خدا اُن سے سوال تو کیجئے کہ تمہارے پاس کس قدر واضح دلیلیں آچکی ہیں اور جو لوگ جان بوجھ کر حق سے کنارہ کش ہوتے ہیں ان کو معصوم ہونا چاہیئے کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔

زَيْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا :- بنی اسرائیل کو متنبہ کرنے کے بعد کفار کے متعلق فرماتا ہے کہ اُن کو زینت دنیاوی پر غور ہے اور اپنی ظاہری ٹھاٹھ کی بناء پر حق سے یکسوئی کرتے ہوئے مومنین سے مسخری وغیرہ کرتے ہیں اور اُن کو اپنے سے پست سمجھتے ہیں حالانکہ رزق تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہاں قیامت کے دن ان کو پتہ چلے گا کہ ایمان والوں اور ڈرنے والوں کا مرتبہ کس قدر بلند ہے اور وہ لوگ کس تاریکی و پستی میں تھے اور اس آیت کے شان نزول کے متعلق کہا گیا ہے کہ البوہل اور دیگر اکابر قریش جو مالدار

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ

لوگ ایک جماعت تھے پس بھیجا خدا نے نبیوں کو جو بشارت دینے والے اور ڈرلے

وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيُحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِي مَا اخْتَلَفُوا فِيهِ

وہ لے تھے اور اتاری ان کے ساتھ کتاب ساتھ حق کے تاکہ حکم کرے لوگوں میں اس چیز کے متعلق جس میں ان کو اختلاف تھا

وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ

اور اس میں نہیں اختلاف کیا مگر ان لوگوں نے جن کو وہ دی گئی بعد اس کے کہ آئیں ان کے پاس واضح دلیلیں

بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ

سرکشی کرتے ہوئے اپنے درمیان پس ہدایت فرمائی اللہ نے ایمان والوں کی اس چیز میں ان کو اختلاف تھا حق سے

بِإِذْنِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۱۳۳﴾

ساتھ اپنے اذن کے۔ اور خدا ہدایت فرماتا ہے جسے چاہے طرف راہِ راست کے

تھے فتنہ مومنین مثلاً عبداللہ بن مسعود اور بلال و عمار وغیرہ سے مسخری کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر محمد اللہ کا نبی ہوتا تو ہمارے اشراف و اکابر اس کی اتباع کیوں نہ کرتے؟ اور بعض کہتے ہیں کہ رؤسا یہود و مہاجر فتنہ اسے مسخری کرتے تھے اور ان کو فتنہ کا طعنہ دیتے تھے تب یہ آیت نازل ہوئی۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً :- اس آیت مجیدہ کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں :-

(۱) حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت نوحؑ کے زمانہ تک کے لوگ مراد ہیں کیونکہ یہ سب ملت کفر پر تھے۔ چنانچہ تفسیر برہان میں حضرت صادقؑ سے ایک روایت ہے کہ جب حضرت آدمؑ کی رحلت ہوئی تو حضرت شیث ان کے وصی اور جانشین تھے۔ لیکن قابیل نے ان کو دین حق کے اظہار سے روک دیا تھا اور قتل کی دھمکی دی تھی۔ پس حضرت شیث تقیہ میں زندگی بسر کرتے رہے اور کفر روز بروز ترقی کرتا گیا اور حضرت شیث ایک جزیرہ میں علیحدگی اختیار کر کے عبادتِ خدا میں مشغول رہے۔ (۲) بعضوں نے کہا ہے کہ اس آیت سے حضرت نوحؑ سے حضرت ابراہیمؑ تک کے زمانہ کے لوگ مراد ہیں جو کہ حالت کفر پر تھے۔

(۳) بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ لوگ ایک جماعت میں تھے یعنی کلمہ حق پر تھے لیکن بعد میں ان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔

(۴) بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضرت نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار تھے یہ سب حق پر تھے۔ لیکن

کچھ عرصہ بعد ان میں اختلاف پیدا ہوا اور پھر کچھ بعد دیگرے ان کے پاس انبیاء بھیجے گئے۔

۵۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آدمؑ اور نوحؑ کے درمیان والے لوگ مراد ہیں اور یہ لوگ نہ کافر تھے اور نہ مومن تھے بلکہ مذہب تھے۔ پس انبیاء معجوث ہوئے اور ان کو صحیح اسلام کے راستہ کی دعوت دی گئی۔

وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ :۔ یعنی جن لوگوں کے پاس کتاب آجاتی تھی تو پھر جان بوجھ کر وہ اس میں اختلاف ڈال دیتے تھے جس طرح یہودی علماء کہ انہوں نے جناب رسالتؐ کے اوصاف و جو تواریخ میں موجود تھے (کو تبدیل کر کے عوام کو اختلاف دگرہی میں ڈال دیا۔

فَمَهْدَى إِلَهُ الَّذِينَ آمَنُوا :- خدا ہدایت سب کو کرتا ہے لیکن فائدہ چونکہ مومن ہی اٹھاتے ہیں اس لئے ان کو خاص طور پر ذکر فرمایا ۔

عقلی و اصولی بحث

ذاتِ حق سجادہ نے اس مقام پر نوعِ انسانی کی اصل فطرت، ان کی تکلیف، دین کی وجہ تشریح، نوعِ انسانی میں سبب اختلاف اور ارسالی انبیاء کی غرض کو واضح فرمایا ہے۔

جس کا اجمال یہ ہے کہ نوع انسانی کی فطرت جو اللہ نے ان کو ودیعت فرمائی ہے وہ ہے باہمی اتحاد و تعاون یعنی اول خلقت میں مزاج انسانی کا خمیر اسی فطرت پاکیزہ اور جبلت سعیدہ سے ہے۔ لیکن طلب فضائل و کمالات اور اشتہار کاثر و مرغوبات کی فطری و خلقی ہوس نے اسے بے اعتدالی اور بے راہ روی کی آماجگاہ میں ڈال کر باہمی انتشار اور آپس کے نزاعات تک پہنچا دیا۔ لہذا ان کے باہمی حقوق کے امتیازات اور نزاع و اختلاف سے نجات کے لئے ایسے قوانین کے وضع کرنے کی ضرورت ناگزیر تھی۔ جو ان کے روزمرہ کے معاملاتی خلفشار اور ذاتی مشاجرات کے قلع قمع کے لئے عمل میں لائے جائیں۔ پس ایسے قوانین جو خود ذات اقدس الہیہ نے مصالح عباد کے لئے مقرر فرمائے ہیں۔ ان کے مجموعی ڈھانچے کو دین کا لبادہ اوڑھا دیا اور ان پر عمل کرنے یا ان کو پس پشت ڈالنے کا نتیجہ ثواب و عتاب مقرر فرمایا اور ان قوانین کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انبیاء و رسل کو بشارت و نذرات کے فرائض تفویض فرما کر بھیجا اور ساتھ ساتھ ان کو معارف و محقائق کا معلم بناتے ہوئے فروعی اعمال کا ضابطہ دے کر ان کو قیادت انسانی کا عہدہ سپرد فرمایا۔ تاکہ نوع انسانی جو رد اعتساف کچی و انحرف اور بے داد و استبداد کی پُرخطر، امن سوز اور دھیانہ انداز سے اجتناب کرتے ہوئے بجائے توحش و نفث کے پُر بہار پُر امن اور پُر اطمینان زندگی گذاریں۔ باہمی اختلاف و انتشار کی جگہ انس و محبت لے لے۔ افتراق اتفاق سے بدل جائے خلفشار کی بجائے دوستی و پیار ہو، سفاکی و بیباکی کے مقام پر صلح و آشتی آجائے، بے حیائی و بے اعتدالی حیا و عفت اور عدل و انصاف سے تبدیل ہو جائے، خود غرضی و نفث

پرستی کی جگہ رواداری و غمگساری آجائے اور حیوانیت اور درندگی کی بجائے شرافت اور انسانیت کا بول بالا ہو۔ پس دین ایک ایسا ضابطہ اور لائحہ عمل ہے جو نوع انسانی کو اپنی فطرت جبلت کے فرائض سے روشناس کرتا ہے اور جو اتحاد و تعاون کا سرچشمہ ہے اور لادینی انسانیت کے لئے وہ سم قاتل اور زہر ہلاہل ہے جو خلاف فطرت افعال کے لئے انسان کا پیش خیمہ ہے جن کا نتیجہ آخر کار انسانیت کے زندہ درگور کرنے پر منتهی ہوتا ہے۔

انسان کیا ہے ؟ مادہ و طبیعت کے پرستار سادہ لوح طبائع انسانیہ کو مؤؤف بلکہ مضحیٰ کرنے اور ان کو لادینیت کے الجھاؤ میں ڈالنے کے لئے کئی ایک بے تکلیاں کستے ہیں اور من جملہ ان کی خرافات کے ایک یہ بھی ہے کہ انسان کی ابتداء بندر سے ہوئی۔ یعنی انسان پہلے بندر تھا اور مردہ زمانہ سے ترقی کرتے کرتے انسان بن گیا۔ اُن کا یہ دعویٰ صرف بعض مشابہات سے انکشاف کا نتیجہ ہے۔ ورنہ مقام دلیل میں اُن کے پاؤں لنگ اور زبان گنگ ہے۔ خداوند قدوس نے اپنے کلام پاک میں متعدد مقامات پر پوری تفصیل سے آغازِ خلقت انسانیہ کا تذکرہ فرمایا ہے اور نوع انسانی کو ایک علیحدہ مخلوق قرار دیا ہے۔ اس کا ماں باپ حضرت آدم و حوا کو مترا دیکر ان بے ہودہ و لادینی خیالات میں پڑنے سے روک رہے اور اس کو اشرف المخلوقات کی خلعت سے مزین فرما کر دنیا میں بھیجا ہے اگر نسل انسان بندر سے ہو تو اس عقیدہ کی حمایت کرنے والوں پر یہ عقلی فرض عائد ہوتا ہے کہ خلعت شرافت و تاج کرامت جو انسانیت کا زیور ہے اپنے سر سے اتار کر ان کرم فرماؤں اور مہربانوں کے سپرد کر دیں جن سے اپنی نسل کی ابتداء مانتے ہیں۔ کیونکہ باپ کی موجودگی میں بیٹے کو قطعاً حکومت کا حق نہیں بلکہ کس قدر ناخلف اور عاق ہوگی وہ اولاد جو دوسروں پر تو بجائے خود اپنے باپ اور محسن پر بھی اپنی فوقیت کا ڈھنڈورا پیٹنے والی ہو (بریں عقل و دانش بایاد گریست)

انسان دو جزؤں کا مرکب ہے۔ ایک رُوح دوسرے بدن۔ رُوح جزو اشرف و اعلیٰ ہے اور بدن جزو خس ہے ان ہر دو جزؤں کا تعاون و تلازم زندگی کہلاتا ہے اور ان کے تفارقی کا نام موت ہے اور جو خدا تعالیٰ سے نکال کر ہر دو جزؤں کو خلعت وجود سے آراستہ فرماتے ہوئے ان کو اتحاد و یگانگت بخش سکتا ہے وہ ان کے افراق و انتشار کے بعد دوبارہ ان میں یکجہتی لاکر حیات ثانیہ سے بھی سرفراز فرما سکتا ہے اور جو عدم ازلی کے بعد وجود دینے پر قادر ہے اس کے لئے عدم لاحق کے بعد وجود کرنا کیا مشکل ہو سکتا ہے کیونکہ نئے سرے سے جوڑ سکے والے کے لئے توڑنے کے بعد جوڑنا تو کوئی بڑی بات ہی نہیں۔

پھر فیاض مطلق نے انسان پر خلعت وجود کے ساتھ ساتھ ایک جوہر شعور بھی مرحمت فرمایا اور اس کو کان، آنکھ، دل و دماغ ایسی قوتیں عطا فرمائیں۔ پس وہ حواس ظاہریہ و قوائے باطنیہ کے باہمی تعاون اور عقل و دماغ کی روشنی میں ادراک فکر کے صحیح و صائب نظریوں سے استفادہ کر کے اشیاء عالم کا مطالعہ کر سکتا ہے اور پوری دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کے ذریعہ سے تمام عالمی پیداوار میں سے اپنے نفع و نقصان کی چیزوں میں امتیاز کر کے جلب نافع اور دفع ضار کرنے پر قادر ہے۔ یعنی انواع موجودات میں آمرانہ تصرف اور حاکمانہ تسلط اس حضرت انسان کو حاصل ہے۔

ارشاد قدرت ہے: **خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا** (جو کچھ زمین میں ہے وہ تمہارے لئے ہی اللہ نے پیدا کیا ہے) **سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ** (تمہارے لئے اس نے آسمانوں اور زمین کی تمام اشیاء کو مسخر فرمایا) اس کے علاوہ دیگر آیات بھی بکثرت موجود ہیں جن میں انسان کا عالمی اشیاء کے استخدام و تسخیر پر قادر ہونے کا صراحتاً یا اشارتاً دکانیتہ ذکر آتا ہے اور دور حاضر میں اس کا مطلب عقلی اولہ یا نقلی براہین سے پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ کیونکہ مشاہد و تجربہ نے مقام اثبات میں پڑنے سے سبکدوش کر دیا ہے۔

پس قوت فکر و ادراک اور رابطہ تسخیر موجودات کے حصول کے بعد انسان کا ارتقاء پسند اور رفعت طلب دماغ علوم مناسبہ و فنون لائقہ میں دسترس حاصل کرنے کے لئے بے چین رہتا ہے اور اس کے مشاعرہ و قوی اس کو ہمیشہ آگے بڑھنے کی دعوت دیتے ہیں۔

وجہ اختلاف و انتشار نیز انسان میں اسی شعور و ادراک کے آثار و نتائج میں مختلف قوتیں موجود ہیں جو باہمی طور پر برسر پیکار بھی رہتی ہیں۔ جذبات خود پسندی و خود غرضی و نفس کو شہی کا مقتضی یہ ہے کہ ان کمالات میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو اور انصاف و عدل کے تقاضے اپنی اپنی حدود سے تجاوز کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ جہاں اپنی ذات کے لئے جلب منفعت اور استخدام و تسخیر موجودات کی طرف پیش قدمی کی دعوت انسان کے جذبہ فطرت کی آواز ہے وہاں تجاوز حدود سے اجتناب اور شرافت و دیانت کے ماتحت باہمی یگانگت و اتحاد و صلح و اشتی اور عدل و انصاف کے اصولوں سے تسک اس کی آزاد و صالح ضمیر کی آواز ہے جس کو خلاق عالم نے نوع انسانی کی فطرت و جبلت میں تفویض فرمادیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے: **فَاللَّهُمَّ هَآؤُنَا فُجُورًا هَآؤُنَا تَقْوٰیہَا** (اس نے انسان کو برائی اور تقویٰ کا الہام کر دیا ہے) اور انسان کے مدنی الطبع ہونے کا بھی یہی مطلب ہے۔

انفراد انسانی چونکہ قوت و ضعف میں یکساں نہیں اور جس طرح ان کی قوائے ظاہریہ میں تفاوت ہے۔ اسی طرح ان کے مشاعرہ باطنیہ دل و دماغ اور حس و شعور وغیرہ میں بھی معتد بہ فرق ہے فطری رجحان و جبلتی میلان میں چونکہ ایک دوسرے سے متحد ہیں لیکن ان کی ہر ہر قوت ظاہری و باطنی میں اپنے اپنے مقام پر نمایاں اختلاف ہے تو ہر مرحلہ پر جذبہ تسخیر و استخدام جہاں آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔ دہاں دوسرے کو اپنے راستہ سے ہٹانے کی بھی پیش کش کرتا ہے اور ذاتی شعور اور فطری احساس چونکہ سب میں ہے۔ لیکن اسباب حصول اور ذرائع وصول میں تفاوت ہے لہذا اپنا راستہ ہموار کرنے کے لئے دوسروں پر دست تعدی دراز کرنے اور اپنی طاقت کے بل بوتہ پر ضعیف و کمزور پر ظلم کرنے تک نوبت آجاتی ہے اور جائز و ناجائز کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ جذبہ ہوس کے پیش نظر دوسروں کے حقوق زندگی کو پامال کرتے ہوئے ان کے فطری استحقاق کو صرف نظر انداز نہیں بلکہ کچل کر رکھ دیا جاتا ہے۔ اگرچہ تمدن کا تقاضا یہ تھا کہ باہمی انس و محبت پر تعاون و اتحاد ہو اور رواداری و ہمدردی سے امن و اطمینان کا دور دورہ ہو اور یہی چیز نوع انسانی کا پہلا فطری جوہر

بلکہ اس کا طرہ امتیاز ہے۔ لیکن حرص و ہوس کے جذبات کا ابھار عدل و اعتدال کی اس شاہراہ سے انسان کو کوسوں دور لے جا کر اسے اختلاف و انتشار کا گردیدہ بناتے ہوئے باہمی دست و گریبان ہونے کی بھی پیش کش کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ سفاکی دے باکی اور درندگی و مہمیت بلکہ انسانیت کشی ہے۔

اختلاف کا علاج | كَانِ النَّاسُ اُمَّةً وَاحِدَةً۔ یعنی لوگ ایک امت تھے یعنی اصل فطرت کے لحاظ سے ان میں یگانگت و اتحاد تھا اور تمدن اُن کی عین جبلت تھا۔ لیکن ان کو اختلاف و انتشار

نے بے راہ روی اور امن سوزی کے تاریک گڑھے میں ڈال کر وحشت زدہ اور دہشت خورہ بنا دیا۔ لہذا خدائے حکیم نے انبیاء و رسل کو شریعت اور کتاب دے کر بھیجا جو اُن کے لئے ضابطہ زندگی اور شاہراہ امن و سکون ہو۔

بنظر ظاہر ان اختلافات کے قلع قمع کا جو علاج سوچا گیا ہے اس کے دو طریقے ہیں: ایک قانون اور دوسرا تعلیم و تربیت۔ اور اس کی مثال اس طرح ہے کہ جس طرح ایک قافلہ کسی مقصد کے حصول کے لئے کسی دور منزل کی طرف اپنے زاد راہ اور لوازم سفر کے ساتھ گامزن ہو۔ اور اثنائے طریق میں اُن کے مابین پھوٹ پڑ جائے کہ آپس میں ہتک عزت، لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت تک کی نوبت آجائے۔ پس ان ناگفتہ بہ حالات کا جائزہ لے کر ارباب حل و عقد یکجا ہو کر اپنے جان و مال کی خاطر کافی سوچ و بچار سے متفقہ طور پر ایک لائحہ عمل کی تشکیل دینا چاہیں تو امن و سلامتی کی بقا ان کو دو نظریوں میں معلوم ہوگی۔ مثلاً ایک جماعت کہے گی کہ قافلہ کے تمام افراد کی شخصی ملکیت کو ختم کر دیا جائے اور ان کی ہر شے پر ہر شخص کو تصرف کا حق دیا جائے کیونکہ سفر کا وقت پاس کرنا ہے جب سفر ختم ہوگا تو ہمیں ان چیزوں کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ لہذا اس انفرادی ملکیت کا کیا فائدہ ہے جو باہمی رفاقت کے لئے باعث خطرہ ہو۔ پس امن و آشتی کے قیام کی واحد صورت ہے اشتراکیت۔

اور دوسری جماعت کہے گی کہ نہیں! بلکہ ہر شخص کی ملکیت کو برقرار رکھتے ہوئے ایسا ضابطہ بنالیا جائے جس کی بنا پر کوئی انسان اپنی حدود معینہ سے باہر نہ جاسکے اور باہمی مہمردی اور رواداری کے اصول سے اس منزل سفر کو چین و آرام سے گزاریں

وجہ استبہاء | یہ دونوں طریقے اس نظریہ کے ماتحت ہیں کہ انسان کی زندگی صرف انہی دنیاوی چند لمحات میں منحصر ہے اور اس کے بعد کچھ نہیں اور یہ صرف جہالت اور نااندیشی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ درحقیقت

ان لوگوں نے انسانیت کی غرض خلقت سے چشم پوشی کر لی ہے کیونکہ صرف یہی چند روزہ زندگی انسان کی غرض خلقت نہیں۔ بلکہ اس فانی دنیا کے بعد انسان ایک غیر فانی منزل تک پہنچتا ہے اور اس منزل کی بود و باش اور آرام و امن اس چند روزہ حیاتِ فانیہ سے وابستہ ہے۔ انسان کو سمجھنا ہے کہ مجھے کس نے پیدا کیا۔ اور کیوں پیدا کیا اور میں نے کیا کرنا ہے؟ توحید سے چشم پوشی بلکہ کنارہ کشی ہی امنِ عالم کو جلا کر خاکستر کا ڈھیر بنانے کی ذمہ دار ہے۔ ہزار قانون بنائے جائیں لاکھ ضابطے تیار کئے جائیں لیکن حرص و ہوس جذباتِ شہویہ اور ہیجاناتِ نفسیہ جو رد اعتساف اور ظلم و استبداد کی ناخوشگوار فضا سے قطعاً

باہر نہ آنے دیں گے کیونکہ قہر و غضب سے کمزور طبقہ کو دبایا تو ضرور جائے گا۔ لیکن ان کی قلبی ہم آہنگی اور سچی دناواری کی تحصیل نہایت مشکل بلکہ محال ہے نیز قانونی شکنجہ کی سخت گرفت نچلے طبقہ میں اگر ظاہری طور پر مؤثر ثابت ہو بھی جائے لیکن اُوپر کا طبقہ اور بااقتدار گروہ اپنی بدعنوانیوں سے ہرگز باز نہیں آسکتا۔

ضرورتِ دین پس ان حالات کے پیش نظر جب تک یہ تصور نہ ہو کہ (ہمیں کوئی پوچھنے والا بھی ہے اور اس دنیا سے چلے جانے کے بعد ہمیں کہیں جو ابدہ بھی ہوتا ہے اور ہمارے لئے جہاں نیک کرداری کی جزا ہے وہاں بد اعمالی کی سزا بھی مقرر ہے) تو یقیناً تمدن میں اعتدال آ ہی نہیں سکتا۔ پس معلوم ہوا کہ ان تمام نزاعات و مشاجرات کا واحد علاج ہے دین۔ اور اسی مقصد کی تکمیل کے لئے خداوند حکیم نے انبیاء و رسل کو شریعت دے کر مبعوث فرمایا۔ جو انسانی پُر امن زندگی کے لئے مشرودہ جانفزا ہے۔ اور اُخروی پُر کیف زندگی بنانے کے لئے انتہائی طور پر کامیاب دستور العمل ہے پس توحید و عدل کا عقیدہ، نبوت و امامت کا اعتقاد اور قیامت کا یقینی تصور ہی انسان کو انسانیت کے صحیح معیار پر لانے کا کفیل ہے اور اسی نظریہ کو تسلیم کرنے اور اسی کے ماتحت وضع شدہ قوانین شرعیہ کی پابندی کرنے کا نام ہے دین۔ پس دین مادہ و طبیعت پرستوں کے قول کے مطابق صرف تقلید ہی تقلید کا نام نہیں بلکہ ایک ایسا ناقابل تردید اصولی و عقلی ضابطہ ہے جس سے کوئی صاحب عقل سلیم سر مو انکار کر ہی نہیں سکتا۔ بشرطیکہ اولاد انسان سے ہو۔ البتہ بندروں کی اولاد ایسے اگر تقلید سے تعبیر کرے تو ان سے بعید بھی نہیں۔ بہر کیف قیامت کا یقین غماصہ کا خوف اور جزا و سزا کا تصور ہی ہر قسم کی غلط کاریوں کا علاج اور دنیوی و اُخروی فلاح کا ضامن ہو سکتا ہے۔

نتیجہ معاشی پہلو میں جو کچھ اختلاف ہوتا ہے وہ صرف ان ہی دو فطری تقاضوں کی نبرد آزمائی کی ہی بدولت ہے یعنی تمدن اور استحزام و تسخیر موجودات اور اس اختلاف کا حل واحد ہے بعثتِ انبیاء۔

سوال :- دو فطری تقاضے جب آپس میں متضاد ہیں تو خالق حکیم نے انسان کو تفویض کرنے میں کیا مصلحت رکھی ہے؟

جواب :- دو فطری تقاضوں کا تضاد باعثِ عیب اور خلافِ حکمت ہوا کرتا ہے جب کہ ان کے اُوپر کوئی سلطان نہ ہو۔ لیکن جب یہ دونوں ایک حاکم بالا کے زیرِ نگیں قرار دیئے جائیں تو اس میں کوئی قباحت نہیں اور اس کی مثالیں بہت سی مل سکتی ہیں؟

وجودِ انسان میں جو قوتیں موجود ہیں وہ اپنے اپنے مقام پر فطری حقوق رکھتی ہیں۔ لیکن ان کے تعارف سے باہمی نزاع تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ جس کو بیماری کہا جاتا ہے۔ مثلاً قوتِ جاذبہ کا فطری حق ہے کہ غذا طلب کرے اور قوتِ ہاضمہ کی فطری ڈیوٹی ہے کہ اس کو ہضم کر کے جزو بدن بننے کے اہل کرے لیکن قوتِ جاذبہ جب بے اعتدالی سے کام لیتے ہوئے حد سے بڑھ جائے تو قوتِ ہاضمہ سے اس کا ٹکراؤ ہو جائے گا۔ یا قوتِ جاذبہ موذی غذا حاصل کرے اور قوتِ ہاضمہ اس کو ہضم کر کے جزویتِ بدن کی حد تک پہنچا دے تو دیگر قوائے باطنیہ اس سے بُری طرح متاثر ہوں گی۔ اور نتیجہ میں نظامِ بدن

خراب ہو جائے گا۔ اسی طرح زبان کا فطری حق ہے بولنا۔ لیکن اگر اعتدال سے بڑھ جاتے تو نتیجہ ہوگا شر و فساد اسی طرح باقی اعضاء کی بعینہ یہی حالت ہے۔ پس ان قوتوں کو اپنے اپنے مقام پر حق فطری کے استعمال کی اجازت ہے لیکن بجز اعتدال اور چونکہ یہ خود ان حدود کو سمجھنے سے قاصر ہیں تو خدا نے اپنی حکمت کا ملہ سے ان کے رفع تراجم اور دفع تباہی کے لئے ایک سلطان و حاکم بالا اپنی طرف سے معین فرمایا۔ جس کو لسان شرع میں رسول باطنی سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اور وہ ہے عقل۔ اور خداوند کریم نے اس رسول (عقل) کو ایک حد تک مصالح و مفاسد معلوم کرنے کی طاقت دی ہے۔ پس بدنی طاقتوں کا کام ہے اپنی ذمہ داریوں کو نبھانا اور عقل کا فریضہ ہے ان کو بے اعتدالیوں سے روکنا۔ اور جب تک عقل کی یہ رعایا اپنے سلطان (عقل) کے زیر حکم عمل پیرا رہے گی تو اس میں امن و سلامتی اور صلح و آشتی رہے گی۔ جس کے نتیجہ میں نظام بدن درست رہے گا۔ اور ساری رعایا کو خوش حالی نصیب ہوگی۔ لیکن جب ہی اس رعایا میں سے کسی فرد نے اپنے حاکم یعنی عقل کے سامنے علم بغاوت بلند کیا۔ اور بے راہ روی اختیار کی تو اس کا وبال صرف اسی تک محدود نہ رہے گا۔ بلکہ پوری مملکت بدن کی تباہی کے لئے پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

پس اسی طرح نوع انسانی کو خدا نے ایک طرف فطری طور پر حق تمدن عطا فرمایا اور دوسری طرف حق استخدام موجودات مرحمت کیا۔ اور اعتدال و توازن قائم کرنے کے لئے رسولوں کو ان پر مسلط فرمایا۔ جن کو انسانی ضابطہ حیات بطور وحی و الہام و کتاب و شریعت تفویض فرمایا۔ تاکہ ہر ایک اپنی اپنی حدود کے اندر رہ کر دنیوی و اخروی فلاح و بہبود کی طرف اقدام کرے۔ اور عالم میں امن و سکون اور آرام و اطمینان قائم ہو۔ پس جب تک نوع انسانی اس نظام کے ماتحت رسولوں کی ہدایت کو مد نظر رکھتے ہوئے اعتدال میں رہے گی تو نتیجہ خوشگوار ہوگا۔ لیکن بخلاف اس کے اگر انسانی افراد کُل یا بعض حکومت الہیہ سے بغاوت کریں گے تو امن عالم تباہ ہو کر رہ جائے گا۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکے گی کہ ایک طرف تو انسان کا قتل **مصلحت جہاد** گناہ عظیم ہے اور دوسری طرف خدا کی طرف سے جہاد کا حکم دجوبی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں انسانی موت کو فردانی دی جاتی ہے تو مثال گذشتہ اس سوال کو حل کرنے کے لئے کافی ہے کہ بدن کی حفاظت کے لئے ایک یا دو فاسد اور باغی عضوں کو بدن سے الگ کر دینا عقل کا اہل فیصلہ ہے جو انتہائی طور پر قابل قبول ہے۔ کیونکہ جزدی مفاد کو کلی مفاد پر قربان کرنا بہتر ہے اس سے کہ کلی مفاد کو جزدی مفاد کی بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ البتہ یہ فرد ہی ہے کہ پہلے بقضائے عقل فاسد حصوں کی ہمہ تن کوشش سے اصلاح کی جائے اور حتیٰ الوسع ہر ممکن علاج سے اس کو رو بصحت لانے کی سعی بلیغ کی جائے لیکن جب علاج سے مایوسی ہو اور اس کا رو بصحت لانا ناممکن ہو اور باقی بدن کی اصلاح و بقا اس فاسد حصہ کے معدوم کرنے میں ہو تو بلا دریل اس کو کائنات بدن سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا جانا عین دانائی ہے۔

پس اسی طرح نظام عالم کی بقاء کے لئے جن جن اصول و عقائد اور تدبیر و اعمال کے ضابطہ کی تردید پر رسولؐ مامور ہیں اگر بعض افراد اپنے مفسدانہ رویے پر قائم رہیں اور اس ضابطہ کو تسلیم نہ کریں تو پہلے ہر ممکن طریقہ سے ان کو سمجھانا ضروری ہے اور بصورتِ ضد و مہذب و حرمی ان کا صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دینا عین مصلحت اور قرین عقل ہے۔ کیونکہ امن افراد پر امن عالم کو ہرگز قربان نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ بقائے عالم پر بقائے افراد کو قربان کیا جاسکتا ہے۔

دینی اختلاف | كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً ۖ مَقْصِدُ يَهُوَا هُوَ لَوْ كُنَّا نَعْلَمُ مَا كَانَتْ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ فطری تمدن اور صلح و اشتیاق کی زندگی کے ذاتی کشمکش ان کو تفرق و تشقت کی وادی میں ڈال کر آپس میں دست و گریباں کر رہی تھی۔ پس اس مفسدہ کے قطع کے لئے اور اعتدال و امن کی برقراری کے لئے خدا نے رسول بھیجے۔ پس آیت کا مقصد یہ ہوا کہ لوگ ایک امت تھے۔ یعنی ان میں فطری یگانگت تھی۔ لیکن تبشیر ظاہری اور مفاد زندگی کے حصول کی خاطر بے اعتدالیوں کی وجہ سے ان میں نظریاتی اختلافات رونما ہوئے تو خدا نے ان کی اصلاح کے لئے کتاب و شریعت دے کر رسول بھیجے جو اطاعت گذاروں کو مژدہ جنت اور سرکشوں کو عذابِ خداوندی میں گرفتاری کی خبریں سنائیں اور لوگوں کے باہمی اختلافات کو ہر ممکن کوشش سے ختم کریں۔ لیکن ان کے بعد فرماتا ہے کہ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ إِلَّا الَّذِي نَفْسُ أَوْتُوهُ۔ یعنی اختلاف ہی ان لوگوں نے کیا جن کو کتاب دی گئی۔ لہذا اس کے کہ ان کے پاس واضح دلائل و براہین پہنچ چکیں اور یہ اختلاف صرف ازراہ بغاوت ہی تھا۔

پہلا اتحاد، اتحاد فطری تھا اور اس پر متفرع اختلاف بھی اختلاف فطری تھا جس کا تعلق معاشی پہلو سے تھا اور اس کو رفع کرنے کے لئے انبیاء کی بعثت ہوئی۔ اب یہ اختلاف، اختلاف فطری نہیں بلکہ ازراہ بغاوت و عناد ہے۔ جو بعثتِ انبیاء کے بعد امتوں میں رونما ہوا۔ وہ اختلاف معاشیات میں بے راہ روی کا نتیجہ تھا اور یہ اختلاف دینیات میں بے جا تصرفات سے ظاہر ہوا۔ کیونکہ فرماتا ہے کہ اس اختلاف کی ذمہ داری اُن افراد پر عائد ہوتی ہے جن کو کتاب دی گئی۔ پہلی قسم کا اختلاف فطرت کا تقاضا تھا۔ لہذا اس کے لئے خالق فطرت نے انبیاء و رسل کا انتظام فرمایا۔ لیکن دوسرا اختلاف چونکہ صرف عناد و سرکشی کی پیداوار تھا۔ لہذا اس کا علاج افہام و تفہیم یا ڈانٹ ڈپٹ یا عذابِ اخروی کی وعید سے کافی سمجھا گیا۔

ضرورتِ نبی

گذشتہ بیان سے واضح کر دیا جا چکا ہے کہ انسان طبعی و فطری طور پر استخدا م و تسخیر موجودات کا حق رکھتا ہے اور اس کی بدولت انسان کی معاشی زندگی میں اختلاف و فساد کی بنیاد پڑتی ہے لہذا اجتماعی زندگی اور تمدنی بقاء کے لئے قوانین کی ضرورت

ہے۔ جن کی پابندی انسان کو اپنے کمال و سعادت پر فائز کر سکے۔ پس ایسے قوانین کی تشکیل یا تو خود فطرت ہی کرے گی یا کوئی ایسی ذات کرے گی جو فطرت کے تقاضوں کو جاننے والی اور اس کی تمام تر صلاحیتوں پر نگاہ رکھنے والی ہو۔ تو ظاہر ہے کہ فطرت جو خود منبع ہے ان تمام اختلافات کا وہ رفع اختلاف کا زینہ نہیں ہو سکتی۔ لہذا فطرت انسانی کے علاوہ ہی وہ ذات ہونی چاہیے جو اصلاح انسانیت کے لئے قوانین مرتب کرے تو وہ سوائے خالق کائنات کے اور کوئی ہو نہیں سکتا۔ پس ضروری ہے کہ خدا اپنے انتخاب سے ایسے افراد کو اصلاح خلق کے لئے مامور فرمائے جن کو ان قوانین کا پوری طرح علم دیا گیا ہو۔ اور وہ ان قوانین کے نفاذ میں بلا لومہ لائیم اپنی خدمات پیش کرتے والے ہوں۔ پس نبوت وہ عہدہ جلیلہ ہے جو خدا اصلاح خلق کے لئے کسی اپنے خاص بندے کو عطا فرماتا ہے۔ اور اس سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہے کہ جس کو خدا یہ عہدہ جلیلہ عنایت فرمائے گا وہ خود اس قسم کی بے اعتدالیوں سے پاک و منزہ ہوگا۔ جن کی اصلاح کے لئے وہ مبعوث ہوا ہے۔ ورنہ اگر اس عہدہ پر فائز ہونے والا بھی عام لوگوں کی طرح جو رد اعتساف سے کام لینے والا ہو۔ تو اس کی اصلاح کے لئے کسی دوسرے مصلح کی ضرورت ہوگی اور اگر وہ بھی ویسا ہو تو پھر اس کے لئے کسی تیسرے کی ضرورت ہوگی اور یہ سلسلہ ختم نہ ہوگا۔ اور اسی کو تسلسل کہتے ہیں جو کہ اتفاقاً محال ہے نیز اگر تفسیر سادہ خدا خود امت کی غلط کاریوں سے ملوث ہو تو اس کے موعظہ کا عامۃ الناس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ لہذا اس کی بعثت خالی از فائدہ ہوگی۔ نیز ایک غلط کار انسان پر اصلاحی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالنا کسی عام عاقل انسان سے بعید از قیاس ہے۔ چہ جائیکہ خداوند حکیم ایسے فعل کا ارتکاب کرے۔ کیونکہ نہ سدھرے ہوئے کو دوسروں کے سدھارنے پر مامور کرنا و قار علم و حکمت ذات اقدس الہی پر ایک ایسا بدنما دھبہ ہے جو چہرہ توحید و دامن عدل کو شکوک و شبہات کی بے پناہ تاریکی و سیاہی میں پوشیدہ کرنے کے لئے کافی ہے پس ثابت ہوا کہ اصلاح خلق کے لئے خداوند عدل و حکیم کی طرف سے ایسے افراد مامور بہ تبلیغ ہوں۔ جن کا دامن ہر قسم کی غلط کاریوں سے پاک و منزہ ہو۔ بلکہ جس رستہ پر چلنے کی دعوت دینے کے لئے مامور ہوں وہ خود اس پر اس طرح گامزن ہوں کہ اس راستہ پر ان کی امت میں سے ان سے سابق کوئی نہ ہو۔ اور اسی کو عصمت کے مقدس نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ہم نے مقدمہ تفسیر انوار النجف میں ایک مستقل باب کے ذیل میں اس مسئلہ کو تفصیل سے لکھا ہے۔ نیز اس بحث کی تفصیل کیلئے ہماری کتاب 'اسلامی سیاست' کا مطالعہ ضروری ہے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ

کیا تم نے گمان کیا ہے کہ داخل ہو جاؤ گے جنت میں اور نہ آئے گی تم پر آزمائش، مثل ان لوگوں کے جو تم سے پہلے گزرے

مَسْتَهْمِلُوا الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى

چکے ہیں جن کو مس کیا سختی اور تکلیف نے۔ اور ان کو جھنجھڑا گیا حتیٰ کہ پکار اٹھے رسول اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے

نَصْرُ اللَّهِ إِلَّا إِنْ نَصَرَ اللَّهُ قَرِيبٌ ﴿۱۴﴾ يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ هُتْلُ مَا

کرب آئے گی اللہ کی مدد؟ آگاہ ہو تحقیق اللہ کی مدد قریب ہے آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ فرمادیجئے

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنَّ شَانِ تَزُولُ ۚ بَعْضُ لَوْ كَہْتُمْ ہیں کہ جنگ خندق کے موقع پر اور بعض کہتے ہیں کہ جنگ احد کے موقع پر نازل ہوئی جبکہ مومنین شدت اور تکلیف سے گھبرا گئے تھے خدا نے اُن کو یہ آیت بھیج کر تسلی دی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ مہاجرین جب اپنا وطن ترک کر کے مصائب جھیل کو مدینہ میں وارد ہوئے تو اُن کی تسلی کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔

جناب رسالت کا ارشاد ہے: حَقَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحَقَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ۔ یعنی جنت مصائب میں گھری ہوئی ہے اور دوزخ شہوات کے اندر محصور ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جنت میں پہنچنے کے لئے مصائب کو جھیلنا پڑتا ہے اور شہوات کی اتباع جہنم تک پہنچاتی ہے۔ تفسیر عمدة البیان میں ہے کہ دہب بن منبہ سے مروی ہے کہ میں نے بعض حواریین کی کتاب میں لکھا ہوا دیکھا ہے۔ اے فرزند آدم جب خدا تجھے مصائب میں مبتلا کرے تو غور ہو کیونکہ یہ طریقہ انبیاء و اولیاء کا ہے اور جس وقت تجھے آسودگی و خوشحالی حاصل ہو تو غور نہ ہو کیونکہ تیرے ساتھ وہ سلوک کیا گیا جو انبیاء و اولیاء کے ساتھ نہیں کیا گیا تھا اور جناب رسالت سے مروی ہے کہ جنت میں بعض درجات ایسے ہیں جو نیک اعمالوں سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ بلکہ وہ مصائب و آلام میں صبر کرنے والوں کے لئے ہیں۔ یہاں تک کہ انسان جب اُن مراتب کو دیکھے گا تو کہے گا کہ کاش دنیا میں میرا جسم مقراض سے ریزہ ریزہ کیا جاتا تاکہ مجھے یہ درجات نصیب ہوتے۔ بہر کیف مصائب و آلام پر صبر کرنے کے درجات زیادہ ہیں۔ خداوند کریم تمام مومنین کو آئمہ طاہرین علیہم السلام کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور مصائب پر صبر کی طاقت عنایت کرے۔

اللَّهُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ الصَّابِرِينَ وَاجْشُرْنَا فِي مَسْرَقَةِ الصَّابِرِينَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّاهِرِينَ۔

جو بھی خرچ کرو۔ غیر سے پس والدین اور قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔

اور جو بھی نیکی کرو پس تحقیق اللہ اس کو جانتا ہے

وہ ناپسند ہے تم کو اور ہو سکتا ہے کہ تم ناپسند کرو ایک چیز کو اور (درحقیقت) وہ تمہارے لئے اچھی ہو اور ہو سکتا ہے کہ

تم جیسا کہ ایک شے کو اور (درحقیقت) وہ بُری ہو تمہارے لئے اور خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

مَا أَنْفَقْتُمْ : بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ زکوٰۃ کا حکم ہے۔ لیکن زکوٰۃ کا مصرف چونکہ والدین نہیں ہوا کرتے لہذا اس کو صدقات واجبہ و مستحبہ سے عام قرار دیا جائے تو بہتر ہے کیونکہ اولاد پر والدین کا نفقہ واجب ہوا کرتا ہے جب وہ احتیاج رکھتے ہوں۔ حالانکہ زکوٰۃ انہیں لے سکتے اور علامہ طبرسی نے اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

وَهُوَ شَرُّكُمْ ۖ۔ دنیاوی بُرائی یہ ہے کہ فقر و فاقہ کی ذلت کے علاوہ ہمیشہ کھار سے سہمے رہنا بدترین زندگی ہے اور آخری خسارہ یہ ہے کہ نعماتِ آخرت سے ان کو قطعاً محروم کیا جائے گا

مسئلہ: جہاد واجب کفائی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر سارے مسلمان ترک کر دیں تو سب گنہگار ہوں گے اور اگر اس قدر مسلمان مصروف جہاد ہو جائیں جو دشمن کے مقابلہ کے لئے کافی ہوں تو باقیوں سے وجوب ساقط ہے بشرطیکہ امام وقت کا خصوصی حکم کسی فرد کے لئے صادر نہ ہو ورنہ اس فرد پر جہاد واجب عینی ہو جائے گا۔

سوال و جواب

یہ آیت بتلاتی ہے کہ مومنین پر حکم جہاد گراں تھا اور وہ دل سے اس کو نہ چاہتے تھے حالانکہ دوسرے مقام پر مومنین کی جو مدح ثناء کی گئی ہے اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ مومنین راہِ خدا میں جان و مال بلکہ ہر قسم کی قربانی سے دریغ نہ کرتے ہونگے جیسا کہ تاریخ کے صفحات اس امر کے شاہد ہیں اور اس کے تین جواب دیئے گئے ہیں۔

(۱) مومنین کے دو گروہ تھے۔ ایک وہ جو اپنے ایمان میں صادق تھے اور اسلام کی حقانیت و صداقت ان کی دلوں کی گہرائیوں میں اتری ہوئی تھی وہ خدا و رسولؐ کے ہر حکم پر مٹنے والے تھے اور قرآن مجید میں جہاں جہاں مومنین کی دقیق الفاظ میں مدح کی گئی ہے اس سے مراد یہی طبقہ ہے اور دوسرے وہ تھے جو ظاہر طور پر دعویٰ ایمان کرتے تھے۔ لیکن اُن کی زبان پر کلمہ حق کا جاری ہونا ان کی دل کی آواز نہیں تھا۔ اور اکثر مقامات پر ایسوں کی قدر بھی کی گئی ہے اور ان کو عتابانہ خطاب سے بھی مخاطب کیا گیا ہے چنانچہ جنگِ اُحد بدر، خندق کی آیات اس کی گواہ ہیں۔ پس یہاں بھی جن کی طرف جہاد کی کراہت منسوب ہے وہ یہی گروہ ہے۔ (۲) ابتداء اسلام میں چونکہ مسلمانوں کی تعداد کم تھی اسلام جنگ بھی ناکافی تھا اور کفار میں جنگی اسلحہ اور باقی فوجی طاقت کی کمی نہ تھی۔ لہذا اسلام کا حلقہ بگوش طبقہ دل سے اس امر کا خواہاں تھا کہ جنگ کو مؤخر کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کا حلقہ وسیع ہو جائے اور فوجی قوت دشمن کے مقابلہ میں درجہ کمال کو پہنچ جائے تاکہ مقابلہ کے بعد ناکامی کی رسوائی سے دوچار نہ ہونا پڑے پس ان کا اس وقت جنگ کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھنا اسلام کی سر بلندی کے لئے تھا تو خداوند کریم چونکہ انجام سے دانابینا ہے اُس نے ان کے اس نظریہ کی تردید اس لہجہ میں فرمائی کہ مجھے انجام معلوم ہے اور تمہیں معلوم نہیں اور گویا جس چیز کو تم ناپسند کر رہے ہو یعنی فوری جہاد اسی میں تمہاری مصلحتی کار از مضمر ہے۔

(۳) مومنین جہاد کے حکم کو بزدلی کی بنا پر ناپسند نہیں کرتے تھے بلکہ ان کو وسعت اسلام محبوب تھی وہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسا طریقہ نکل آئے کہ بجائے قتل و غارت کے ان کفار کو اپنے ساتھ بلالیا جائے تو نفوسِ انسانیہ ہلاکت سے بچ جائیں گے۔ اور دوسری طرف اسلام کے دائرہ میں وسعت ہو جائے گی۔ پس خداوند کریم نے ان کو اس طرح سے رو فرمایا کہ میں چونکہ رازِ کائنات سے واقف ہوں اور تمہیں پتہ نہیں ہے تم خواہ کتنی ہی کوششیں کرو خاکِ نامدہ نہ ہو گا۔ کیونکہ وہ حسد و عناد کی بنا پر اسلام کے حلقہ بگوش ہرگز نہ ہوں گے اور ہٹ دھرمی کو کسی قیمت پر نہ چھوڑیں گے اور دریں حالات چونکہ ان کا تخریبی پہلو نوعِ انسانی کے لئے دباںِ زندگی ہے اور امنِ عامہ کے لئے پیغامِ موت ہے لہذا افراد کو نوع پر قربان کرنا اس سے بہتر ہے کہ افراد کی خاطر نوعِ انسانی کو خطرہ میں ڈال دیا جائے ان کی مثال بدنِ انسانی کے اس عضوِ فاسد کی سی ہے جس میں کوئی علاج کارگر نہ ہو۔ اور بدن کی سلامتی کا دار و مدار اس کے کاٹ دینے میں ہو۔ لہذا ان سے ایمان کی توقع رکھنا اور اصلاح کی امید کرنا فضول ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدُّ

آپ سے دریافت کرتے ہیں حرمت والے مہینے میں لڑائی کے بارے میں۔ فرمادیجئے کہ اس میں لڑائی بڑا گناہ کبیرہ ہے اور اللہ کی

عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرُ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ

راہ سے روکنا اور اس سے کفر کرنا اور مسجد الحرام سے روکنا اور اس کے اہل کو وہاں سے نکال

أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُونَ يَقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى

دینا گناہ اکبر ہے اللہ کے نزدیک اور فتنہ (کفر) بہت بڑا گناہ ہے قتل سے ہمیشہ (اہل مکہ) تم سے برسرِ پیکار رہیں گے یہاں تک

يُرَدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ

کہ تمہیں پلٹا دیں تمہارے دین سے اگر ان کے بس میں ہو اور جو شخص مرتد ہو جائے تم میں سے اپنے

دِينِهِ فِيمَتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

دین سے۔ پس وہ مرجائے حالت کفر میں تو پس ایسے لوگوں کے اعمال منافع ہو گئے دنیا اور آخرت میں

وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۱۲۴﴾

اور وہ لوگ اصحابِ جہنم ہیں درحالیہ کہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

بلکہ اُن کے وجود کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا ہی اسلام کی سر بلندی اور دینِ خدا کی سرسرازی کا موجب ہے پس چونکہ وہ جہاد سے

گریزاں اور صلح کے خواہاں تھے تو خدا نے اُن کے ہر دو نظریوں کی اپنے علم اور اُن کی بے علمی کے حوالہ سے تردید فرمادی۔ اور

اسی حکمت کے پیش نظر لفظ عَسَى کا تکرار بھی فرمایا ہے۔

رکوع ۱۱

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدُّ

دنواح میں سریتے (چھوٹے لشکر) روانہ فرمائے۔ چنانچہ ایک سریتہ جو اسی آدمیوں پر مشتمل تھا۔ عبد اللہ بن جحش کی زیر قیادت (جو کہ)

آپ کا چھوٹی زاد تھا، مقام نخلہ کی طرف روانہ فرمایا (اور یہ جنگ بدر سے دو ماہ قبل ہجرت کے بعد تیرہویں ماہ کا واقعہ ہے) تاکہ طائفت

سے کئے والے قافلہ قریش کی سرکوبی کریں اور اُن کا مال بطور غنیمت قبضہ میں لیں۔ قریش کا جو قافلہ طائف سے آ رہا تھا اُن کا سرکردہ عمرو بن عبد اللہ حضرمی تھا۔ جو عقبہ بن ربیعہ کا ہم قسم تھا اور ماہ جمادی الاخری کے آخری دن ان ہر دو قافلوں کا آپس میں تصادم ہوا اور درحقیقت یہ دن رجب کا پہلا دن تھا۔ لیکن مسلمان اس کو جمادی الاخری کا آخری دن سمجھے ہوئے تھے۔ عمرو بن عبد اللہ حضرمی مارا گیا اور مسلمانوں نے اُن کا تمام مال و اسباب لوٹ لیا اور مدینہ واپس آ گئے۔ کفار نے طعن و تشنیع شروع کی کہ مسلمانوں نے حرمت والے مہینے (ماہ رجب) میں جنگ کو حلال کر دیا ہے۔ چنانچہ جناب رسالت مآب نے عبد اللہ بن جحش سے ماجرہ پوچھا۔ تو اس نے عرض کی حضور! ہم نے جمادی الاخری کی آخری تاریخ سمجھ کر ایسا کیا ہے۔ بہر کیف حضور نے وہ لوٹا ہوا مال و اسباب واپس کر دیا۔ اس کے بعد صحابہ نے ماہ حرام میں جنگ کرنے کے متعلق آپ سے دریافت کیا۔ نیز کفار قریش کا ایک خط بھی آنحضور کے پاس پہنچا تو خداوند کریم نے یہ آیت بھیجی کہ بے شک حرمت والے مہینے میں جنگ کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ لیکن اللہ کی راہ سے روکنا اور کفر کرنا اور مسجد الحرام سے روکنا اور وہاں سے اس کے اہل کو نکال دینا (جس طرح اہل مکہ نے مسلمانوں کے ساتھ کیا) یہ چیزیں گناہ اکبر ہیں اور شرک کا گناہ قتل کے گناہ سے بہت زیادہ ہے۔

مَنْ يَتَذَكَّرْ فَإِنَّهُ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ۔ مرتد کے اعمال سابقہ کے نتائج ہونے کے متعلق جہانگیر اس آیت مجیدہ سے ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ ارتداد پر اس کی موت آ جائے۔ ورنہ اگر ارتداد کے بعد مرنے سے پہلے توبہ کر لے اور اپنے سابق کئے پر نادم ہو جائے تو مفہوم آیت سے یہی مستفاد ہوتا ہے کہ اس کی توبہ مقبول ہے اور اس کو اپنے اعمال صالحہ کا بدلہ دیا جائے گا۔ گویا ارتداد سابقہ اعمال کی موت ہے اور توبہ ان کو دوبارہ زندہ کر دیتی ہے۔ یہی تو کہا جاتا ہے کہ مرتد پر اپنے زمانہ ارتداد میں فوت شدہ عبادات کی قضا بھی واجب ہے۔ جس طرح کہ ظاہری حکومتوں میں حکومت کے باغی انفرادی گذشتہ تمام خدمات کو کالیم قرار دیا جاتا ہے اور اسے گردن زدنی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ نادم ہو کر آئندہ کے لئے حکومت سے وفاداری کا عہد کر لے تو اس کی تن بخشی ہو جایا کرتی ہے۔ بشرطیکہ حکومت کو اس کے عہد و پیمان پر اطمینان بھی ہو جائے۔ اسی طرح حکومت الہیہ جو اساس عدل اور معیار انصاف پر مبنی ہے اس کے باغی کی تمام تہنکیوں پر قلم نسخ پھیر دیا جاتا ہے۔ لیکن جب توبہ کر لے اور بدل و جان اپنے خالق سے طالب عفو ہو جائے تو بقائے عدل و انصاف اور مقتضائے کرم و جود اس کی توبہ کے لئے دامن عفو خداوندی میں گنجائش ہے تو پس اس کے اعمال قابل جزا ہوں گے۔ بشرطیکہ خاتمہ ایمان پر ہو جائے۔

مرتد کی قسمیں | علمائے مرتد کی دو قسمیں کی ہیں ۱۔ مرتد فطری ۲۔ مرتد بتی۔ مرتد بتی وہ ہے جو کافر والدین کے گھر پیدا ہو کر بعد میں با اختیار خود دائرہ اسلام میں داخل ہو اور پھر دوبارہ کفر کی طرف پلٹ جائے۔ مرتد فطری اس کو کہتے ہیں جو مسلمان والدین کو ہاں پیدا ہوا ہو یا اس کے ماں باپ میں سے کوئی ایک اس کے انعقاد و نطفہ کے وقت مسلمان ہو لیکن بعد میں وہ عقیدہ چھوڑ کر کفر میں داخل ہو جائے۔

مسئلہ ۲۔ مرتد بتی کا حکم یہ ہے کہ اس سے توبہ طلب کی جائے اور اس کی توبہ ظاہری اور اخروی ہر دو لحاظ سے قابل

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ

تحقیق وہ لوگ جو ایمان لائے اور وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا راہِ حق میں وہ لوگ

يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢١٨﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْمِرِ

امیدوار ہیں رحمتِ خدا کے اور خدا غفورٌ رحیم ہے آپ سے دریافت کرتے ہیں شراب اور جوئے کی متعلق

قُلْ فِيهِمَا أَثَمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا

فرمادیجئے کہ ان میں گناہ کبیرہ بھی ہے اور نفع بھی ہے لوگوں کیلئے اور گناہ اُن کا اُن کے نفع کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ

اور آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ تو فرمادیجئے کہ بچت اس طرح بیان فرماتا ہے خدا تمہارے

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢١٩﴾

لئے آیات کو۔ تاکہ تم سوچو

قبول ہے دنیاوی لحاظ سے اس کی توبہ کے قبول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مقدارِ زمانِ عَدَّت کے اندر اس کی عورت اس کو واپس مل جائے گی اس کی جائیداد تقسیم نہ ہوگی اور اس سے قتل کا حکم برطرف کر دیا جائے گا اور اُخروی لحاظ سے توبہ قبول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُخروی جزا کا بھی حقدار رہے گا۔ لیکن اگر اس عرصہ کے اندر توبہ نہ کی تو واجب القتل قرار دیا جائیگا اس کی عورت اس سے آزاد اور اس کا مال ورثہ میں تقسیم کیا جائے گا۔

مسئلہ:۔ مرتد فطری کی ظاہری طور پر توبہ قبول نہیں بلکہ مرتد ہوتے ہی اس کی عورت اس سے بائن اور اس کا مال ورثہ میں تقسیم ہو جائے گا۔ اور اگر حکومت شرعی ہو تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ البتہ اُخروی طور پر اگر صدقِ دل سے توبہ کرے تو بعید نہیں کہ رحمتِ خداوندی اس کو اپنے سایہ میں لے لے اور عذابِ آخرت اس سے برطرف کر دے۔

شراب و جوئے کی حرمت کا بیان

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا هُمْ أَجْرٌ يُؤْتُونَ لَكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ ﴿٢٢٠﴾ وَلَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ ﴿٢٢١﴾ وَلَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ ﴿٢٢٢﴾

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ہ۔ جو لوگ ایمان لائے اور مہاجر بھی ہوئے اور مجاہد بھی رہے ان کے اللہ کے نزدیک بلند درجات ہیں اور وہ جنتی ہیں۔ لیکن بشرطیکہ اُن کا خاتمہ بھی ایمان پر ہو جائے۔

خدا نے حرام کیا ہے پس مہدی عباسی نے سنتے ہی علی بن یقطین سے متوجہ ہو کر کہا: ہٰذِیْہِ فَتْوٰی ہَا شِیْئَۃٌ (یہ ہاشمی فتوے ہیں)

مجمع البیان میں ہے کہ رسول خدا نے فرمایا کہ شراب کے بارے میں خداوند کریم نے دس آدمیوں کو ملعون قرار دیا ہے (۱) خریدنے والے کو (۲) اس کو جس کے لئے خریدیا جائے (۳) پھڑپھڑانے والے کو اور جس کے لئے پھڑپھڑایا جائے (۴) پلانے والے کو (۵) پینے والے کو (۶) اٹھانے والے کو (۷) اور جس کی طرف اٹھا کر لے جائے (۸) اور بیچنے والے کو (۹) کاشت کرنے والے کو۔

ایک اور روایت میں آپ نے فرمایا کہ شراب پینے والا مثل مبت پوجنے والے کے ہے اور منقول ہے کہ جناب رسالت اکبر نے فرمایا کہ میری امت میں دس قسم کے لوگ ایمان کا دعوے کرتے ہیں حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔ (۱) تارک نماز (۲) تارک زکوٰۃ (۳) سود خور (۴) زانی (۵) شرابی (۶) چغل خور (۷) فتنہ باز (۸) گمہ کرنے والا (۹) ہمسایوں کو دکھ دینے والا (۱۰) ظالموں سے تعلق قائم کرنے والا تاکہ کسی کو مصیبت میں پھنسائے۔

المیسر: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ نرد اور شطرنج، میسر کی قسمیں ہیں اور جناب رسالت اکبر سے میسر کا معنی پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ہر وہ شے جس میں جیت ہار کا مقابلہ ہو پس وہ جوا ہے۔ جی کہ گوٹیاں اور اخروٹوں سے کھیلنا بھی جوا بازی میں داخل ہے۔ رتاش بازی جس کا ہمارے ملک میں عام رواج ہے۔ یہ بھی اسی قسم میں داخل ہے۔

اور امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: کہ شطرنج کا بیچنا، اس کی قیمت کا کھانا حرام ہے۔ اس کا خریدنا کفر ہے اس کے ساتھ کھیلنا شرک ہے اور اس کو ہاتھ لگانا ایسا ہے جس طرح سور کے گوشت کو ہاتھ لگایا جائے۔ لہذا جس طرح سور کے گوشت کو ہاتھ لگانے کے بعد بغیر دھونے کے نماز نہیں ادا کی جاسکتی۔ اسی طرح شطرنج کو ہاتھ لگانے کے بعد بھی بغیر ہاتھ دھونے نماز نہیں ہو سکتی اور شطرنج کی طرف نظر کرنا ایسا ہے جس طرح اپنی ماں کی شرمگاہ کی طرف نظر کرنا۔ شطرنج کھیلنے والے پر سلام کہنا گناہ ہے اور شطرنج کھیلنے والوں کے پاس بیٹھنا دوزخ میں لے جاتا ہے۔ (حدیثوں میں شطرنج کا نام بطور مثال کے ہے ورنہ تمام اُن چیزوں کا بھی حکم ہے جو میسر کے حکم میں داخل ہیں۔ جیسے گوٹیاں کھیلنا اور اخروٹ بازی اور تاش وغیرہ) خداوند کریم تمام مومنین کو ان روحانی امراض سے محفوظ رکھے۔

قُلِ الْعَفْوَ: عفو کا معنی ہے جو اپنے اور بال بچوں کے اخراجات سے بچ جائے۔ یا اس کا معنی ہے درمیانہ، یعنی نہ اسراف نہ بخل۔ احادیث اہلبیت میں دونوں معنی وارد ہوئے ہیں۔

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ ۖ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَإِنْ

دنیا و آخرت کے متعلق اور آپ سے دریافت کرتے ہیں یتیم بچوں کے متعلق فرما دیجئے کہ اصلاح ان کے مال کی

تَحَالُطُهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ ۖ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ

اچھی ہے اور اگر تم ان کو اپنے ساتھ ملا لو تو تمہارے بھائی ہیں اور خدا جانتا ہے فساد کرنے والے کو اصلاح کرنے والے سے۔ اور اگر چاہتا خدا

لَاَعْنَتَكُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۲۰﴾

تو تم کو شقت میں ڈال دیتا۔ تحقیق اللہ غالب و دانای ہے

یتیموں کے مال کی حفاظت کا بیان

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ ۖ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۖ اور اس کے مال میں خیانت کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ اگر ایک شخص یتیموں کے اموال کی دیکھ بھال کے لئے اس قدر مصروف ہو کہ اس کو اپنے لئے کسب معاش کی فراغت ہی نہ مل سکتی ہو تو اس کے لئے جائز ہے کہ یتیموں کے مال سے ضرورت کے مطابق کھاپی لے۔ لیکن اگر یتیموں کا مال مختور ہو تو پھر اس کو ان کے مال سے کچھ بھی نہیں کھانا چاہئے۔ ابوصباح کنانی راوی حدیث نے عرض کی کہ حضور! خدا فرماتا ہے: وَإِنْ تَحَالُطْتُمْ بِهِمْ فَلَا تُؤْكَلُ مِنْهُ عَمَلٌ يُرْتَبَ ۚ اگر تم یتیموں کا مال اپنے مال سے ملا دو، تو وہ تمہارے بھائی ہیں یعنی اس میں حرج نہیں، تو آپ نے منع فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ کھانے پینے کے لئے نسبت لگا کر ان کا اور اپنا سامان خورد و نوش ملا لو۔ اور پھر کھانا اکٹھا تیار کر کے اکٹھا کھاپی لو۔ راوی نے عرض کی: حضور! اگر یتیموں میں بعض چھوٹے اور بعض بڑے ہوں۔ بعض کے لباس کا خرچ زیادہ اور بعض کا کم۔ اسی طرح بعض کم کھاتے ہوں اور بعض زیادہ تو پھر کس طرح نسبت قائم ہوگی؟ آپ نے فرمایا: کہ لباس کے لئے سب کا حساب جدا جدا ہونا چاہئے۔ لیکن کھانے میں سب کو یکساں نسبت سے رکھا جائے کیونکہ ممکن ہے کہ چھوٹا بڑے سے زیادہ کھا جائے (یا اس کے برابر کھائے)

عبداللہ بن یحییٰ کاہلی سے مروی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ بعض اوقات ہم اپنے ایک بھائی کے ملنے کے لئے جاتے ہیں اور ان کے پاس یتیم بچے ہوتے ہیں، ہم ان کے بستروں پر بیٹھتے ہیں اور بعض اوقات وہ ہم کو کھانا بھی کھلاتے ہیں حالانکہ اس میں یتیموں کا مال ملا ہوتا ہوتا ہے۔ تو ایسی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتَّىٰ يُوْمِنَ ۖ وَلَا مِمَّنْ مُّؤْمِنَةٍ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ ۚ وَلَوْ

اور نکاح کرو مشرک عورتوں سے یہاں تک کہ ایمان لائیں اور البتہ مومنہ لونڈی بہتر ہے مشرک آزاد عورت سے اگرچہ وہ تمہیں

أَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتَّىٰ يُوْمِنُوْا ۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ

بجلی معلوم ہو اور نکاح کرو دو مشرکوں کو (مومنہ عورتیں) یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں اور البتہ غلام مومن بہتر ہے (آزاد) مشرک سے

وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ ۚ أُولَٰئِكَ يَدْعُوْنَ إِلَى النَّارِ ۖ وَاللّٰهُ يَدْعُوْا إِلَى الْجَنَّةِ ۚ وَ

اگرچہ وہ تم کو پسند بھی ہو (کیونکہ) وہ لوگ دعوت دیں گے طرف دوزخ کے اور خدا دعوت دیتا ہے طرف جنت اور

الْمَغْفِرَةِ ۚ بِإِذْنِهِ ۚ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾

بخشش کے ساتھ اپنے اذن کے۔ اور بیان فرماتا ہے اپنی آیات کو لوگوں کے لئے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں

آپ نے فرمایا کہ اگر تمہارا جانا ان کی مصلحت و منفعت کے لئے ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر تمہارا جانے میں ان کی کوئی مصلحت و فائدہ نہیں تو پھر تمہارے لئے ایسا کرنا جائز نہیں اور اس چیز کو ہر انسان خود سمجھ سکتا ہے۔ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَأَغْنَيْنَاكُمْ ۖ اس فقرہ سے مجبورہ کا قول باطل ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ انسان اپنے افعال میں مجبور ہے کیونکہ اس صورت میں کسی فعل بد کے مرتکب کو نیکی کا حکم دینا، مشقت میں ڈالنا تو بجائے خود ایک ناشدنی امر کی تکلیف دینا ہے اور خدا جب بندے کو مشقت میں ڈالنا پسند نہیں فرماتا۔ تو اس کو امرِ محال کی تکلیف کیسے دے سکتا ہے؟

مومن کا کافر سے رشتہ ناجائز ہے

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ ۖ اس آیت کے شان نزول کے متعلق صاحبِ مجمع البیان نے تحریر فرمایا ہے کہ ایک شخص مرثد ابن ابی مرثد غنوی کو جناب رسالت ﷺ نے مکہ روانہ کیا تاکہ وہاں سے مسلمانوں کو نکال کر مدینہ منورہ کی طرف لائے اور یہ طاقتور اور بہادر آدمی تھا پس جب یہ مکہ میں پہنچا تو اس نے اپنا کام شروع کر دیا وہاں ایک عورت تھی جس کا نام عناق تھا۔ زمانِ کفر و جاہلیت میں مرثد بن ابی مرثد کے اس عورت سے ناجائز تعلقات تھے جب اس عورت کو مرثد کے مکہ میں پہنچنے کی خبر ہوئی تو وہ اس کے پاس آئی اور اس سے فعل بد کے ارتکاب کی خواہش کی۔ لیکن اس نے زنا کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر اس عورت نے خواہش کی کہ میرے ساتھ نکاح کر لو۔ مرثد نے جواب دیا کہ جب تک میں

جناب رسالتؐ سے اجازت نہ لوں گا تیرے ساتھ نکاح بھی نہیں کر سکتا۔ پس جب وہاں سے فارغ ہو کر واپس مدینہ آیا تو جناب رسالتؐ سے اس عورت سے نکاح کرنے کی اجازت طلب کی۔ تب یہ آیت نازل ہوئی کہ مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ خواہ آزاد مشرک عورت خوبصورت ہی ہو اور تمہیں پسند بھی ہو۔

مسئلہ :- مذہب شیعہ کا متفقہ فتوے ہے کہ کافرہ عورت خواہ اہل کتاب سے ہو یا مشرکین سے اس کے ساتھ نکاح دائمی کرنا قطعاً ناجائز ہے۔ البتہ کافرہ کتابیہ کے ساتھ متعہ کرنا جائز ہے۔

وَلَا تُكْرَهُوا النِّسَاءَ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مومنوں کے لئے جائز نہیں کہ مومنہ عورتوں کو مشرکوں کے نکاح میں دے دیں تو گویا مومنہ عورت کا نکاح کافر مرد سے خواہ اہل کتاب سے ہو یا ہونا جائز ہے اور یہ مذہب امامیہ کا متفقہ فیصلہ ہے۔

أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النِّسَاءِ۔ مشرکوں، کافروں سے مومنہ عورت کے نکاح کے ناجائز ہونے کی وجہ بیان فرمائی کہ چونکہ مرد عورت پر غالب اور حاکم ہوتے ہیں جب مومنہ عورت ان غیر مومن مردوں کے نکاح میں چلی جائے گی۔ تو غیر مومن مرد اپنی فطرت فاسدہ اور طینت خبیثہ کے ماتحت اپنی زوجہ مومنہ کو دین حق کے ترک کرنے پر مجبور کریں گے اور اگر وہ بالفرض مجبور نہ بھی کریں تو چونکہ عورت نے محکومی کی زندگی بسر کرنی ہے لہذا رفتہ رفتہ مرد کے اثرات قبول کرتے کرتے اسی کے اعتقادات کو اپنائے گی اور دین حق سے برگشتہ ہو جائے گی یا یہ کہ مرد کی خوشامد کے لئے اور اپنی زندگی کو راحت و آرام سے بسر کرنے کے لئے دین حق کے ترک کرنے پر مجبور ہو جائے گی جبکہ اس کو علم ہو جائے کہ مرد کی محبت سوائے اس کے حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔ پس ان وجوہات کے پیش نظر خداوند کریم نے مومنہ عورت کا نکاح کافر اور غیر مومن مرد سے ناجائز قرار دے دیا ہے اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ وہ کافر اور غیر مومن و دوزخ کی طرف دعوت دیں گے اور میں اللہ جنت اور بخشش کی دعوت دیتا ہوں لہذا ایسا رشتہ جس سے کفر کی دعوت میں قبولیت کو تقویت پہنچتی ہو ترک کر دیا جائے اگر مومنہ عورت کے ماں باپ غیر مومن مرد سے اس کا نکاح کرنے کی جسارت کریں گے تو اس کا وبال آخروی ماں باپ کے سر پہ ہوگا اور اس حکم کی وضاحت کے بعد قیامت کے دن اُن کا کوئی عذر نہ سنا جائے گا اگر مومنہ عورت غیر مومن مرد کے نکاح کی وجہ سے دین حق کو ترک کرنے پر مجبور ہو گئی تو ہر روز عشرِ عذر کر سکے گی کہ مجھے ماں باپ نے اس مصیبت میں پھنسا دیا تھا اور میں مجبور تھی تو اس قسم کے والدین کو قیامت کے دن جواب دہی کے لئے تیار رہنا چاہیے۔

مسئلہ :- کافر اور مشرک کا جو حکم ہے فرق اسلام میں سے ناصبی، خارجی اور غالی کا بھی وہی حکم ہے۔ بلکہ مومن اپنا رشتہ صرف مومن کو ہی دے سکتا ہے۔

وجہ ربط آیات :- احکام فرعیہ میں سے پہلے اوامر کا بیان فرمایا، مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد، وصیت، قصاص وغیرہ اور ان احکام کے بعد نواہی کا بیان شروع کیا یعنی وہ چیزیں جن سے بچنے کا حکم ہے پس ان میں سے زیادہ اہم امور کا ذکر فرمایا

وَلْيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى فَأَعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ۚ

آپ سے پوچھتے ہیں حیض کے متعلق فرماد دیجئے کہ وہ نجس ہے۔ پس علیحدہ رہو عورتوں سے۔ اٹنائے حیض میں

وَلَا تَقْرَبُوا هُنَّ حَتَّى يَطْهَرْنَ ۚ فَإِذَا أَطْهَرْنَ فَأَتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ

اور نہ نزدیک جاؤ ان کے یہاں تک کہ پاک ہوئیں۔ پس جب پاک ہوئیں تو آؤ ان پر جہاں سے امر کیا تم کو

أَمَرَكُمْ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُسْتَطَهِّرِينَ ﴿٢٢٢﴾

خدا تعالیٰ نے تحقیق خدا دوست رکھتا ہے توبہ کرنے والوں کو اور درست رکھتا ہے پاک بازوں کو

مثلاً شراب نوشی، جوا بازی، بیٹیوں کا مال کھانا اور مشرکوں، کافروں (غیر مومن لوگوں کے ساتھ) رشتہ ناظم کرنا۔ ان سب سے مومنوں کو بچنا واجب ہے۔ ان مسائل کے بعد امور خانہ دار کا کی طرف متوجہ فرماتے ہوئے مسائل زوجیت کو بیان فرمایا۔

رکوع ۱۲

حیض کا بیان

يَسْأَلُونَكَ ۖ۔ اس کے شان نزول کے متعلق ہے کہ آیام جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ لوگ اپنی عورتوں سے حیض کے دنوں میں بالکل علیحدہ ہو جایا کرتے تھے اور ان کے ساتھ کھانا، پینا، بیٹھنا ترک کر دیتے تھے۔ پس انہوں نے جناب رسالتاً سے اس بارے میں سوال کیا تو یہ آیت اتری۔

فَاعْتَزِلُوا ۚ۔ آیام حیض میں عورت کے ساتھ جماع کرنا حرام ہے اگر کوئی شخص عداً ایسا کرے تو اس پر کفارہ واجب ہے۔ اگر حیض کے پہلے جعتہ میں جماعت کرے تو اس کا کفارہ ایک دینار اور اگر درمیان میں کرے تو اس کا کفارہ نصف دینار اور اگر آخر جعتہ میں کرے تو اس کا کفارہ دینار کا چوتھا جعتہ ہے

مسئلہ ۱۔ آیام حیض میں جماعت کے علاوہ عورت سے بوس و کنار وغیرہ جائز ہے البتہ زیر ناف اس سے استماع حاصل کرنا مکروہ ہے۔ یعنی اس کو ہاتھ لگانے سے بھی گریز نہ کرے۔

حَتَّى يَطْهَرْنَ ۚ۔ اس لفظ کو بعض قاریوں نے يَطْهَرْنَ شد کے ساتھ پڑھا ہے اگر بغیر شد کے پڑھا جائے تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ عورتوں سے مقاربت نہ کرو جب تک کہ خون سے پاک نہ ہو جائیں اور شد کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں معنی ہوگا کہ عورتوں سے جماعت نہ کرو۔ جب تک کہ خون ختم ہونے کے بعد غسل نہ کر لیں۔

مسئلہ ۲۔ خون حیض ختم ہو جانے کے بعد اور غسل سے پہلے عورت کے ساتھ جماعت کرنا جائز ہے لیکن غسل سے پہلے مکروہ ہے

لہذا بہتر ہے کہ غسل سے پہلے جماعت نہ کرے اور بعض علما کے نزدیک غسل سے پہلے عورت کے ساتھ جماعت کرنا حرام ہے۔
 ضیَاذَ الطَّهْرَيْنِ۔ یعنی جب خون سے پاک ہو جائیں یا غسل کر لیں تو ان کے پاس آؤ یعنی جماعت کرو اور ان کے پاس آنے کا امر وجوب کے لئے نہیں ہے بلکہ اباحت کے لئے ہے مقصد یہ ہے کہ اب تمہارے لئے جائز ہے کہ ان کیساتھ جماعت کرو
 مسئلہ:۔ خون حیض کم از کم تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن آتا ہے اور ہر ندرت عورت کو ایک ماہ میں ایک دفعہ آتا ہے اور ایک حیض سے دوسرے حیض تک کم از کم مدت دس دن ہے اگر ایک حیض کے بعد دس دن گزرنے سے پہلے کوئی خون آجائے تو وہ یقیناً استحاضہ کا خون ہوگا اور عائض عورت الحائضہ (۱) وہ عبادات جن میں طہارت شرط ہے مثلاً نماز، روزہ وغیرہ۔ حیض والی عورت پر ان کا بجالانا حرام ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے اسماء طاہرہ کو مس کرنا اس پر حرام ہے۔ بلکہ انبیائے طاہرین اور آئمہ معصومین کے ناموں کو مس کرنے سے بھی پرہیز کرے۔ نیز ترکان مجید کے حروف حرکات سکناات وغیرہ کو بھی وہ مس نہیں کر سکتی۔
 (۳) وہ آیات جن میں سجدہ واجب ہے۔ عائض عورت پر ان کا پڑھنا حرام ہے بلکہ سورہ سجده کے پڑھنے سے بھی اجتناب کرے (۴) مساجد میں ٹھیکرنا اس کے لئے حرام ہے۔

(۵) کوئی چیز مسجد میں رکھنا اس کے لئے حرام ہے جبکہ مستلزم دخول مسجد ہو۔
 (۶) مسجد الحرام اور مسجد نبویؐ۔ ان دو مسجدوں سے گذرنا بھی حیض والی عورت پر حرام ہے۔
 (۷) حیض والی عورت کے ساتھ جماعت کرنا حرام ہے۔ اور بصورت جماعت کفارہ واجب ہے۔
 (۸) ایام حیض میں عورت کو طلاق دینا ناجائز ہے۔ بشرطیکہ (۱) مدخلہ ہو (۲) حاملہ نہ ہو (۳) مرد حاضر ہو یعنی عورت کے حالات سے مطلع ہونا اس کے لئے آسان ہو اور ان شرائط کے نہ پائے جانے کی صورت میں حیض والی عورت کو طلاق دی جا سکتی ہے یعنی اگر عورت مدخلہ نہ ہو یا مدخلہ حاملہ ہو یا یہ کہ مرد کے لئے اس کے حالات سے مطلع ہونا دشوار ہو۔ ان حالتوں میں عورت کو طلاق دینا جائز ہے خواہ ایام حیض ہی میں کیوں نہ ہو۔

(۹) خون کے اختتام کے بعد غسل حیض عبادات مشروطہ باطہارت کے لئے واجب ہوا کرتا ہے۔
 مسئلہ:۔ غسل حیض کی کیفیت مثل غسل جنابت کے ہے۔ یعنی اگر اتنا سی ہو تو نجاست دُور کرنے کے بعد نیت کر کے ایک دفعہ غوطہ لگانا کافی ہے اور اگر غسل ترتیبی ہے تو نجاست دُور کرنے کے بعد نیت کر کے پہلے سر اور پھر دایاں حصہ اور پھر بائیں حصہ بدن پر پانی کو جاری کئے اس طرح کہ کوئی جگہ خشک نہ رہ جائے۔

مسئلہ:۔ عورت کے وہ زیورات جو چہرے تک پانی پہنچنے سے مانع ہیں غسل کے وقت ان کا اتارنا واجب ہے۔ تاکہ پانی چہرے تک پہنچ جائے ورنہ غسل باطل ہوگا۔

مسئلہ:۔ ناخن پالش جس کا عورتوں میں آجکل عروج ہے اس کی موجودگی میں غسل کی صحت مشکل ہے کیونکہ ناخن کے اوپر ایک علیحدہ پردہ سا ہوتا ہے جو ناخن تک پانی پہنچنے سے مانع ہے۔

مسئلہ: سر کے بال اگر گندھے ہوں اور پانی جسم تک پہنچنے سے مانع ہوں تو ان کا کھولنا برکت غسل واجب ہے۔
مسئلہ: غسل حیض کے پہلے یا بعد وضو کرنا عبادت کے لئے ضروری ہوا کرتا ہے اور بہتر ہے کہ وضو بقصد قربت پہلے کیا جائے۔

مسئلہ: غسل کے بعد عورت پر وہ سب چیزیں حلال ہو جائیں گی جو بوجہ حیض کے اس پر حرام تھیں سوائے ان عبادات کے جو مشروط یا طہارت ہیں کیونکہ ان کے لئے وضو بھی ضروری ہے خواہ غسل سے پہلے کرے یا بعد کرے۔ لیکن پہلے کرنا بہتر ہے۔
مسئلہ: اگر غسل کرنا کسی وجہ سے ممکن نہ ہو تو تیمم بدلے غسل کرنا چاہیے اور اگر وضو بھی ناممکن ہو تو دوسرا تیمم بدلے وضو کے کرنا ضروری ہوگا۔

(۱۰) ایام حیض میں عورت سے جو نمازیں ترک ہوئی ہیں۔ ان کی قضا واجب نہیں لیکن جو روزے قضا ہوئے ہوں ان کی قضا واجب ہے۔

(۱۱) جو عورت، طہارت و نجاست کی پرواہ کرنے والی نہ ہو اور ایام حیض میں اپنے لباس و بدن وغیرہ کو آلودگی سے بچانے میں احتیاط نہ کرتی ہو۔ ایسی عورت کی بھوئی چیز اس کا پس خوردہ استعمال کرنا مکروہ ہے اسی طرح حیض والی عورت کے لئے مہندی لگانا، سجدہ والی سورتوں کے علاوہ اور قرآن کے حروف کے علاوہ اوراق کی خالی جگہوں کو یا جلد کو مس کرنا مکروہ ہے۔
مسئلہ: اگر ایام حیض میں عورت مر جائے تو اس کو غسل حیض دینے کے بعد غسل میت دیا جائے۔

مسئلہ: اگر وقت نماز داخل ہونے کے بعد اتنی مقدار گزر جائے کہ وہ باشرائط نماز پڑھ سکتی ہو اور اس کے بعد اس کو حیض شروع ہو جائے تو اس پر اس نماز کی قضا واجب ہے اسی طرح اگر آخر وقت میں حیض ختم ہو جائے اور اتنا وقت باقی ہو کہ غسل اور باقی نماز کی شرائط حاصل کرنے کے بعد ایک رکعت نماز وقت کے اندر ادا کر سکتی ہو۔ لیکن نہ کرے تو اس پر اس نماز کی قضا واجب ہے۔

مسئلہ: من جملہ علامات بلوغ کے عورت کو حیض کا آنا بھی ایک علامت بلوغ کی ہے۔

مسئلہ: ایام حیض میں اگرچہ عورت پر نماز معاف ہے لیکن اس کے لئے مستحب ہے کہ وقت نماز میں وضو بقصد قربت کر کے مصلائے عبادت پر بیٹھ کر نماز کی مقدار کے برابر ذکر خدا کرتی رہے۔

مسئلہ: ہر عورت بالغہ پر واجب ہے کہ مسائل حیض سیکھے اور ان پر عمل کرے۔

مسئلہ: حیض کے دنوں میں عورت پر روزہ رکھنا حرام ہے اور اس کی قضا واجب ہے۔

مسئلہ: اگر روزہ دار عورت کو غروب آفتاب سے پہلے حیض شروع ہو جائے تو اس کا روزہ باطل ہو جائیگا اور اس کی قضا لازم ہوگی۔
مسئلہ: حیض والی عورت بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکتی کیونکہ بیت اللہ مسجد الحرام کے اندر ہے اور مسجد میں اس کا داخل ہونا منوع ہے۔

يَسْأَلُكُمْ حَرْثُكُمْ فَأَلْتُوا حَرْثَكُمْ أَنِّي شِئْتُكُمْ وَقَدْ مَوَّالَ أَنْفُسِكُمْ

تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔ پس آؤ اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو اور بھیجو اپنے نفسوں کے لئے (نیک اعمال) اور اللہ سے ڈرو

وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلْقَوَةٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٢٣﴾ وَلَا

اور جانو تحقیق تم اس کے پاس حاضر ہونے والو ہو۔ اور خوش خبری دیجئے ایمان والوں کو اور نہ بناؤ

تَجْعَلُوا لِلَّهِ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا وَتُصْلِحُوا

اللہ کو نذر نہ اپنی قسموں کا تاکہ نیک بنو اور پچو گناہوں سے اور اصلاح کرو درمیان

بَيْنَ النَّاسِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٢٤﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي

لوگوں کے اور خدا سُننے جانتے والا ہے نہیں گرفت کرتا تم کو خدا ساتھ لغو کے تمہاری قسموں میں

أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٢٢٥﴾

لیکن وہ مواخذہ کرے گا ساتھ اس چیز کے جو کسب کیا تمہارے دلوں نے اور خدا بخشنے والا حلیم ہے۔

ازدواجی زندگی کا حقیقی مفاد

يَسْأَلُكُمْ حَرْثُكُمْ، نسل انسانیت کو چونکہ موجودات پر افضلیت اور فوقیت دی گئی ہے لہذا ان کے احکام کو بھی موجودات سے امتیازی شان کا حامل ہونا ضروری ہے۔ عام حیوانات کی بقا و نسل کا دار و مدار بھی نر مادہ کے باہمی جوڑ پر ہے۔ بلکہ ماہرین نباتات کے نزدیک تو نباتات کی افزائش و بقاء بھی اجناس نباتیہ کے نر و مادہ کے ملاپ پر موقوف ہے اور عربی ممالک میں تو آج کل بھی بار آوری کے زمانہ میں نر کھجور کے غنڈھوں سے اس کا پھل نکال کر مادہ کھجور کے خوشنوں میں داخل کر کے اُسے ادنیٰ سے اعلیٰ بنایا جاتا ہے اور اسے تابیر کہتے ہیں۔ اور چونکہ تمام نباتات میں نر و مادہ کی ملاوٹ پر انسان کی قدرت نہیں بلکہ پودہ جات کے اقسام مختلفہ میں سے نر و مادہ کی پوری شاخت بھی انسان کے بس کا رنگ نہیں۔ لہذا خداوند حکیم نے ہوائوں اور تیز آندھیوں کے ذریعہ سے ان کے اثرات کو ایک دوسرے تک منتقل فرمانے کا انتظام کیا ہے اور یہ تجربہ شدہ امر ہے کہ کھجور کے باغات میں اگر نر کھجور کے پودے نہ ہوں یا بہت کم ہوں تو باغات کے پھلوں میں مستندہ کی واقع ہو جاتی ہے اس سے اس امر کا بخوبی انکشاف ہو سکتا ہے کہ باقی پودہ جات اور میوہ دار اشجار کا بھی یہی حال ہو گا۔

اس مقام پر خدائے قدوس نے نسل انسانی کی بقا اور نشوونما کے طریقہ کی وضاحت کی ہے کہ عورت کو صرف استلذاذ اور تکین شہوات کا آلہ نہ سمجھنا چاہیے۔ بلکہ قدرت کی حکیمانہ ایجاد و تخلیق نے اسے اشرف المخلوقات کی نشوونما کے لئے کھیتی قرار دیا ہے۔

اس مختصر سے لفظ میں خداوند کریم نے عورت و مرد کی ازدواجی زندگی کے متعدد پہلوؤں کی نشان دہی فرمائی ہے (۱) کھیتی میں متعدد مالکوں کی شرکت باعث نزاع ہوا کرتی ہے۔ بنا بریں عورت کے لئے بیک وقت ایک سے زیادہ مرد حرام ہیں۔

(۲) کھیتی پر مالک کا تصرف حاکمانہ ہوتا ہے اس سے عورت پر مرد کی حکومت کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) کھیتی کی تربیت مالک کے ذمہ ہوتی ہے۔ اس سے عورت کے تمام تر اخراجات لائقہ کی ذمہ داری کا جوہر مرد پر عائد ہونا سمجھا جاتا ہے۔

(۴) کھیتی کے حفاظتی انتظامات مرد پر عورت کے لئے پردہ داری کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔

(۵) کھیتی میں غیر کے بے جا داخلے سے نقصان کا اندیشہ، جہاں زنا کی حرمت بتاتا ہے وہاں مرد کو غیرت کا بھی درس دیتا ہے۔

(۶) بعض وقتی تقاضوں کے ماتحت کھیتی کو اپنی ملکیت سے خارج کیا جاسکتا ہے جو سہ طلاق کی طرف متنبہ کرتا ہے۔

(۷) اسی طرح ازدواجی زندگی کے جملہ اصول کا اسی مثال سے استکشاف کیا جاسکتا ہے اور خاص طور پر قابل توجہ امر یہ ہے اور انسان کا عقلی فریضہ بھی یہی ہے کہ اچھے پھل حاصل کرنے کے لئے اچھی سے اچھی زمین کا انتخاب کرے

کیونکہ اچھے سے اچھا بیج ناکارہ زمین میں تلف ہو جاتا ہے یا بعض اوقات غیر تسلی بخش افادیت کا حامل ہوتا ہے

اور بخلاف اس کے کمزور بیج لائق اور شستہ زمین میں تسلی بخش اور صحت افزا نتیجہ تک منتهی ہوتا ہے۔

اسی نقطہ کے پیش نظر تو خالوادہ عصمت سے کافی روایات منقول ہیں جن میں عورت کے انتخاب پر زور دیا گیا

ہے عورت کو صرف حسن و جمال کی خاطر یا زرد مال کے طبع کے لئے منتخب کیا جائے تو یہ دانش مندی نہیں بلکہ قرآن

مجید کی تشبیہ کے لحاظ سے پہلے پہل عورت کے عقل و دماغ کا جائزہ لیا جائے کیونکہ صنفی طور پر تو وہ ویسے ناقص

العقل ہے اگر شخصی طور پر بھی کو رد مانع ہو تو ایک دانش مند اور بلند خیال انسان کا اس کے ساتھ قطعاً گزر نہیں ہو سکتا۔

خواہ وہ عورت اپنے مقام پر ظاہری لحاظ سے تصویر حسن اور پیکر جمال ہی کیوں نہ ہو، اسی بنا پر تو معصوم کا فرمان ہے کہ اگر عورت

کو صرف ظاہری جاہ و جلال یا حسن و مال کی خاطر اپنے عقد میں لائے تو بعید نہیں کہ وہ ان دونوں فائدوں

سے محروم رہے۔

نیز اگر عورت کند ذہن اور بد دماغ ہوگی تو اس کا لازمی نتیجہ ہے اولاد کا کند ذہن ہونا، خواہ مرد کتنا ہی

عقیل اور فہیم ہو، جس طرح کہ عورت کی کھیتی سے تشبیہ اس امر کی شاہد ہے کہ عہد بیچ نالائق زمین میں نالائق پیداوار لاتا ہے اور ناکارہ بیج بھی اعلیٰ زمین میں خوش گوار نتائج پیش کرتا ہے اور حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا شجاع اولاد کی خواہش میں شجاع خاندان کی عورت کے انتخاب کے لئے حضرت عقیل سے مشورہ لے کر ام البنین کا عقد میں لانا اسی نکتہ کے پیش نظر تھا۔ ورنہ اگر یہ اوصاف مرد کے تابع ہوتیں تو شجاعت کے مقام میں آنحضرتؐ کسی سے کیا کم تھے؟ اور یہی وجہ ہے کہ حسنین شریفینؑ کو مقام شجاعت میں بھی بے پناہ شخصیت کے حامل تھے۔ لیکن ایشازِ حلم و حوصلہ صبر و رضا، سکون و اطمینان اور رحم و کرم میں بھی نمایاں حیثیت کے حامل تھے اور یہ شیر بتول معظمہؑ کی تاثیر تھی اور حضرت عباسؑ باوجود باقی صفات میں کامل ہونے کے جوہر شجاعت میں امتیازی شان پر فائز تھے۔ اور یہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے اس انتخاب کا نتیجہ تھا اگر تتبع کیا جائے اور تاریخ میں شخصیات کے ان پہلوؤں پر نظر رکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ اولاد کی اچھائی یا برائی میں مادوں کا کس قدر دخل ہے۔

بہر حال عورت و مرد کی ازدواجی زندگی کا انحصار صرف شہوت رانی اور تعیش پرستی پر ہی نہیں بلکہ ان کی نگاہ ایک اعلیٰ اور بلند مقصد پر ہونی چاہیے تاکہ ایک طرف ان کی اپنی زندگی خوش گوار ہو اور دوسری طرف بہترین اولاد ان کی نسل سے منصفہ شہود پر آئے تاکہ عالم وجود انسان نمودارندوں سے بھرپور ہو جائے کی بجائے صحیح معنوں میں انسانیت کا گہوارہ بن کر امن و اطمینان کا سانس لے

آئی ششم۔ اس میں خداوند کریم نے اپنی عورت کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے کی کھلی اجازت دی ہے کہ جب چاہو یا جہاں چاہو اپنی منکوحہ کو اپنی نسل کیلئے کھیتی سمجھ کر اس سے ہمبستری اور ایک دوسرے مقام پر عورت کو مرد کے لئے باعث سکون قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ پر عورت و مرد کو ایک دوسرے کا لباس تصور کیا گیا ہے۔ ان سب تصریحات و اشارات میں مرد کو ہوس جنسی کی تسکین کے ساتھ ساتھ حقوق و فرائض کی طرف بھی متنبہ کیا گیا ہے تاکہ صرف شہوت رانی اور جنسی لذت کو ہی ازدواجی زندگی کا مال نہ سمجھے بلکہ ہمبستری کے وقت بھی تسکین قلب کے ساتھ ان حدود کی پاسداری کا خیال رکھے جو شریعت مقدسہ نے اس کے لئے مقرر فرمائی ہیں اور چونکہ طبعی اللہ پر میں عورت کے کھیتی ہونے کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے لہذا شریعت مقدسہ نے اس فعل شنیع کو قابل نفرت اور مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ عورت کے ساتھ ہمبستری کرنے کے لئے اس کے کھیتی ہونے حیثیت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے اور عورت پر بھی واجب ہے کہ مرد کے لئے تسکین قلب کی موجب ہو اور ہر ممکن طریقہ سے مرد کے جذبات کا احترام کرنا اپنا نصب العین سمجھے۔

وَلَا تَجْعَلُوا آلَ اللَّهِ۔ تفسیر عمدۃ البیان میں ہے کہ عبد اللہ بن رواحہ نے اپنے بہنوئی سے ناراض ہو کر قسم کھالی تھی کہ نہ اس کے ساتھ نیکی کروں گا اور نہ اس کی زوجہ سے اس کی صلح کراؤں گا اور نہ اس کے دشمنوں اور اس کے درمیان صلح کراؤں گا۔ پس یہ آیت اتری کہ اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ۔ تاکہ نیک بنو یا یہ کہ اللہ کو باعشر رکاوٹ نہ بناؤ اس بات سے کہ نیکی کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور صلح کراؤ۔

لِّلَّذِينَ يُؤْكُلُونَ مِنْ نِّسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ فَاءُوا فَإِنَّ

داستے ان کے جو قسم کھاتے ہیں اپنی عورتوں کے بارے میں مہلت چار ماہ کی ہے پس اگر رجوع کر لیں تو تحقیق

اللَّهُ عَفْوٌ رَّحِيمٌ (۲۲۶) وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۲۲۷)

اللہ بخشنے والا رحیم کرنے والا ہے اور اگر ارادہ کریں طلاق کا - تو تحقیق اللہ سنے والا ہے -

ایلاء کا بیان

ایلاء کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی مدخولہ عورت سے مہبستری نہ کرنے کی قسم کھائے اور اس سے اس کا مقصود صرف عورت کو ضرور تکلیف دینا ہو خواہ اس میں مدت مقرر نہ کرے یا مدت مقرر کرے لیکن چار ماہ سے زیادہ ہو۔

ایلاء میں شرط یہ ہے کہ قسم اللہ کے لفظ سے ہو یا اللہ کے خاص صفات سے واقع ہو اور اگر کسی اور متبرک چیز مثلاً قرآن یا انبیاء و اوصیائے طاہرین علیہم السلام کے اسماء طاہرہ کی قسم کھائے گا تو اس پر ایلاء کا حکم جاری نہ ہوگا۔

ایلاء کرنے والے میں یہ شرطیں بھی ضروری ہیں :- (۱) عاقل ہو (۲) بالغ ہو (۳) صاحب اختیار ہو یعنی کسی اور نے ایسا کرنے پر مجبور نہ کیا ہو (۴) ایلاء کرتے وقت اس کا قصد بھی ہو، اگر بھول کر یا حالت غفلت میں ایسا کرے تو ایلاء نہ ہوگا۔

مسئلہ ۱۔ اگر ایلاء متحقق ہو جائے تو عورت کو حاکم شرع کے پاس رپورٹ کرنے کا حق ہے۔ پس حاکم شرع چار ماہ کے بعد مرد کو دو چیزوں میں سے ایک کے اختیار کرنے کا حکم دے گا۔ (۱) یا تو عورت کی طرف رجوع کر کے ایلاء کا قسم کھانے کا کفارہ ادا کرے (۲) یا عورت کو طلاق دے دے۔ مسئلہ ۲۔ اگر ایلاء کرنے والا ان دونوں میں سے کسی کو اختیار نہ کرے تو حاکم شرع اس سے جبریہ ایسا کرنے کا مجاز ہے۔

مسئلہ ۳۔ ایلاء کا کفارہ دوسری قسم کے کفارہ کی طرح ہے یعنی دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا دس مسکینوں کو لباس دینا یا غلام آزاد کرنا اور اگر ان تینوں چیزوں سے عاجز ہو تو تین روزے رکھ دے۔

مسئلہ ۴۔ اگر عورت سے مہبستری ترک کرنے کی قسم عورت کے فائدہ کے لئے کھائے۔ مثلاً عورت حاملہ ہو، یا بچہ دار ہو، یا بیمار ہو۔ پس ترک مہبستری کی قسم جل کی حفاظت کے لئے یا دودھ کی درستی کے لئے یا عورت کو تکلیف سے بچانے کے لئے کھائے تو یہ ایلاء نہ ہوگا۔ بلکہ اس کا حکم عام قسم کی طرح ہوگا۔ یعنی اس کی خلاف درزی سے صرف قسم کا کفارہ دینا پڑے گا۔

وَالْمُطَلَّاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ۖ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ

اور طلاق شدہ عورتیں انتظار کریں تین طہر۔ اور ان کے لئے حلال نہیں کہ چھپائیں وہ چیز جو پسند کی

مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَبَّوْهُنَّ

ہے اللہ نے ان کے رحموں میں۔ اگر ان کا ایمان خدا اور قیامت کے دن پر ہے اور ان کے شوہر زیادہ

أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ أَنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي

حقدار ہیں ان کو پھیر لینے میں اُس (عدت) میں اگر ارادہ کریں اصلاح (درستی) کا اور ان کا (مردوں پر حق) ویسا ہی ہے جیسا

عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۚ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۱۸﴾

(مردوں کا حق) ان پر ہے۔ ساتھ نیکی کے اور مردوں کو ان پر درجہ ہے (فوقیت حاصل ہے) اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

مطلقة کی عدت کا بیان

ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ۔ قُرُوءٌ جمع ہے قُرْءٌ کی اور یہ لفظ لغات اصداوہ میں شمار ہوتا ہے یعنی اس کے دو معنی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ قُرْءٌ کا معنی حیض بھی ہے اور اس کا معنی طہر بھی ہے اس مقام پر علمائے امامیہ کا مذہب یہ ہے کہ قُرْءٌ کا معنی طہر لیا جائے۔ پس طلاق شدہ عورت کی عدت تین طہر ہوگی۔ ایک طہر وہ بھی شمار ہوگا جس میں طلاق واقع ہوئی ہو اور اس کے بعد دو طہر سالم جب گزریں گے اور تیسری مرتبہ اس کو حیض شروع ہوگا تو پس عدت ختم ہو جائے گی اور آئمہ طاہرین علیہم السلام سے ایسا ہی مروی ہے۔ حنفیوں کے نزدیک یہاں قُرْءٌ سے مراد حیض ہے پس ان کے نزدیک طلاق کی عدت تین حیض ہے۔ پس تیسرے حیض کے ختم ہونے پر عورت کی عدت ختم ہوگی۔

فِي أَرْحَامِهِنَّ (جو کچھ ان کے رحم میں ہے) اس سے بعضوں نے مراد حیض لیا ہے اور بعضوں نے حمل مراد لیا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ مراد اس سے حیض اور حمل دونوں ہیں اور لفظ کا عموم بھی اسی کا مؤید ہے اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی یہی مروی ہے۔ پس مطلب یہ ہے کہ طلاق کے بعد عورت کو اپنا حیض یا حمل چھپانا نہیں چاہیے۔ (اگر اس سے ان چیزوں کے بارے میں سوال کیا جائے تو اس کو صاف صاف بتا دینا چاہیے) اور حمل یا حیض کی خبر میں عورت کا قول معتبر ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو حائض بتلائیں تو ان کو حائض سمجھنا چاہیے اور اگر اپنے آپ کو حیض سے پاک بتلائیں تو ان کو پاک سمجھنا چاہیے اس پر اُس سے مزید گواہ وغیرہ لینے کی ضرورت نہیں، اسی طرح اس کی اپنے متعلق حامل ہونے یا نہ ہونے کی خبر شریعت میں معتبر

سمجھی گئی ہے۔

پس طلاق شدہ عورت کو حیض یا حمل کی حالت چھپانے سے ممانعت ہے کیونکہ اس کی عدت کے باقی ہونے، یا گزرنے کا دار و مدار اسی چیز پر ہے اگر عورت غلط بیانی کرے تو اس میں مرد کی حق تلفی ہے کیونکہ مرد کو عدت کے اندر رجوع کرنے کا حق حاصل ہے اور عورت کی غلط بیانی اور حقیقت پر پردہ پوشی مرد کو اپنے جائز حق سے محروم رکھنے کے مترادف ہے۔

اِنْ اَرَادُوْا اِصْلَاحًا۔ اس کا مطلب یہ ہے طلاق کے بعد عدت کے اندر مرد کو بغیر عقد ثانی کے عورت کی طرف رجوع کرنے کا حق حاصل ہے خواہ عورت رضامند ہو یا نہ ہو۔ لیکن بشرطیکہ مرد کی نیت اصلاح (خانہ آبادی) کی ہو اور اگر مرد کی نیت فاسد ہو۔ یعنی محض عورت کو تنگ کرنے کے لئے طلاق کے بعد رجوع کر رہا ہو۔ تاکہ وہ کسی اور جگہ نکاح کرنے کے قابل نہ رہے تو ایسی صورت میں مرد کے لئے رجوع کرنا ناجائز ہے اور اگر بالفرض مرد اسی فاسد نیت سے رجوع کرے بھی تو رجوع کا حکم صادق آجائے گا اور وہ عورت اس کی منکوحہ ٹھہری رہے گی۔ اگرچہ مرد پر ایسا کرنا حرام ہے۔

عورت مرد کے حقوق

وَلَكُمْ مِثْلُ الَّذِي اِنَّ۔ یعنی عورتوں کے مردوں پر ویسے ہی حقوق ہیں جس طرح مردوں کے عورتوں پر۔ لیکن مردوں کو اُن پر درجہ (فضیلت) حاصل ہے۔ خداوند کریم نے اس آیت میں امور خانگی کی اصلاح اور عورت و مرد کی حسن معاشرت کو نہایت جامع طریقہ پر بیان فرمایا ہے۔

مجمع البیان میں منقول ہے کہ معاذ کی عورت نے جناب رسالت ﷺ سے مرد پر عورت کے حقوق دریافت کئے۔ آپ نے فرمایا کہ مرد پر عورت کا حق یہ ہے کہ اس کے منہ پر تھپڑ نہ مارے اس کے ساتھ بدزبانی نہ کرے جو خود کھائے اس کو کھلائے۔ جو خود پہنے اس کو پہنائے اور اس سے یکسوئی نہ اختیار کرے۔

نیز آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:۔ عورت کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو۔ اللہ کی امانت میں تم نے اُن کو حاصل کیا ہے اور اللہ کے فرمان سے تم نے ان کے پوشیدہ مقامات پر تصرف کیا ہے تمہارا اُن پر حق یہ ہے کہ وہ تمہارے غیر کو اپنے جسم پر تصرف نہ کرنے دیں۔ اور ایسا کرنے سے وہ سزا کی حقدار ہیں اور اُن کا تم پر حق یہ ہے۔ کہ ان کو روٹی کپڑا خوش اسلوبی سے دیتے رہو۔ کتاب ”من لایحضرہ الفقیہ“ میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ ایک عورت جناب رسالت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور دریافت کیا کہ مرد کے عورت پر کیا حقوق ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس پر مرد کی اطاعت واجب ہے۔ مرد کے اذن کے بغیر وہ گھر سے کسی کو صدقہ نہ دے اور نہ اس کی اجازت کے

بنی سنی روزہ رکھتے اور نہ اپنے جسم سے مرد کو رد کے اگرچہ پالان شتر پر ہی کیوں نہ ہو اور بغیر اجازت مرد کے گھر سے باہر نہ جائے اور اگر بغیر اجازت مرد کے گھر سے باہر جائے گی تو آسمان وزمین کے فرشتے اور غضب اور رحمت کے فرشتے اس پر لعنت کرتے رہیں گے جب تک کہ وہ گھر واپس نہ پہنچ جائے۔

پھر اس عورت نے سوال کیا۔ یا رسول اللہ! لوگوں میں سے عورت پر زیادہ سے زیادہ حق کس کا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ شوہر کا۔ پھر اُس نے پوچھا کہ کیا میرا حق بھی اس پر ویسا ہی ہے؟ جس طرح اس کا بھوڑا پرہے؟ آپ نے فرمایا کہ ایسا نہیں۔ بلکہ اُس کے مقابلہ میں ایک سو میں سے ایک بھی نہیں۔

پس یہ سنتے ہی عورت نے آپ کی نبت کی قسم کھاتے ہوئے کہا کہ میں ہرگز شادی نہ کروں گی۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور نے فرمایا کہ اگر مجھے کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دینا ہوتا تو البتہ میں عورت کو شوہر کے سجدہ کا حکم دیتا۔

دورِ حاضر میں عورت کی آزادی کا تصوّر

زمانِ حاضر میں مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر عورتیں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کو اپنے لئے توہین خیال کرتی ہیں کیونکہ مغرب کی اسلام کش مسموم اور تند ہوا اُن کو مردوں کے دوش بدوش چلنے کی طرف مسلسل دھکیلے جا رہی ہے اور اسلامی تعلیمات سے برسرِ پیکار ہونے والے مرد بھی صرف اپنی خواہشاتِ نفسانیہ اور جذباتِ شہوانیہ کی تسکین کی سہولت کی خاطر اسی قسم کے فحشے بلند کرتے نظر آتے ہیں۔

حالانکہ خداوندِ کریم نے عورت و مرد کو جو علیحدہ علیحدہ خصوصیات عطا فرمائی ہیں اُن سے آگے قدم بڑھانے کی جرات کرنا خدائی فیصلہ کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے اس نے اپنی حکمت کا ملہ سے عورت کے وجود کو ایسے سانچے میں ڈھالا ہے کہ وہ گھر کے اندرونی کاروبار کو سنبھالنے کی ذمہ داری کا بوجھ ہی برداشت کر سکتی ہے اور اپنی چار دیواری کے اندر اپنے فرائض کی ادائیگی ہی اس کے نمایاں مقام پر فائز ہونے کی دلیل ہے برخلاف اس کے مرد کی ساخت اس نے ایسی رکھی کہ وہ گھر بیرون زندگی کے سنوارنے کے علاوہ بیرونی میل جول سے اپنے نمایاں کردار کے ذریعے اپنی خداداد استعداد کو عمل میں لا کر اپنے لئے ایک بلند مقام حاصل کرے اور تعمیرِ اخلاق و کردار سے صحیفہٴ انسانیت سے حیوانیت و درندگی کے بدعا داغ دھو کر عالم میں امن و سکون کا علم بلند کرے۔

مولائے کائنات جلّٰلِ مشکلات حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے عورت و مرد کی پوزیشن کو ایک مختصر جملہ میں یوں واضح فرمایا کہ:۔ حَسَنُ الْبَرِّ خَالٍ فِي عَقُولِهِمْ وَعُقُولُ النِّسَاءِ فِي حُسْنِهِمْ (بحار الانوار ج ۱) یعنی مردوں کا حسن ان کی عقلوں میں مضمر ہے اور عورتوں کی عقلیں ان کے حسن کے پردہ میں ہیں؟ اس جملہ کی کئی توجہیں ہو سکتی ہیں۔ (۱) مرد کے لئے جو ہر انتخاب جو اس کی امتیازی حیثیت کا نشان ہے وہ عقل ہے یعنی مرد عقل و خود ہے اپنی محبوبیت

کا سکے جاسکتا ہے اور اس کی دانائی و عقلندی ہی اس کا طرہ کمال اور زیور حسن ہے لیکن بخلاف اس کے عورت کا جو ہر امتیاز جو اس کی قدر و قیمت کا موجب ہے وہ حسن ہے یعنی عورت کی خوبصورتی ہی اس کی محبوبیت کی علمبردار ہے اور اس کا حسن و جمال ہی اس کی دلاویزی کی جان اور اس کی برتری کا نشان ہے۔

(۲) مرد کے لئے مائتہ ناز اور سرمایہ افتخار عقل ہے اور اسی عقل و دانش کے بل بوتہ پر ہی مرد و مردوں پر سبقت لے جانے کے اہل ہوتا ہے لیکن بخلاف اس کے عورت کا معیار سبقت اور مدار رفعت حسن ہوتا ہے اور وہ صرف حسن و صورت کی بنا پر ہی معرض افتخار میں قدم رکھ سکتی ہے۔

(۳) مرد کے عقل و دانش سے اس کی حسن و خوبی منظر عام پر آتی ہے لیکن عورت کے حسن منظر سے متاثر ہو کر اس کے عقل و خرد سے چشم پوشی کی جاتی ہے۔

(۴) مرد کی دانشمندی اس کو اپنے فرائض سے روشناس کراتی ہے اور عورت کا حسن اس کو اپنے فرائض سے غافل کرنے کا موجب بنتا ہے۔

(۵) مرد عقل کو اپنے مقبول عام ہونے کا ذریعہ قرار دیتا ہے اور عورت کی عقل اس کو صرف اپنے حسن ظاہری کے اضافہ کی دعوت دیتی ہے یعنی مرد کی سوچ سچا اپنی دنیوی یا اخروی فلاح و بہبود میں ہوا کرتی ہے جو اس کا حقیقی حسن ہے اور عورت کی تمام تر غور و فکر اپنے بناؤ سنگار میں صرف ہوتی ہے جو اس کی ظاہری چاہت کا ہی ذریعہ ہے۔

پس ہر دو فریقین کو اپنے مقام پر رہنا ہی زیبائش دیتا ہے لہذا عورت کا اپنے مخصوص فرائض کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہی اس کی شرافت اور فطری خوبی ہے لہذا اسے غلامی سے تعبیر کرنا نااندریشی ہے بلکہ اس کا اپنی حدود متعینہ سے گذر کر مردوں کے دوش بدوش رہنے کا جذبہ اس کی فطرت سے کھلی ہوئی بغاوت اور نافرض شناسی ہے اور اس کے اس خیال کو نظریہ آزادی قرار دینا انتہائی کورباطنی ہے جو مرد و عورتوں کو اس نام نہاد نظریہ آزادی کی طرف لانے کی فکر میں ہیں۔ وہ صرف اپنی خواہشات کا اٹو سیہا کرنے کے لئے ان کی بھولی بھالی عقلوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے درپے ہیں اور جو عورتیں اس دام تزویر میں پھنس کر اس غلط نظریے کو اپنی آزادی کا پیش خیمہ سمجھتی ہیں۔ انہیں صرف دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔

مردوں کو چاہئے کہ وہ عورتوں کو اپنے جائز اور اسلامی حقوق سے محروم نہ کریں اور انہیں اپنی شرعی حدود میں رہ کر اپنے فرائض نسوانی سے روشناس کرائیں۔ مردوں کا عورتوں پر بے جا تشدد اور ناقابل برداشت رویہ ہی ان کو خدا اور رسول کے احکام سے باغی ہونے پر آمادہ کرتا ہے۔ مرد چونکہ بہت سے امور خانگی سے فارغ ہوتا ہے اس لئے اگر جسمانی قوت اور مالی وسعت اسے اجازت دے تو ایک سے زیادہ بیویاں کر سکتا ہے جن کی حد چار تک ہے بشرطیکہ وہ اپنے عادلانہ رویے سے ان کی حق تلفی نہ کرے لیکن عورت امور خانہ داری اور بال بچوں کی تربیت میں گھر گھر اس قدر مشغول الزمہ ہو جاتی ہے کہ وہ صرف ایک

ہی مرد کی ذمہ داریوں کا بوجھ مشکل اٹھا سکتی ہے لہذا اس کے لئے بیک وقت صرف ایک ہی مرد سے نکاح کرنے کی پابندی ہے تو مرد کے لئے متعدد ازواج کا جواز اور عورت کے لئے صرف ایک مرد کی پابندی ایک فطری تقسیم ہے اس کو مرد کی آزادی اور عورت کی قید سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ اگر نظر غائر سے دیکھا جائے اور عورت و مرد ہر دو کے فرائض کا جائزہ لیا جائے تو ہر دو اپنے مقام پر آزاد ہیں اور اگر فرائض و ذمہ داریوں کو بالائے طاق رکھ دیا جائے تو دونوں مقید ہیں۔

اگر عورت کے لئے یہی قید ہے کہ وہ صرف ایک ہی مرد سے نکاح کر سکتی ہے تو کیا مرد اس امر کا مقید نہیں کہ وہ عورت کے تمام لوازمات زندگی جتیا کرے۔ جہاں مرد ایک نکاح کی قید سے آزاد ہے وہاں عورت اپنے لوازمات زندگی کی فکر سے آزاد ہے۔ اگر عورت کے لئے بچوں کی پرورش قید ہے تو مرد کے لئے تمام تر اخراجات کی ادائیگی کی قید بھی تو ہے۔

اگر عورت پر پردہ کی پابندی ہے تو مرد پر اس کے مناسب مکان و رہائش کا بندوبست اور پردہ داری کے جملہ اسباب کی فراہمی کی پابندی ہے۔

پس عورت کی پابندی عورت کی شان کے مطابق ہے اور مرد کی پابندی مرد کے رتبہ کے ماتحت ہے اور دونوں پابندیاں اپنے مقام پر مزدوں ہیں جو پابندی عورت پر عائد ہے اس سے مراد آزاد ہے اور جو قید مرد کے لئے ہے اس سے عورت کو آزادی حاصل ہے۔

عورت چونکہ صرف اپنی پابندی کو مد نظر رکھتی ہے اور مرد کی پابندیوں کا اسے احساس نہیں ہوتا اس لئے وہ سمجھتی ہے کہ مرد آزاد ہیں اور بخلاف اس کے مرد عورتوں کو آزاد سمجھتے ہیں لہذا عورتیں اپنے حدود پھلانگ کر مردوں کے فرائض منہا میں خوشی محسوس کرتی ہیں اور مرد اپنے فرائض کو بار خاطر قرار دیکر عورتوں کے نام نہاد نظریہ آزادی کی تائید کرتے ہیں۔ اس میں ان کو دو فائدے نظر آتے ہیں ایک تو عورت کے اپنے اخراجات سنبھال لینا ان کے لئے غنیمت ہے اور دوسرے جذبہ شہوانیت کی تسکین اس سے اچھی طرح ہو سکتی ہے۔ بہر کیف عورت کے لئے یہ نام نہاد آزادی صرف عورت ہی کے لئے قید و رقبہ ہے کیونکہ امور خانہ داری اور بچوں کی نگہداری کا بوجھ تو ویسے کا ویسا ان کے سر پر رہتا ہے اور مزید برآں جو اخراجات مرد پر عائد تھے وہ بھی اب اس کے اپنے اُد پر آ جاتے ہیں۔

پس خدا کا قانون وہ قانون ہے جس کو تاقیامت غلط ثابت نہیں کہا جاسکتا اور قرآن مجید میں خدا نے مردوں اور عورتوں کو اپنے جن جن حدود کے اندر پابند رہنے کا حکم دیا ہے وہی ہر دو کی دنیا و آخرت کی کامیابی و بھلائی کی ضامن ہیں۔

الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ ۖ فَاِذَا مَسَّكَ بُعْرُوفٌ اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ ۖ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ

طلاقِ رجعی دو مرتبہ ہے پھر یا تو اس کو رکھ لے خیر و خوبی کے ساتھ اور یا جانے دے ساتھ احسان کے اور ناجائز ہے تمہارے

تَاْخُذُوْا مِنْهَا اَتِيْمًا ۚ وَهُنَّ شَيَاْءٌ اِلَّا اَنْ يَّخَافَا اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ

لئے کہ ان چیزوں میں سے جو ان کو تم دے چکے ہو، کچھ بھی مگر یہ کہ دونوں ڈریں اس بات سے کہ قائم نہ کر سکیں گے اللہ کی حدود کو پس

خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَاجِئًا عَلَیْهِمَا فَمِمَّا افْتَدَتْ بِهٖ ۚ تِلْكَ حُدُوْدُ

اگر تمہیں ڈر ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہ کر سکیں گے۔ پس (دو ہی صورت) ان دونوں پر گناہ نہیں اس چیز میں جو عورت فدیہ دے یہ اللہ کی

اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ ﴿۲۱۹﴾

حدیں ہیں پس ان سے آگے نہ بڑھو اور جو اللہ کی (سیما کردہ) حدود سے بڑھے۔ پس وہی لوگ ظالم ہیں۔

رُكُوْع ۱۳

طلاق عدت اور طلاق سنت کا طریقہ

الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ ۖ۔ اگر کوئی شخص اپنی عورت بدخولہ کو شرائط کے ساتھ طلاق دے تو عدت کے اندر وہ اس عورت کی طرف رجوع کر سکتا ہے اور وہ عورت اس پر بغیر نکاح جدید کے حلال ہے پس اگر عدت کے اندر رجوع کر لے اور پھر شرائط کے ساتھ اس کو طلاق دے دے تو اب بھی عدت کے اندر اس کو عورت کی طرف رجوع کرنے کا حق حاصل ہے پس اگر رجوع کر لے تو عورت کی اب وہ طلاقیں پوری ہو گئیں اب حکم یہ ہے کہ اگر نیکی کے ساتھ اور خوش اسلوبی سے عورت کو اپنے نکاح میں باقی رکھے اور نان و نفقہ وغیرہ میں اس کو تنگی نہ دے تو وہ اس کی عورت ہے ورنہ اس کو تیسری دفعہ شرائط کے ساتھ طلاق دے دے اور اس طلاق کے بعد وہ مرد اس عورت کی طرف رجوع نہیں کر سکتا اور یہ طلاق طلاق بائن ہو جائے گی۔ عدت گزرنے کے بعد عورت کو اختیار ہے کہ جس مرد سے چاہے نکاح کر لے لیکن اس طلاق دینے والے سے اس کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ ہاں البتہ اگر عورت نے اس طلاق بائن کے بعد کسی دوسرے مرد کے ساتھ نکاح کر لیا اور اس مرد نے اپنی خوشی و رضامندی کے ساتھ اس کو طلاق بائن بطریق سابق دیدی یا طلاق رجعی دی اور عدت کے اندر رجوع نہ کیا یا وہ مرد مر گیا تو اس کی عدت گزرنے کے بعد وہ عورت پہلے طلاق دینے والے مرد کے

ساتھ نکاح کر سکتی ہے اس طلاق کو اصطلاح میں طلاق عدت کہا جاتا ہے۔
 اور اگر مرد عورت کو شرائط کے ساتھ طلاق دے اور عدت کے اندر رجوع نہ کرے تو عدت گزرنے کے بعد وہ مرد عورت کے ساتھ نکاح جدید کر سکتا ہے۔ پس اگر عدت کے بعد وہ مرد اس عورت سے نکاح کر لے اور پھر شرائط کے ساتھ طلاق دے دے اور عدت کے اندر رجوع نہ کرے بلکہ بدستور سابق عدت کے بعد اسی عورت سے پھر نیا نکاح کر لے تو اس عورت کی دو طلاقیں مکمل ہو گئیں اب اگر اُسے اپنے نکاح میں باقی رکھے اور حسن سلوک سے گزارہ کرتا رہے تو ٹھیک در نہ اب تیسری دفعہ جو طلاق دے گا یہ طلاق بائن ہوگی اور اس کے بعد نہ عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے اور نہ عدت کے بعد اس عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔ مگر اسی پہلی طرح کہ وہ عورت نیا شوہر کر لے اور وہ شوہر بشرط اس کو طلاق بائن دے یا طلاق رجعی دے کر عدت کے اندر رجوع نہ کرے یا وہ مرد مر جائے تو اس کی عدت گزرنے کے بعد وہ عورت پہلے طلاق دینے والے مرد کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے اور اس قسم کی طلاق کو اصطلاح میں طلاق سنت کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید کا فرمان :- اَلطَّلَاقُ مَثَلَتَانِ :- طلاق عدت اور طلاق سنت ہر دو پر صادق ہے اور طلاق کے مذکورہ بالا دونوں طریقوں میں سے طلاق سنت کو افضل کہا گیا ہے۔
 مسئلہ :- اگر مرد عورت کو مذکورہ بالا دونوں طریقوں میں سے ایک طریقہ پر تین طلاقیں دے دے اور پھر عورت کے نئے شوہر کی طلاق یا موت کے بعد پھر اُسی عورت سے نکاح کر لے اور پہلے کی طرح پھر اس کو تین طلاق دیدے اور پھر عورت کے نئے شوہر کی طلاق یا موت کے بعد اس سے نکاح کرے لیکن پھر اُسی طرح اُس کو تین طلاق دے دے۔ تو اب تیسری بار طلاق بائن ہو چکنے کے بعد وہ عورت اس مرد پر حرام ہو جائے گی اور کسی صورت میں وہ اس مرد کے نکاح میں نہ آسکے گی۔

مسئلہ :- اگر طلاق دینے والا بیک مرتبہ، تین مرتبہ طلاق کا صیغہ جاری کر دے تو وہ تین طلاقیں نہ ہونگی بلکہ طلاق صرف ایک ہوگی جو پہلی مرتبہ صیغہ جاری کرنے سے ہو گئی باقی دو دفعہ کا صیغہ لغو ہے کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے :-

اَلطَّلَاقُ مَثَلَتَانِ

مسئلہ :- بلاوجہ طلاق دینا مکروہ ہے اور اگر مرد عورت کے تعلقات آپس میں اچھے نہ ہوں تو طلاق دینا سنت ہے جبکہ اتفاق کی صورت کی بالکل کوئی اُمید نہ ہو اور گناہ میں واقع ہونے کا ڈر ہو۔

طلاق کی شرائط

مسئلہ :- طلاق میں چار چیزوں کو دخل ہے (۱) صیغہ (۲) طلاق دینے والا (۳) وہ عورت جس کو طلاق دی جائے۔

(۴) دو عادل گواہ

مسئلہ ۱۔ اگر مرد عورت کو طلاق دینا چاہے اور عورت سامنے موجود ہو تو کہے :- اَنْتِ طَالِقٌ اور اگر عورت سامنے موجود نہ ہو تو کہے :- زَوْجَتِيْ فَلَانَہُ (اس کا نام لے) طَالِقٌ :- اگر اس کی عورت صرف ایک ہو تو نام لینے کی ضرورت نہیں ہے اگر خود صیغہ طلاق جاری نہ کر سکتا ہو تو کسی صیغہ پڑھ سکے والے کو اپنا وکیل بنائے پھر اس کا وکیل یوں کہے :- زَوْجَۃُ مُوَحَّجٍ فَلَانَہُ (عورت کا نام لے) طَالِقٌ :- اگر عورت اس کی صرف ایک ہو تو نام لینے کی ضرورت نہیں :- اور اگر نام لے بھی لے تو حرج نہیں :-

ایک زوجہ ہونے کی صورت میں بغیر نام لے خود طلاق کا صیغہ پڑھے تو کہے :- زَوْجَتِيْ طَالِقٌ اور وکیل پڑھے تو کہے :- زَوْجَۃُ مُوَحَّجٍ طَالِقٌ :-

مسئلہ ۲۔ طلاق دینے والے مرد میں چند شرائط ضروری ہیں :-

۱) بالغ ہو، لہذا نابالغ کی طلاق صحیح نہیں ہے :-

۲) عاقل ہو، لہذا دیوانہ آدمی کی طلاق صحیح نہیں ہے۔ مصلحت کی رعایت کرتے ہوئے باپ یا دادا دیوانے آدمی کی طرف سے طلاق دے سکتے ہیں، جبکہ اس کی دیوانگی دائمی اور لاعلاج ہو۔ اسی طرح نابالغ بچہ بھی اگر بعد از بلوغ فاسد العقل ثابت ہو تو اس کی طرف سے بھی باپ یا دادا طلاق دے سکتے ہیں اور باپ دادا کی عدم موجودگی میں حاکم شرعی کو اختیار حاصل ہے :-

شہید ثانیؒ نے فرمایا ہے کہ گواہ حدیث میں یہ چیز صراحت سے مذکور نہیں، لیکن فخر المحققین نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے :- لہذا یہی قوی ہے بلحاظ حجیت کے :-

۳) فحار ہو :- لہذا جس شخص کو طلاق پر مجبور کیا جائے اور وہ جبر و تشدد کے ڈر سے صیغہ طلاق جاری کرے :- تو یہ طلاق صحیح نہ ہوگی اور تشدد اور جبر سے مراد یہ ہے کہ اس کو طلاق نہ دینے پر جانی یا مالی یا عزت کے نقصان کی دھمکی دی جائے اور دھمکی دینے والا ایسا کر بھی سکتا ہو، جانی نقصان خواہ قتل کی دھمکی ہو خواہ زود کو بک کی خواہ قید وغیرہ کی ہو اور مالی نقصان کی دھمکی خواہ تھوڑے مال کی ہو یا زیادہ کی ہو اور عزت کا نقصان خواہ اس کی ناموس پر دست درازی کی دھمکی ہو یا گالی گلوچ اور فحش کا اس کو ڈر ہو :- بہر کیف وہ چیز جو شان اور حالت کے اعتبار سے اس کے لئے قابل برداشت نہ ہو :-

۴) ارادہ ہو :- اگر مجبور کر یا حالتِ خواب میں یا ویسے غلطی سے صیغہ طلاق منہ پر جاری کرے تو وہ طلاق شمار نہ ہوگا اسی طرح غصہ کی حالت میں اگر منہ سے طلاق کا صیغہ جاری کرے اور قصد طلاق کا نہ ہو :- تو یہ بھی طلاق نہیں ہوگی :- اور صیغہ طلاق جاری کرتے وقت قصد انشاء ضروری ہے ورنہ طلاق واقع نہ ہوگی :-

مسئلہ ۱۔ جس عورت کو طلاق دی جائے اس کے لئے ضروری ہے کہ نکاح دائمی والی ہو اور اگر وہ مدخلہ غیر حاملہ ہو اور مرد بھی حاضر ہو تو ضروری ہے کہ حیض و نفاس سے پاک ہو لیکن عورت غیر مدخلہ یا حاملہ یا جس کا شوہر غائبانہ حالت میں طلاق دے رہا ہو یا اگر حاضر ہو بھی لیکن عورت کے حالات تک رسائی نہ رکھ سکتا ہو تو ایسی عورت کی طلاق میں اس کا حیض و نفاس سے خالی ہونا شرط نہیں ہے۔

مسئلہ ۲۔ حاملہ عورت کو طلاق دی جاسکتی ہے اور اس کی عدت بچہ کی پیدائش پر ختم ہوگی خواہ کم مدت ہو یا زیادہ۔
مسئلہ ۳۔ طلاق کا صیغہ جاری کرتے وقت دو عادل گواہوں کا موجود ہونا اور ان کا سننا ضروری ہے اور بغیر اس کے طلاق صحیح نہیں ہو سکتی۔

طلاق عقل کی روشنی میں

اسلام کے مطابق فطرت قوانین کے ناقابل تفسیح ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسی مصلحتوں اور خوبیوں کے پیش نظر خالق کی طرف سے وضع شدہ ہیں کہ تاقیات انکا مصلحتی پہلو اضمحلال پذیر نہیں ہو سکتا۔ من جملہ انہی قوانین کے اسلام نے مرد و عورت کے باہمی تعلقات کی ناشگفتگی کی صورت میں تعلق زرجیت کو ختم کر دینے کا حکم صادر فرمایا ہے جسے طلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے اسلام نے اسی قانون کی روش سے ازدواجی زندگی سے ان ناخوشگوار خدشات کا ازالہ فرمادیا ہے جو طلاق کے غیر مروج ہونے کی صورت میں مرد و عورت کو پیش آتے تھے۔ جن سے ہر دو کی زندگی انتہائی بد مزگی سے بھر پوری تھی اور ازدواجی تعلق ہر دو کے لئے حلق کا کاٹنا بن کر جان لیوا ہو جاتا تھا۔

اسلام یہ چاہتا ہے کہ مرد و عورت کی زندگی میں ایسی مسرت افزا اور قلب پرور روح موجود ہو کہ ان کا ہر مرحلہ باہمی انس اور پیار سے معمور ہو، ان کا دل باہمی تعاون کے پر غلوص جذبات کا آئینہ دار ہو اور ان کا ظرف خاطر آپس کی ہمدردی اور غیر خواہی کی بے پناہ دولت سے لبریز ہو، محبت سے اٹھنا بیٹھنا ہو اور پیار کا رہنا سہنا ہو۔ تاکہ ان کے دل و دماغ ہر قسم کی دنیاوی الجھنوں سے مطمئن ہو کہ اللہ کی نعمات کا شکریہ ادا کر سکیں، مرد کا عورت کے ساتھ خلوص ایسا ہو کہ عورت خواہ ہزار اذیتوں و جھوم میں گرفتار ہو۔ لاکھ غم و اندوہ میں تڑپ رہی ہو لیکن جب ہی اس کی نظر مرد کے چہرہ پر پڑے تو اس کی ساری کوفت دور اور غم کا فور ہو جائے اور عورت بھی ایسی صاحب دانا اور باحیا اور مرد کی غمگسار ہو کہ مرد کی دن بھر کی تنہکان کو اس کی ایک سادہ سی لبوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ راہ گیر ملک عدم کر دے اور اسی قسم کے مضامین کی احادیث بھی خانوادہ عصمت سے وارد ہیں۔

پس اسی بنا پر اسلام نے مرد و عورت ہر دو کی آزادی اور غیر خوشی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے قبیل زرجیت کو بے کلید نہیں بنایا بلکہ اگر مرد و عورت کے تعلقات میں سازگارئی کی کوئی صورت نہ ہو، آپس کا باہمی رجحان منفق و ہر

إِلَّا أَنْ يَخَافَا^۱ بِهٖ مِثْلُ حَكْمٍ مِنْهُ اسْتِثْنَاءٌ هِيَ يَعْنِي دَلِيلٌ أَوْ طُلُقٌ وَبَيْنَهُ وَالْأَمْرُ عَوْرَتٍ مِنْ كُنَى دُمًى هُوَتْ جَنْزٍ كَوَالِسٍ
مَنْحِينَ لَمْ يَكُنْ مَكَّنًا۔ مگر ایک صورت میں اور وہ یہ کہ دونوں کو یقین ہو کہ وہ بغیر طلاق کے اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے
ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ مراد یہ ہے کہ عورت سے نشوز یعنی مرد کی نافرمانی اور مرد کے حق میں بد اخلاقی ظاہر ہو اور
روایاتِ آئمہ طاہرین علیہم السلام میں ہے کہ جب عورت مرد کو کہے کہ میں تیرے اذن کے بغیر گھر سے باہر جاؤں گی اور
تیری خواہگاہ پر غیر کولائوں گی اور تیرے لئے جنابت سے غسل نہ کروں گی۔ یا یہ کہے کہ میں تیری اطاعت نہ کروں گی یہاں تک

کہ مجھے طلاق دے دے تو ان حالات میں مرد کے لئے عورت سے فدیہ لے کر طلاق دینا جائز ہے۔
پھر اختلاف اس میں ہے کہ ایسی صورت میں مرد عورت سے فدیہ صرف وہی چیز لے سکتا ہے جو پہلے مہر میں اس کو دے چکا ہو۔ یا اپنے دیئے ہوئے سے فدیہ زیادہ بھی لے سکتا ہے؛ تو اس میں علمائے امامیہ نے دو صورتیں بیان فرمائی ہیں:-

- (۱) اگر نافرمانی صرف عورت کی طرف سے ہو اور وہ مرد کے ساتھ آباد ہونا پسند نہ کرتی ہو تو اس صورت میں مرد کے لئے اپنے دیئے ہوئے حق مہر سے زیادہ چیز وصول کرنا جائز ہے اور اس کو خلع کہا جاتا ہے۔
- (۲) اور اگر بغض و ناراضگی ہر دو طرف سے ہو اور دونوں ایک دوسرے کو نہ چاہتے ہوں اور اللہ کی حدود کو توڑنے کا دونوں سے خطرہ ہو تو اس صورت میں مرد عورت سے صرف اسی قدر وصول کر سکتا ہے جس قدر اس کو دے چکا ہو اور اس کو مبارات کہا جاتا ہے۔

مسئلہ:- خلع اور مبارات کا صیغہ جاری کرتے وقت انہی شرائط کا ہونا ضروری ہے جو طلاق کے صیغہ کے وقت معتبر ہوا کرتی ہے۔ نیز خلع اور مبارات کے صیغہ میں طلاق کا ذکر کرنا بھی لازمی ہوا کرتا ہے۔

خلع کا صیغہ | خلع کرنے والا مرد عورت کو یوں کہے - **خَلَعْتُكَ عَلَى كَذَا** (یہاں فدیہ کا ذکر کرے) **فَأَنْتِ طَالِقٌ**۔ یا کہے - **اخْلَعْتُ زَوْجَتِي فَلَانَةَ** (نام عورت کا) **عَلَى كَذَا** (ذکر فدیہ کرے) **فَهِیَ طَالِقٌ** اور اگر مرد کی طرف سے وکیل ہو تو کہے - **اخْلَعْتُ زَوْجَةَ مُوَکَّلِی (فلانہ نام عورت) عَلَى كَذَا** (ذکر فدیہ) **فَهِیَ طَالِقٌ**۔

مبارات کا صیغہ | مرد عورت کو کہے - **بَارَأْتُكَ عَلَى كَذَا** (ذکر فدیہ) **فَأَنْتِ طَالِقٌ**۔ یا کہے - **بَارَأْتُ زَوْجَتِي فَلَانَةَ** (نام عورت) **عَلَى كَذَا** (ذکر فدیہ) **فَهِیَ طَالِقٌ**۔ مرد کا وکیل ہو تو کہے **بَارَأْتُ زَوْجَةَ مُوَکَّلِی (نام عورت) عَلَى كَذَا** (فدیہ) **فَهِیَ طَالِقٌ**۔

مسئلہ:- خلع کی صورت میں اگر عورت فدیہ کی طرف رجوع کرے تو پھر مرد کو بھی عورت کی طرف عدت کے اندر رجوع کا حق حاصل ہے اور مبارات کی صورت میں بھی یہی حکم ہے اور عدت گزر جانے کے بعد نہ عورت کو فدیہ کی طرف رجوع کرنے کا حق ہے اور نہ مرد کو عورت کی طرف رجوع کا حق باقی رہتا ہے۔

مسئلہ:- خلع یا مبارات کی طلاق میں عدت گزرنے کے بعد وہ مرد اس عورت کے ساتھ نکاح جدید کر سکتا ہے کیونکہ یہ طلاق ایک طلاق ہے اور اسی قسم کی تین طلاقیں کے بعد طلاق بائن ہوگی۔ پس وہ مرد اس عورت سے پھر نکاح نہ کر سکے گا۔

مگر یہ کہ وہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی کر لے اور وہ باشرائط اس کو طلاق دے دے یا مرجائے۔ تو عدت کے بعد یہ مرد اس سے نکاح کر سکتا ہے چنانچہ بعد والی آیت میں اسی کو بیان کیا جا رہا ہے۔

شان نزول | جمیلہ بنت عبداللہ۔ ثابت بن قیس کی زوجہ تھی اور اپنے شوہر کو ناپسند کرتی تھی چنانچہ وہ جناب رسالت کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی اور عرض کی کہ گو میں اپنے شوہر میں دینی یا اخلاقی کوئی عیب نہیں پاتی اور اسلام قبول کرنے کے بعد میں خدا کی نافرمانی کو ناپسند کرتی ہوں لیکن میرا شوہر چونکہ سیاہ رنگ، کوتاہ قد اور بد صورت ہے لہذا میں اس کے ساتھ کسی صورت میں ہمبستر ہونا گوارا نہیں کرتی رہیں میرا شوہر مجھے طلاق دے دے تو ٹھیک ہے کیونکہ اس کے طلاق نہ دینے کی صورت میں مجھے خدا کی نافرمانی میں پڑنے کا ڈر ہے (ثابت دل سے اس کو طلاق دینے پر آمادہ نہ تھا۔ پس یہ آیت اتری۔ ثابت نے کہا کہ مجھے اپنا مہر واپس کر دے (اور وہ ایک باغ تھا) حضرت رسول خداؐ نے جمیلہ سے دریافت فرمایا کہ تو اسے وہ باغ واپس کر دے گی۔ اس نے عرض کی کہ حضور! وہ باغ بھی واپس کرتی ہوں اور کچھ زائد بھی دوں گی (مہر کیف یہ مجھے طلاق دے) آپ نے فرمایا کہ بس تو زائد نہ دے بلکہ وہی باغ واپس دے دے۔ پس عورت نے باغ واپس دیا اور ثابت نے اس کو طلاق دے دی۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْمَا افْتَدَتْ بِهِنَّ۔ یعنی طلاق خلع کی صورت میں عورت جس قدر بھی فدیہ دے عورت اور مرد دونوں پر اس کا کوئی گناہ نہیں ہے، نہ عورت کو دینے میں گناہ ہے اور نہ مرد کو لینے میں گناہ ہے۔

بَلَلَفَ حَدُّهُ اَللّٰہُ۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں (یہاں مراد حد و دسے خلع، طلاق، رجوع اور عدت وغیرہ ہیں۔ جو لوگ اس امر کے قابل ہیں کہ مرد اگر بیک وقت عورت کو تین دفعہ طلاق کہہ دے تو وہ طلاق بائن ہو جاتی ہے اور مرد اس کی طرف رجوع نہیں کر سکتا جب تک کہ عورت نکاح طیفہ نہ ہو)

دوسرا مرد کر کے اس سے طلاق نہ حاصل کر لے۔ آیت جمیلہ الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ان کے مسلک کو کھلے اور غیر مبہم بیان سے باطل کر رہی ہے۔ کیونکہ آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ طلاق دو مرتبہ ہے کہ ہر مرتبہ طلاق کے بعد مرد کو رجوع کرنے کا اختیار حاصل ہے چنانچہ فرماتا ہے کہ فَاِنْ مَسَاكٌ مِّمَّعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ يَّحْسَنُ۔ یعنی یا تو اس کو خیر و خوبی سے اپنے پاس رکھ لے اور یا احسان و نیکی کے ساتھ جانے دے اگر ایک وقت میں تین طلاق کہنے سے طلاق بائن ہو جاتی تو رجوع کرنے کا قصہ ہی باقی نہ رہتا۔ لہذا فَاِنْ مَسَاكٌ مِّمَّعْرُوْفٍ الخ کے ذکر کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

پس معلوم ہوا کہ تین طلاقیں کی صورت قرآن کے مطابق وہی ہے جو مذہب شیعہ نے بتلائی ہے۔ جس کی قدرے تفصیل گزشتہ صفحات میں بیان کی جا چکی ہے اب ان دو طلاقیں کے بعد تیسری دفعہ جو طلاق دے گا۔ وہ طلاق بائن ہوگی جس کو اگلی آیت میں بیان کیا جا رہا ہے۔

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدِ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرًا فَإِنْ طَلَّقَهَا

پس اگر تیسری مرتبہ اس کو طلاق دے تو وہ عورت اس پر پھر حلال نہ ہوگی جب تک کہ وہ نکاح نہ کر لے کسی اور مرد سے

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ وَتِلْكَ

اس کے علاوہ۔ پس اگر وہ دوسرا شوہر اپنی مرضی سے اس کو طلاق دے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ آپس میں رجوع کر کے نکاح کر لیں بشرطیکہ ان کو تسلی ہو کہ اللہ

حُدُودَ اللَّهِ يَبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿۲۳۰﴾

کی حدود کو قائم کرے گا اور یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدیں ہیں جنکو بیان فرماتا ہے اس قوم کیلئے جو جانیں۔

طلاق بائن

فَإِنْ طَلَّقَهَا پہلے دو رجعی طلاقوں کا ذکر تھا اور یہ تیسری طلاق کا ذکر ہے یعنی اس طلاق کے بعد مرد کو عورت کی طرف نہ عدت کے اندر رجوع کرنے کا حق ہے اور نہ عدت کے بعد نکاح کرنے کا حق ہے جب تک کہ کسی اور مرد کے نکاح میں نہ جائے پس وہ دوسرا مرد اگر اپنی خوشی سے اس عورت کو طلاق دے دے تو اس کی عدت کے بعد وہ عورت اگر چاہے تو پہلے مرد کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے۔ یہاں يَتَرَاجَعَا سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ عورت پہلے مرد پر صرف رجوع کرنے سے حلال ہو جائے گی بلکہ مقصد یہ ہے کہ اگر وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف رجوع کر کے نکاح جدید کر لیں تو ان کے لئے ہائزہ جب کہ اللہ کی حدود کو پورا کر سکنے پر ان کو اطمینان حاصل ہو۔

جو عام مسلمانوں میں رائج ہے اس کا بھی قرآن مجید سے کوئی ربط نہیں کیونکہ اولاً تو بیک وقت حلالہ کا طریقہ

طلاق واقع ہوتی ہے لہذا حلالہ کی ضرورت ہی نہیں بلکہ مرد کو عدت کے اندر بحکم خدا رجوع کرنے کا حق حاصل ہے اور اگر بالقرآن طلاق بائن بھی ہوتی ہے تو قرآن کی رو سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دوسرا شوہر اپنی مرضی سے طلاق

دیدے تو پہلا مرد اس عورت کو نکاح میں لے سکتا ہے۔ یہ کہیں نہیں کہ دوسرا مرد پہلے سے ہی طلاق کا پابند کر لیا جائے جیسا کہ ماہر زبان یہ فرمے ہے لہذا دوسرے نکاح کرنے والے سے پہلے شرط کر لینا کہ عورت سے ہیستری کر کے بعد میں اس کو طلاق کرنا ہوگا۔

قرآنی فیصلہ کے خلاف ہے۔

نیز دوسرے شوہر کی طلاق کے بعد بغیر انتظار عدت گزرنے کے فوراً پہلے مرد کے ساتھ نکاح جدید پڑھا جانا غلط ہے کیونکہ قرآن مجید میں مطلقاً مطلقہ عورت پر تین طہر یا بقول حنفیہ تین حیض عدت کی انتظار واجب ہے جس طرح رکوع تلا

میں بیان ہو چکا ہے اور چونکہ مذہب شیعہ قرآنی احکام کی تفصیل اور آیات قرآنیہ کی تشریح صرف ان پاک ہستیوں سے حاصل کرتا ہے جو قرآن مجید کے حقیقی وارث اور عالم ہیں لہذا ان کی فقہی کتب اس قسم کے بے بنیاد و شرمناک فتاویٰ سے پاک و منترہ ہے۔

اور جناب رسالت کا تاکیہ بی فرمان: **إِنِّي تَارِكٌ فِي كُذِّ الشَّقَائِيْنَ** جس کو ہم نے کتاب کی جلد اول میں یعنی مقدمہ تفسیر میں متعدد عنوانات کے تحت فریقین کی کتابوں سے نقل کیا ہے اسی نکتہ کے ماتحت تھا کہ لوگ دامن اہلبیت کو چھوڑ کر راہ حق سے ہٹک نہ جائیں اور ظاہر ہے کہ فرمان نبویؐ کو پس پشت ڈال کر لوگوں نے ہر مرحلہ پر ٹھٹھ کر رکھا اور جادہ حق سے کوسوں دُور رہے اور مسئلہ طلاق و حلالہ وغیرہ میں قرآنی تصریحات کے خلاف جانا صرف اسی وجہ سے ہے کہ اہلبیت عصمت اور دو دمان رسالت سے علم قرآن حاصل نہ کیا گیا۔

مسئلہ ۱۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ اگر ایک مرد عورت کو طلاق بائن دیدے اس کے بعد کوئی دوسرا شخص اس عورت سے متعہ کرنے تو متعہ کی مدت گزرنے کے بعد وہ عورت پہلے مرد کے نکاح میں آسکتی ہے؟ آپ نے فرمایا: کہ نہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ خدا فرماتا ہے: **فَإِنْ طَلَّقَهَا** یعنی اگر دوسرا مرد اس کو طلاق دے تب پہلے کے نکاح میں آسکتی ہے اور نکاح متعہ میں چونکہ طلاق ہے نہیں لہذا یہاں دوسرے نکاح کرنے والے سے مراد نکاح دائمی ہے نہ کہ نکاح متعہ۔ تفسیر برہان میں اس مضمون کی متعدد احادیث منقول ہیں۔

عورت کی ضرر رسانی سے باز رہنے کا حکم | مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر خداوند کریم نے پھر مرد کو بلند حوصلگی اور منصف مزاجی کے ساتھ خاتمی معاملات میں اسلئے کردار پیش کرنے کی دعوت دی ہے کہ جب تم عورتوں کو طلاق رجمی دو اور عورتیں عدت ختم ہونے کے نزدیک پہنچ جائیں تو اب تم کو چاہیے کہ یا تو رجوع کر کے نیکی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ان کو اپنی زوجیت میں رکھ لو، ورنہ ان کو چھوڑ دو یعنی ان کو عدت گزارنے دو تاکہ اس کے بعد کوئی اور شوہر کرنے کے قابل ہوں۔ چنانچہ اگلی آیت میں اس کی تصریح ہے۔ جاہلی رسوم کے ماتحت بعض مرد عورتوں کو بے جا تنگ کرنا ہی اپنی مردانگی تصور کرتے ہیں اور جذبہ شہوانیت کی تکمیل میں بے اعتدالی اور بے راہ روی ہی ان کو اس قسم کے ظالمانہ اقدام کی دعوت دیتی ہے شریعت مقدسہ اسلامیہ نے انسانی جذبات کے منظم و معتدل کرنے میں جس قدر رہنمائی فرمائی یقیناً جملہ ادیان عالم ایسی پاکیزہ تعلیمات سے محروم ہیں جس طرح مرد کو جینے کا حق حاصل ہے اسی طرح عورت کو بھی زندگی کا حق پہنچتا ہے اور عورت مرد کی ازدواجی زندگی چونکہ تعمیر انسانیت کے لئے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے لہذا اس معاملہ میں متدلانہ روش انسانیت پر احسان عظیم ہے جس طرح عورت پر مرد کے جذبات کا احترام ضروری ہے اسی طرح مرد پر بھی شرعی قوانین کے ماتحت عورت کے مفاد کا ملحوظ رکھنا واجب ہے ان دونوں کا ایک دوسرے کے درپے ایذا ہونا صرف ان دونوں کے لئے ہی بربادی کا موجب نہیں ہے بلکہ اس سے ان دونوں کا وجود صحیفہ انسانیت پر ایک بدنامدارخ بن جاتا ہے۔

وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَلْيُغْنِ أَجَلُهُنَّ فَامْكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سِرِّهُنَّ

اور جب طلاق دو عورتوں کو پس عدت گزرنے کو پہنچ جائیں۔ تو یا رکھ لو ان کو (رجوع کر کے) ساتھ نیکی کے یا چھوڑ دو

هُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تَسْكُوهُنَّ ضَرَاءَ التَّعْتُدِ وَأَمَّنْ يَفْعَلْ

ان کو ساتھ نیکی کے اور نہ رکھو ان کو رجوع کر کے واسطے ضرر کے تاکہ ان پر ظلم کرو اور جو ایسا کرے گا

ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا وَاذْكُرُوا

تو تحقیق اس نے ظلم کیا اپنے نفس پر اور نہ کرو خدا کے احکام کی بے قدری اور یاد کرو اپنے اُپر

نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ

اللہ کی نعمت اور جو نازل فرمایا اس نے تم پر کتاب اور علم شریعت کو

يُعِظُكُمْ بِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۲۳۱﴾

اس کے ذریعے تمہیں نصیحت فرماتا ہے اور خدا سے ڈرو اور جانو کہ تحقیق اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

شأن نزول | وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ الخ۔ کہتے ہیں کہ ابتداء میں عربوں کا یہ طریقہ تھا کہ عورتوں کو طلاق دے

دیتے تھے اور جب اس کی عدت ختم ہونے کے قریب ہوتی تھی تو رجوع کر لیتے تھے اور پھر طلاق

دے دیتے تھے اور پھر عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لیتے تھے اور یہی سلسلہ متواتر جاری رکھ کر عورتوں کو بے جا اذیت

پہنچاتے تھے کہ وہ نہایت ہی تلخ زندگی گزارتی تھیں پس ان آیات میں خداوند کریم نے مردوں کو ہدایت فرمائی ہے کہ وہ عورتوں

کو تکلیف پہنچانے کے لئے رجوع نہ کریں بلکہ اچھے طریقے سے رہنے سہنے کے لئے رجوع کریں۔ ورنہ ان کو آزادی سے عدت

گوارہ کر کسی اور جگہ نکاح کرنے کا موقع دیں اور رجوع کا اختیار بھی صرف دو طلاؤں تک ہے کیونکہ تیسری طلاق باطل ہے

وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا الخ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام سے ایک روایت میں منقول ہے۔

کہ جو شخص کسی غنی سے ملے اور اس کے غنی ہونے کی وجہ سے اس کے سامنے جھکے تو گویا اس نے اپنا دو تہائی دین

ضائع کیا اور اس امت میں سے جو شخص خدا کے پڑھنے کے باوجود جہنم میں جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ

اللہ کی آیات کی بے قدری کرتا تھا۔

(بریل)

وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ

اور جب تم طلاق دو عورتوں کو۔ پس عدت کو پہنچ جائیں تو ان کو نہ روکو۔ اس بات سے کہ نکاح کریں

أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضُوا بَيْنَهُم بِالْمَعْرُوفِ ذَلِكَ يُوعَظُ بِهِ

اپنے (سولے والے) شوہروں سے جبکہ وہ آپس میں راضی ہوں ساتھ نیکی کے ان احکام کے ساتھ نصیحت کی

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِإِلَهِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَكُمْ أَزْوَاجُكُمْ

جاتی ہے ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہوں۔ اللہ اور روزِ قیامت پر۔ یہ (قبول نصیحت) تمہارے لئے خوب تر اور پاکیزہ تر ہے

وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۲۳۲﴾

اور خدا جانتا ہے (تمہاری دنیاوی و اخروی بہتریوں کو) اور تم بذاتِ خود نہیں جانتے

شأن نزول

عاصم بن عدی نے اپنی عورت جلاء کو طلاق دی اور عدت کے گزرنے کے بعد اس سے دوبارہ نکاح کرنے کا ارادہ کیا اور عورت بھی دوبارہ نکاح کرنے پر راضی تھی لیکن عورت کے بھائی معقل بن یسار نے اپنی بہن کو دوبارہ پہلے شوہر سے نکاح کرنے سے روک دیا پس یہ آیت نازل ہوئی اور کہتے ہیں کہ اس کے بعد معقل نے اپنی بہن کا عقد پھر عاصم سے کر دیا اس بناء پر وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ کا خطاب عورت کے وارثوں اور ولیوں سے ہے کہ عدت گزارنے کے بعد اگر عورت پھر اپنے اسی شوہر سے نکاح پر راضی ہو جائے تو تمہیں حق نہیں کہ ان کو روکو بلکہ یہ چیز تمہارے لئے زیادہ بہتر اور تمہارے خانگی معاملات میں باعثِ پاکیزگی ہے ورنہ اگر عورت دل سے چاہتی ہو اور اس کے اولیاء اس کو منع کر دیں تو اس کے جذبات مجروح ہوں گے اور ممکن ہے کہ وہ خدا اور رسول کی نافرمانی کر کے اپنی عاقبت بھی خراب کر لے اور خاندان کی ناموس کو بھی داغ دار کرے لہذا اس کو اپنے جائز حق سے محروم نہ کیا جائے تاکہ فعلِ حرام کا خیال اس کے دل میں پیدا ہی نہ ہو۔

علامہ طبرسی نے اس وجہ کو پسند نہیں فرمایا بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ کا خطاب طلاق دینے والوں سے ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب تم عورتوں کو طلاق دو اور ان کی عدت ختم ہونے کے قریب پہنچو تو تمہیں جائز نہیں کہ دوسری جگہ اس عورت کے نکاح کرنے کی روکاوٹ کے لئے اور عورت کو بے جا تکلیف پہنچانے کے لئے رجوع کر لو۔ تاکہ وہ بیچاری بند ہو کر دوسری جگہ نکاح کے قابل نہ ہو۔

مہرِ کیف۔ آیت ہر دو معنوں کا احتمال رکھتی ہے اور مقصد یہ ہے کہ نہ عورت کے وارثوں کے لئے جائز ہے کہ وہ مطلقہ ہونے کے بعد اس کے نکاحِ ثانی پر پابندی عائد کریں خواہ وہ اسی سابق شوہر سے کرے یا کسی نئے شوہر سے

کرے اور نہ طلاق دینے والے کے لئے جائز ہے کہ ضرر پہنچانے کے لئے رجوع کر کے عورت کو نکاح ثانی سے روکے

ناجائز رواج | ہمارے ہاں نہایت غلط اور غیرت سوز بلکہ ایمان ربا ایک رواج ہے اور وہ یہ کہ عورت اور مرد کے درمیان خواہ کتنے ہی تعلقات کشیدہ ہوں اور عورت باہمی اختلاف کی بناء پر خواہ سالہا سال اپنے میکے میں گزار دے تاہم مرد اس کو طلاق دینا اپنی خود ساختہ غیرت کے خلاف سمجھتے ہیں اور بعض مقامات پر اگر مرد طلاق پر آمادہ ہو بھی جائے تو عورت کے میکے والے اس میں اپنی گھٹی سمجھتے ہوئے مرد کو طلاق نہیں دینے دیتے اور ایسی صورت میں اگر مرد طلاق دیدے تو عورت کے خاندان اور مرد کے خاندان درمیان سخت قسم کی منافرت اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے جو بعض اوقات ناگفتہ بہ نتائج تک پہنچ جاتی ہے حالانکہ اس قسم کی غیرت قرآن کی رُو سے بدترین بے غیرتی ہے۔

قرآن کا صاف اور غیر مبہم طور پر کھلے لفظوں یہ حکم موجود ہے کہ اگر عورت اور مرد میں باہمی مصالحت و مفاہمت کی صورت نہ ہو سکتی ہو تو مرد کے لئے ضروری ہے کہ اس کو اپنی قید نکاح سے آزاد کر دے تاکہ ہر دو کی زندگی تلف نہ ہو اور باہمی کشمکش سے کہیں شریعت کی حدود شکنی ان سے نہ ہو اور مرد کا عورت کو ناموافق حالات میں طلاق دے کر آزاد نہ کرنا گناہ کبیر ہے اور شریعت کی حد شکنی ہے اور نیز عورت کے خاندان کا دریں حالات مرد کو طلاق سے روکنا ناجائز اور حرام ہے اور شریعت کی حد شکنی ہے جو کہ گناہ عظیم ہے۔

بعض اوقات مرد عورت کو طلاق دینا بڑا نہیں سمجھتے لیکن صرف عورت کو ایذا دینے کے لئے یا اس لئے کہ عورت اس کے دشمن خاندان میں شادی کر لے گی طلاق نہیں دیتے یہ صورت بھی قرآن کی ہدایت کے سراسر خلاف اور گناہ کبیر ہے۔

بعض اوقات مرد عورت کو طلاق دے دیتے ہیں لیکن عورت کے میکے عورت کو دوبارہ کہیں شادی کرنے سے روک دیتے ہیں اور اسکی دوبارہ شادی اپنی توہین سمجھتے ہیں گوشتہ آیت قرآنیہ کے ظاہر سے انکو اس قسم کی ناجائز حرکات سے باز رہنے کی تلقین کی گئی ہے

مہر کیف طلاق کا خدائی ضابطہ گھر یلو زندگی کی اصلاح و بہبود کے لئے انتہائی طور پر قربی عقل ہے اور اگر اسی قانون خداوندی کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے اور اپنی خود ساختہ غیرتوں اور شیطانی جذباتی خیالات کو خدا کی تعلیم کردہ غیرت اور قرآنی اصلاحی ہدایات کے ماتحت اپنی قوت ایمانی کے ذریعہ کچل کر شاہراہ شریعت پر گامزن ہونے کی جرات کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ انسان کی گھر یلو زندگی پر کیف اور خوشگوار نہ ہو مردوں نے اپنے غلط رویے سے عورتوں کے لئے حیوانیت کی سی بدترین اور تاریک زندگی تجویز کر کے ایک طرف قرآنی ہدایات کی خلاف ورزی کی ہے اور دوسری طرف عورتوں کو مردوں کے خلاف آواز بلند کرنے کا موقعہ دیا ہے جس کے نتائج اور خطرناک ہیں۔

خداوند کریم تمام مومنین کو قرآن و شریعت کے احکام و ضوابط پر چلنے کی توفیق دے تاکہ ہر قسم کے بد نتائج سے محفوظ ہو کر دنیاوی و آخروی زندگی کو سنوار سکیں۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَسَآدَ أَنْ يَتِمَّ الرِّضَاعُ

اور مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو دو سال پورے (یہ مدت) اس کے لئے ہے جو پوری مدت دودھ پلانا چاہے

وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا

اور باپ پر اُن (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا (لازم ہے) ساتھ نیکی کے (مناسب حال) نہیں تکلیف دیا جاتا (خدا کی احکام میں)

وَسَعَهَا لَا تَضَارُّ الْوَالِدَةُ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ وَعَلَى الْوَارِثِ

کوئی شخص مگر بقدر وسعت نہ ضرر دیا جائے ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے اور نہ باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے (اور باپ کی عدم)

مِثْلُ ذَلِكَ فَإِنْ أَسَآدَ إِفْصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُسٍ فَلَا جُنَاحَ

موجودگی میں) جو بچہ کا وارث ہو اس پر اسی جیسے (احکام) ہیں پس اگر دونوں (ماں باپ قبل از مدت) دودھ چھڑانا چاہیں باہمی رضامندی اور

عَلَيْهِمَا مَوَانِ ارْدُتُمْ أَنْ تَسْرِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ

اور مشورہ سے تو پس اُن دونوں کو کوئی گناہ نہیں۔ اور اگر تم (ماں کے علاوہ کسی اور عورت کا دودھ) پلانا چاہو اپنے بچے کو تو تم پر کوئی گناہ نہیں جبکہ تم

مَا أَتَيْتُم بِالْمَعْرُوفِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٣﴾

جو تم نے دینا کیا ہے ساتھ نیکی کے (حسب حال) اور خدا سے ڈرو اور جانو کہ تحقیق اللہ اس چیز کو جو تم کر رہے ہو دیکھنے والا ہے۔

مطلقہ کا حق رضاع اور نان و نفقہ

وَالْوَالِدَاتُ: رضاع کے بیان میں ماں باپ اور بیٹے کے لئے اُم۔ اب اور ابن کا استعمال نہیں کیا گیا۔ بلکہ والدہ والد اور ولد کی لفظوں سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ اُم کا مفہوم والدہ کے مفہوم سے عام ہے اور اب کا مفہوم والد سے عام ہے اور اسی طرح ابن کا مفہوم ولد سے عام ہے چنانچہ دادے اور دادی پر اب اور اُم کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ لیکن انہیں والدہ والدہ نہیں کہا جاسکتا اور پوتے پر ابن کا اطلاق ہوتا ہے لیکن اسے ولد نہیں کہا جاتا۔ پس اس مقام پر چونکہ حکم کا اختصاص صرف ماں باپ اور بیٹے کے ساتھ تھا لہذا ان خاص لفظوں سے تعبیر کیا گیا۔

يُرْضِعْنَ: فعل مضارع کا صیغہ ہے لیکن یہاں امر کے معنی میں ہے یعنی دودھ پلائیں اور اس مقام پر امر استحباب کے لئے ہے کیونکہ ماں پر بچے کا دودھ پلانا واجب نہیں ہے۔ یہاں مقصد یہ ہے کہ بچے کو دودھ پلانے کے لئے پہلے ماں کا حق ہے

اگر وہ نہ پلانا چاہے یا دوسری پلانے والیوں کی بہ نسبت اُجرت زیادہ طلب کرے تو پھر باپ کسی اور دایہ کی طرف رجوع کر سکتا ہے اسی طرح اگر ماں دودھ کی اُجرت طلب کرے اور کوئی دایہ مفت پلانے کیلئے ملتی ہو تب بھی باپ دایہ کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔

حَدِیثِ کَامِلِیْن - دو سال پورے یعنی چوبیس ماہ - اس سے معلوم ہوا کہ کم از کم حمل کی مدت چھ ماہ ہے کیونکہ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے کہ حمل اور دودھ پلانے کی مجموعی مدت تیس ماہ ہے۔ پس جب صرف دودھ پلانے کی کامل مدت دو سال ہے تو حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہوگی۔

اسی بناء پر یہاں اختلاف ہے کہ آیا ہر بچے کو دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے یا دو سال کا عرصہ اُس بچے کے لئے ہے جو چھ ماہ کا پیدا ہوتا کہ حمل اور رضاع مل کر تیس ماہ پورے ہو جائیں۔ ابن عباس سے یہی منقول ہے کہ یہ مدت صرف اسی بچہ کے لئے ہے جو چھ ماہ کا پیدا ہو اگرچہ سات ماہ کا پیدا ہو اس کی دودھ کی مدت تیس ماہ ہوگی اور اگرچہ نو ماہ کا پیدا ہو تو اس کی دودھ کی مدت اکیس ماہ ہوگی۔

بہر کیف دودھ پلانے کی مدت اس قدر ہوگی کہ حمل کی مدت کے ساتھ مل کر تیس ماہ پورے ہوں۔ اسی بناء پر ہمارے علماء روایت فرماتے ہیں کہ بچے کو اکیس ماہ سے کم دودھ پلانا بچہ پر ظلم ہے کیونکہ عام طور پر انتہائی مدت حمل نو ماہ ہی ہوا کرتی ہے لہذا کم از کم مدت رضاع اکیس ماہ ہونی چاہئے اور اس سے کم کرنا بچے کی حق تلفی ہوگی اور بعض کہتے ہیں کہ ہر بچے کی دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے اور اس سے کمی یا بیشی ناجائز ہے لیکن اِمْنْ اَرَادَا اَنْ یَّتِمَّ الرِّضَاعَةُ کے ظاہر علی الفاظ بتلاتے ہیں کہ دو سال کا عرصہ رضاع کی آخری حد ہے پس جو شخص پورا کرنا چاہے بے شک کر لے لیکن جو نہ پورا کرے اس پر مدت کا پورا کرنا لازم نہیں ہے البتہ بچے کی مصلحت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

مسئلہ - چونکہ رضاع کی حد اخیر دو سال ہے لہذا علمائے امامیہ کے نزدیک دو سال کے بعد کی رضاعت شرعی طور پر احکام رضاع پر اثر انداز نہ ہوگی۔ لہذا رضاع کے لئے جو احکام حرمت نکاح کے متعلق ہیں وہ دو سال کے اندر ہونے والے رضاع کے لئے ہیں اور دو سال کے بعد کا رضاع حرمت نکاح کا موجب نہ ہوگا۔

اَلْمَوْلُودُ لَهُ - یعنی وہ شخص جس کا بچہ ہے اور وہ باپ ہی ہوتا ہے اسی بناء پر میں نے مرادی ترجمہ (باپ) ہی کیا ہے۔ رَزَّةٌ لِّمَنْ وَکَسُوْهُنَّ بِالْعُرُوْفِ - اکثر مفسرین سے منقول ہے کہ اس سے مراد وہ بچہ دار عورتیں ہیں جن کو شوہروں نے طلاق دے دی ہو چنانچہ اس سے پہلے طلاق کا ذکر بھی اسی کا قرینہ ہے تاکہ بیان کے تسلسل میں فرق نہ آئے اور اس آیت کی رو سے بچے کی تربیت کا حق زمان رضاعت میں ماں کو حاصل ہے لہذا اس مدت تک اس کا خرچہ یعنی روٹی کپڑا باپ پر واجب ہے اگرچہ عدت کے بعد مطلقہ ہونے کی حیثیت سے مرد سے اس کا نان و نفقہ ساقط تھا اور یہ دوسرا قرینہ ہے کہ یہاں ان ماؤں کا ذکر ہے جن کو اپنے شوہروں نے طلاق دے دی ہو ورنہ اگر مطلقہ نہ ہوتیں تو نان و نفقہ

کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ زوجہ کا نان و نفقہ مرد پر واجب ہے خواہ بچے کو دودھ پلائے یا نہ پلائے اور بالاعتداف سے مراد ہے کہ روٹی و کپڑے میں مرد کی پوزیشن کا لحاظ رکھا جائے یعنی خوش حالی یا بد حالی کی حالت میں اپنی حیثیت کے لحاظ سے اس کو خرچہ ادا کرے۔

لَا تُضَارُّ وَالِدَهُ يَوْلِيَهُ وَلَا مَوْلَاؤُ ذَا لَهٗ يَوْلِيَهُ۔ ترکیب کے لحاظ سے اس فقرہ کے کئی معنی ہو سکتے ہیں کیونکہ لَا تُضَارُّ فعل نہی کا صیغہ ہے معلوم بھی ہو سکتا ہے اور مجہول بھی ہو سکتا ہے اگر معلوم کا صیغہ ہو تو اصل میں لَا تُضَارُّ سہول ہوگا اور اگر مجہول کا صیغہ ہو تو اصل میں لَا تُضَارُّ سہول ہوگا۔ اسی طرح باء جارہ سببیت کے معنی میں بھی ہو سکتی ہے اور زائدہ بھی ہو سکتی ہے۔ نیز یہ فقرہ گوشہ فقرہ لَا تُكَلِّفُ الخ سے بدل بھی بنایا جاسکتا ہے چنانچہ بعض قاریوں نے اسی بنا پر لَا تُضَارُّ رفع کے ساتھ فعل نفی مجہول کا صیغہ قرار دیکر پڑھا ہے پس آیت میں معانی کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) لَا تُضَارُّ۔ فعل نہی معلوم کا صیغہ قرار دیا جائے اور باء جارہ کو سببیت بنایا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ نہ ضرر دے بچے کی والدہ بسبب بچے کے۔ یعنی بچے کے باپ پر ناراض ہو کر بچے کو دودھ پلانا نہ چھوڑ دے کیونکہ اس سے بچے کے باپ کو بھی ضرر ہوگی اور بچہ بھی مزر کا نشانہ بن جائے گا اور اسی طرح مَوْلَاؤُ ذَا لَهٗ کے لئے بھی اس مناسبت سے فعل معذوف ہوگا یعنی لَا يُضَارُّ اور معنی ہوگا کہ نہ ضرر دے بچے کا باپ بسبب بچے کے۔ یعنی بچے کی ماں سے ناراض ہو کر اس سے بچہ چھین نہ لے تاکہ اس کی ماں کو ضرر پہنچے کیونکہ اس ضرر میں بچہ بھی شریک ہوگا ان دونوں صورتوں میں بچہ مزر میں اس لئے شریک ہے کہ ماں کی شفقت سے دُور ہو جائے گا اور نیز ان صورتوں میں باپ مفاعلہ کا صیغہ مبالغہ کے لئے ہے ورنہ فعل ضرر صرف ایک جانب سے ہے۔

(۲) لَا تُضَارُّ۔ فعل نہی معلوم کا صیغہ اور باء جارہ کو زائدہ قرار دیا جائے۔ پس معنی یہ ہوگا کہ نہ ضرر دے ماں اپنے بچے کو کہ اس کو دودھ پلانا چھوڑ دے اور نہ ضرر دے باپ بھی اپنے بچے کو کہ ماں سے جدا کر کے کسی اور دایہ کے حوالہ اس کو کر دے۔ (۳) لَا تُضَارُّ فعل نہی مجہول کا صیغہ قرار دیا جائے اور باء جارہ سببیت کے معنی میں ہو۔ پس معنی یہ ہوگا کہ نہ ضرر دی جائے والدہ کو بوجہ اپنے بچے کے کہ بلا وجہ اس سے بچہ چھین لیا جائے اور کسی دوسری دایہ کے حوالہ کیا جائے اور نہ ضرر دیا جائے بچے کا باپ بسبب بچے کے کہ ماں اس کو دودھ پلانا چھوڑ دے۔

(۴) ترکیب صرفی و نحوی وہی اور معنی یہ کہ ضرر دی جائے والدہ، مرد کی طرف سے ترک جماعت کی بوجہ بچہ کے یعنی مرد عورت سے ہمبستر ہونا بچہ کی وجہ سے ترک کر دے تاکہ حمل نہ ہو جائے جس سے عورت کو ضرر ہو تو ایسا نہیں ہونا چاہیے اسی طرح نہ ضرر دیا جائے مرد عورت کی جانب سے ترک جماعت کی بسبب بچے کے یعنی عورت بچے کے لحاظ سے مرد کے پاس جانا چھوڑ دے حمل کے ڈر سے جس سے مرد کو ضرر ہو۔ تو ایسی صورت سے گریز کیا جائے اور آئمہ سے یہی معنی مروی ہے۔

(۵) لَا تُخَاسِرْ - صیغہ نفی مجہول - ہو کہ لَا تُكَلِّفُ سے بدل ہو تو معنی یہ ہوگا کہ احکام شرعیہ میں کسی نفس کو وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی یعنی بچے کی پرورش میں بچے کے ماں اور باپ کو وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی کہ بچے کے وجہ سے ان کو ضرر حاصل ہو۔ یہ احتمال بیضاوی نے بیان کیا ہے چار احتمالات علامہ طبرسی نے بیان فرمائے ہیں اور آخر میں فرمایا ہے کہ ان احتمالات کے درمیان آپس میں کوئی منافات نہیں ہے لہذا آیت کو ان تمام معانی پر مجہول کر لینا بہتر ہے۔

وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ - یعنی بچے کا باپ اگر مر جائے تو باپ کی طرح بچے کی دودھ پلانے والی کا خرچہ اور ترک ضرر کے احکام اس شخص پر عائد ہوں گے جو بچے کا وارث ہوگا یعنی اگر بچے پر موت آجائے تو جو شخص اس کا صحیح وارث منظور ہوگا ان چیزوں کا ذمہ دار بھی وہی ہے اور بعضوں نے وارث سے مراد مرنے والے باپ کا وارث لیلہ اور علامہ طبرسی نے پہلے مطلب کو ترجیح دی ہے۔

فَإِنْ أَمَرَ إِفْصَالًا - یعنی اگر میاں بیوی باہمی مشورہ در رضامندی سے دو سال سے پہلے بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں تو اس میں ان پر کوئی گناہ نہیں کیونکہ ملحوظ اس میں بچے کی مصلحت ہے اور ان معاملات کو بہ نسبت باپ کے ماں اچھا سمجھ سکتی ہے اور ہر دو کا مشورہ در رضامندی بچے کے لئے زیادہ فائدہ مند ہے پس اگر میاں بیوی میں اختلاف ہو جائے تو پھر دو سال کی مدت کو پورا کیا جائے گا۔

وَإِنْ أَمَرَ ذَرْبًا - اگر ماں بچے کو دودھ پلانے سے انکار کر دے یا دودھ کی اجرت طلب کرے اور کوئی دوسری عورت مفت دودھ پلانے پر حاضر ہو۔ یا ماں دوسری دودھ پلانے والیوں سے زیادہ اجرت طلب کرے، یا ماں بیمار ہو، یا اس کا دودھ نہ ہو، یا اس کا دودھ اتنا کم ہو کہ بچہ نہ پل سکتا ہو۔ تو ان حالات میں بچے کا باپ دودھ پلانے کے لئے کسی اور دایہ کی طرف رجوع کر سکتا ہے اور خداوند کریم اس کے متعلق فرماتا ہے کہ اگر تم دوسری عورتوں سے بچوں کو دودھ پلوانا چاہو تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا اتَّيَمُّنَ بِالْعُرْوَفِ - اس فقرہ کے کئی معانی لگے ہیں۔ یعنی دوسری عورتوں سے پلاؤ۔ بشرطیکہ جس عرصہ تک بچہ اپنی ماں کا دودھ پیتا رہا ہے، خوش اسلوبی اور انصاف پسندی سے اس کو اس مدت کی اجرت دے دو۔

یا بشرطیکہ تسلیم کر دو بچہ جو دوسری عورت کو رضاع کے لئے دے رہے ہو ساتھ معروف کے یعنی آپس کی خوشی در رضامندی سے نہ کہ ماں کی ضرر کی خاطر ایسا کر دو۔

یا بشرطیکہ دودھ اجرت جو تم نے دینی کی ہے خیر و خوشی اور منصف مزاجی کے ساتھ (حسب حیثیت) مسئلہ - ماں پر واجب ہے کہ ولادت کے بعد پہلا دودھ بچے کو ضرور پلائے اور بعض علماء نے اس کی

حد تین دن مقرر کی ہے اس وجہ کا مطلب یہ نہیں کہ مال مفت پلائے بلکہ اگر چاہے تو مرد سے اس کی اُبرت وصول کر سکتی ہے لیکن اس دودھ کا پلانا اس پر ضروری ہے اور اس کے بعد دو سال تک بچے کو دودھ پلانا ماں پر مستحب ہے اگرچہ اس کی اُبرت وصول کر سکتی ہے۔

مسئلہ :- رضاع کے زمانہ میں بچے کی تربیت کا زیادہ حق ماں کو حاصل ہے اور دودھ چھڑانے کے بعد بنا برفتویٰ مشور کے سات برس تک لڑکی کی تربیت میں ماں کا حق مقدم ہے اور لڑکی کا سات برس کے بعد اور لڑکے کا دودھ چھڑانے کے بعد تا بلوغ باپ کا تربیت کا حق مقدم ہے اور ماں باپ کی عدم موجودگی میں دادا، اور اس کی عدم موجودگی میں بچے کا قریب ترین رشتہ دار حق تربیت میں دوسروں سے مقدم ہے۔

مسئلہ :- بچے کو دودھ پلانے کے لئے عاقلہ مومنہ خوشوشرہ، خوش اخلاق اور پاک دامن عورت کا انتخاب مستحب کیونکہ دودھ کا طبیعت اخلاق اور شکل پر اثر ہوا کرتا ہے اور ائمہ معصومین علیہم السلام سے اسی مضمون کی متعدد احادیث وارد ہیں۔

مسئلہ :- بچے کو دودھ پلانے کے ثواب کے متعلق جناب رسالت اکرم سے مروی ہے کہ عورت کا بچے کو ایک دفعہ دودھ پلانا ایسا ہے جیسا کہ راہ خدا میں غلام آزاد کیا جائے اور جب بچے کا دودھ چھڑائے تو خدا کی طرف سے ایک مٹاری نثار کرے کہ اسے عورت تیرے گزشتہ گناہ معاف ہو گئے۔

تنبیہ :- بچے پر اللہ کی تربیت کا کافی اثر ہوتا ہے اور خصوصاً ماں کی صورت و سیرت بچے کو بہت زیادہ متاثر کرتی ہیں اور صرف ماں کی لڑکی کی تربیت ہی بچے پر موثر نہیں بلکہ شکم مادر میں بھی بچہ پر ماں کے اخلاق و کردار کا کافی اثر پڑتا ہے جو، طرح اچھی غذا اندرون شکم بچے کی جسمانیات پر اچھے اثرات ظاہر کرتی ہے اسی طرح غذا کی پاکیزگی اور اس کی صفیت بچے کی روحانی صلاحیتوں کے لئے سنگ بنیاد ہوتی ہے نیز ماں کی اپنی پاکیزگی نیک کرداری، نیک چلنی اور اخلاق حمیدہ و عادت نہ اچھے سے آراستگی بچے کے نیک اطوار اور خوش کردار ہونے کا پیش خیمہ بنتی ہے اور بعد از ولادت جب تک بچہ کی غذا کا خزانہ اپنی ماں کا سینہ رہتا ہے لازمی طور پر بچہ پر سابق اثرات کا توار و تگونی طور پر ہوتا رہتا ہے اور اس دوران میں ماں کی ظاہری طہارت بچے کی ظاہری و باطنی برتری کے لئے اساس و بنیاد ہوا کرتی ہے اور اس کے برعکس حمل اور رضاع کے زمانہ میں ماں کی غیر محتاط روش طہارت و نجاست میں لاپرواہی اور خللیت و حرمت غذا میں بے توجہی تگونی اور وضعی طور پر بچے پر بُرے اثرات کی موجب بنتی ہے اگر اس دوران میں تربیت شستہ ہوگی تو نتیجتاً بچے کی شستگی طینت معرض ظہور میں آئے گی اور زمان رضاع کے بعد کی تربیت کا اگرچہ اولاد پر اثر ہوتا ہے لیکن اس کی حیثیت اکتسابی ہوا کرتی ہے وہ قطعاً بچے کی طینت و فطرت پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

ابن نہ ہے نصیب اس بچے کے جس کی فطری و اکتسابی صلاحیتوں کے لئے اس کے ماں باپ اچھے اثرات کے

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَشْرًا جَايِزٌ لِّبَعْضِ

اور جو لوگ تم میں سے مرجائیں اور پیچھے بھڑ جائیں تو ان کو انتظار کرنی

بِأَنْفُسِهِمْ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۖ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا

چاہیے اپنے نفسوں میں۔ چار ماہ اور دس دن پس جب پینچیں اپنی مدت کو تو تم پر کوئی گناہ نہیں اس چیز

جُنَاحٌ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْعُرْفِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۲۳۳﴾

کے بارے میں جو وہ کریں اپنے نفسوں کے حق میں ساتھ نیکی کے (یعنی جائز طریقہ سے نکاح) اور خدا اس چیز سے جو تم بجالاتے ہو آگاہ ہے۔

موجب نہیں رضاع کے شرائط اور اس کے باقی احکام اپنے مناسب مقام پر حسب ضرورت بیان ہوں گے۔

عَدَّتِ وَفَاتِ کابیان

مسئلہ ۱۔ جس عورت کا شوہر مر جائے تو اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے خواہ مدخول ہو یا غیر مدخول ہو وغیرہ ہو یا یائسہ۔ اور اگر عورت حاملہ ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ دس دن گزرنے سے پہلے وضع حمل ہو جائے یعنی بچہ اس مدت سے پہلے پیدا ہو جائے تو عدت اس کی یہی مدت ہے یعنی چار ماہ اور دس دن اور اگر اس مدت کے اندر عورت کا وضع حمل نہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل ہوگی۔

مسئلہ ۲۔ وفات کی عدت کے زمانہ میں عورت پر سرمہ کا جل سُرخ لگانا اور گھر سے باہر جانا حرام ہے۔ اسی طرح عموہ لباس پہننا تیل، خوشبو لگانا، مہندی لگانا، زیور سنگار کرنا پوڈر ملنا وغیرہ یعنی جن چیزوں کو زینت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ان پر سب حرام ہیں۔

ہاں اگر زینت کے علاوہ ان چیزوں میں سے کسی کا استعمال کسی خاص ضرورت کے ماتحت کرے تو اسی قدر جائز ہے جس سے وہ ضرورت پوری ہو جائے نیز جسم کی صفائی۔ غسل۔ کنگھی۔ مسواک۔ ناخن تراشی یا بچوں کا بناؤ سنگار حرام نہیں ہے۔

بیوہ عورتوں کے متعلق مختلف اقوام نے جو دستور العمل تجویز کئے ہوئے تھے وہ عقلی و اصولی طور پر انسانیت کے لئے قطعاً ناقابلِ برداشت تھے ہندوؤں میں سستی کی رسم کو اہمیت حاصل

تھی یعنی بیوہ عورت کو اپنے مرنے والے شوہر کے ساتھ نذر آتش کر دیا جاتا تھا اور عربوں میں زمانہ جاہلیت میں بیوہ عورت کی عدت ایک سال تھی اور بعض اقوام کے نزدیک بیوہ عورت کا شادی کرنا بالکل ناجائز تھا۔ پس اسلام نے زندگی کے

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيهَا عَزَّوَجَلَّ مِنْ خُطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ

اور کوئی گناہ نہیں تم پر اس میں کہ اشارہ دکنا یہ سے کرو خواہگار (عدت والی) عورتوں کی یا پوشیدہ رکھو

أَكُنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ عَلِيمًا اللَّهُ أَنْتُمْ سَتَذْكُرُوا

اپنے دلوں میں ۔ خدا جانتا ہے کہ تحقیق تم عنقریب ان (عورتوں) کا ذکر کرو گے ۔

نَهْنٌ وَلَكِنْ لَا تَوَاعِدُ وَهْنٌ سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا

لیکن ان سے (صاف نکاح کا) وعدہ نہ لو چپکے چپکے (عدت ختم ہونے سے پہلے) مگر یہ کہ کہو اچھے طریقہ سے (الطور)

مَعْرُوفًا وَلَا تَعْزِمُوا عَقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ

کتاب کے (اور نہ قصد کرو نکاح کا ۔ یہاں تک کہ پہنچ جائے (حکم) قرآن اپنی

أَجَلَهُ وَعَلِمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ

(مستدرہ) حد (عدت) کو اور جانو تحقیق خدا جانتا ہے وہ جو تمہارے دلوں میں ہے پس اس سے ڈرو

وَعَلِمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۚ

اور جانو تحقیق خدا بہت بخشنے والا، علم کرنے والا ہے

ہر شعبے میں عورتوں کو مردوں کے ساتھ جتنے دار قرار دے دیا یعنی جس طرح مرد کو بیوی کے مرنے کے بعد شادی کرنے کا حق ہے اسی طرح عورت بھی اپنے شوہر کے مرنے کے بعد عدت گزرنے کے بعد شادی کر سکتی ہے ۔

عدت کے اندر پیغام نکاح کی ممانعت

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ الْخ - عورتوں کے عدت کے زمانہ میں اس کو صاف طور پر کھلے لفظوں میں نکاح کا پیغام دینا منع ہے البتہ اشارے اور کناٹے سے اپنی خواہش کا اظہار جائز ہے یعنی عورت کو سنا کر ایسے الفاظ کہے کہ وہ سمجھ جائے کہ میرے ساتھ نکاح کی خواہش رکھتا ہے ۔

وَلَا تَوَاعِدُ وَهْنٌ سِرًّا - اس کا ایک ترجمہ تو وہی ہے جو تحت اللفظ موجود ہے اور دوسرا یہ کہ ستر کا معنی علیحدگی اور خلوت کرنے کا وعدہ نہ لو کیونکہ یہ چیز برائی کی طرف دعوت دیتی ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ ستر کا معنی زنا ہو ۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا

نہیں گناہ تم پر اگر طلاق دو عورتوں کو جبکہ تم نے ان سے کس (جماع) نہ کیا ہو یا مہر ان کا مستحق

لَهُنَّ فَرِيضَةٌ مِّمَّا مَتَّعُوهُنَّ عَلَى الْمَوْسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتَرَقَدَرِ

نہ کی ہو اور فائدہ پہنچاؤ ان کو خوشی مال اپنی حیثیت سے اور تنگدستی اپنی حیثیت سے

مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿۲۳۶﴾ وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ

فائدہ ساتھ نیکی کے (حسب حال) یہ واجب ہے اور پر فرض شناس لوگوں کے اور اگر طلاق دو ان کو قبل مس (جماع) کرنے

أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ

کے در انما لیکہ مقرر کر چکے ہو تم ان کے لئے مہر تو پس آدھا حصہ مہر مقتدر کا (ان کو دے دو) مگر یہ کہ وہ معاف کر

إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُو الَّذِي بِيَدِهِ عَقْدَةُ النِّكَاحِ وَأَنْ تَعْفُوا

دے یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں گناہ نکاح کی ہے اور تمہارا معاف کر دینا تقویٰ سے زیادہ

أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَلَا تَنْسُوا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۲۳۷﴾

قریب ہے اور مت مہلک آپس میں فضل و احسان کرنا۔ تحقیق اللہ تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے۔

یعنی ان سے زنا کا وعدہ نہ لو اور بہتر کا معنی جماع کیا گیا ہے۔ بہر کیف عدت والی عورت سے مراعات نکاح و شادی کا ذکر کرنا یا علیحدگی و خلوت میں اس قسم کی باتیں کرنا ناجائز ہے۔ وَلَا تَنْسُوا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ اس کا مطلب یہ ہے کہ عدت ختم ہونے سے پہلے ان سے نکاح نہ کرو بلکہ نکاح کا عقد عدت کے بعد ہی ہو سکتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ عدت کے بعد نکاح کرنے کا دوران عدت میں ارادہ بھی نہ کرو کیونکہ اَكُنْتُمْ فِيْ اَنْفُسِكُمْ کے الفاظ صاف بتلاتے ہیں کہ ختم عدت کے بعد نکاح کا ارادہ ابھی جائز ہے۔ مسئلہ: عدت کے اندر عورت سے اگر نکاح کیا جائے تو نکاح باطل ہے اور جان بوجھ کر ایسا کرنے سے وہ عورت اس مرد پر حرام مؤبد ہو جاتی ہے۔

غیر مدخولہ عورت کی طلاق

رکوع ۱۵

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ۔ گویا وہم پڑتا ہے کہ شاید عورت کو قبل دخول طلاق دینا ممنوع ہو۔ پس ارشاد فرمایا کہ ایسا نہیں۔

بلکہ اگر مرد چاہے تو قبل دخول کے اپنی عورت کو طلاق دے سکتا ہے اسی طرح جس عورت کا مہر مقرر نہ کیا ہو اس کو بھی طلاق دے سکتا ہے لیکن اس کو کچھ نہ کچھ (حسب حیثیت) فائدہ پہنچانا ضروری ہوگا۔ تفصیل اس کی یوں سمجھئے کہ جس عورت کو طلاق دے رہا ہے وہ مہر شدہ (مدخولہ) ہے یا غیر مہر شدہ (غیر مدخولہ) ہے اور ہر دو صورتوں میں اس کا مہر مقرر ہے یا مہر مقرر نہیں۔

(۱) اگر مدخولہ ہے اور مہر مقرر شدہ ہے تو اس کی طلاق کے لئے وہ ہی شرائط ہیں جو گذر چکی ہیں اور ایسی مطلقہ پر مہر کی حقدار ہوتی ہے مہر کے علاوہ اس کو کچھ دینا واجب نہیں ہے۔

(۲) اگر مدخولہ ہو اور مہر اس کا مقرر شدہ نہ ہو تو طلاق کی شرطیں وہی ہیں لیکن خاندان، عمر، شکل و صورت و دیگر اوصاف کے لحاظ سے اس جیسی عورتوں کے لئے جتنی رحق مہر ہونا چاہیئے وہ اس کو دینا پڑے گا۔

(۳) اگر غیر مدخولہ ہو اور مہر مقرر ہو تو طلاق میں باقی شرطیں ضروری ہیں صرف حیض سے پاک ہونا عورت کا ضروری نہیں بلکہ غیر مدخولہ کو حالت حیض میں بھی طلاق دی جاسکتی ہے اور مقرر شدہ مہر کا نصف عورت کو دینا واجب ہے مگر اس صورت میں کہ عورت اپنا نصف مہر کا حق معاف کر دے یا اس کا ولی معاف کر دے۔

(۴) اگر غیر مدخولہ ہو اور مہر مقرر نہ ہو تو طلاق میں حسب سابق اس کا حیض سے پاک ہونا ضروری نہیں ہے اور مرد پر اس کو متعہ (فائدہ) پہنچانا واجب ہے اور یہ فائدہ مرد کی حیثیت کے لحاظ سے ہے پس اگر غنی ہو تو گھوڑا یا بلند قیمت کیڑا یا دس دینار دے اور اگر متوسط طبقہ کا آدمی ہو تو پانچ دینار دے اور اگر غریب ہو تو ایک دینار، یا سونے کی انگوٹھی یا چاندی کی انگوٹھی دے دے اور مرد کا غنی یا فقیر یا متوسط طبقہ سے شمار ہونا۔ زمان۔ مکان اور پوزیشن کے لحاظ سے عام عرف کے تابع ہے اسی طرح علماء نے ذکر فرمایا ہے۔

اَوْ يَتَفَوُّذُ بِبَيْتٍ عَقْدًا ۖ الْكَاحُ - غیر مدخولہ عورت جس کا مہر مقرر ہو اس کو طلاق دینے کی صورت میں مرد پر اس کا نصف مہر ادا کرنا واجب ہو اگر تاجہ ہے مگر یہ کہ عورت اپنا حق یعنی نصف مہر معاف کر دے یا وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے اور اس سے مراد عورت کا ولی ہے اور علمائے امامیہ کے نزدیک باکرہ غیر بالغہ لڑکی کا ولی صرف باپ یا دادا ہی ہو سکتے ہیں پس اگر بالغہ ہوگی تو معاف کرنا یا وصول کرنا اس کے اپنے اختیار میں ہے اور نابالغہ ہوگی تو اس کے ولی کو اختیار ہے۔ مسئلہ: غیر مدخولہ مطلقہ کا ولی پورا نصف مہر معاف کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ بعض حصہ معاف کر سکتا ہے۔

مسئلہ: اگر لڑکی اپنے ولی (باپ دادا) کے تصرف معافی پر ناراض ہو تو اس کا کوئی اثر نہیں بشرطیکہ ولی نے اس کی مصلحت کے لئے ایسا کیا ہو۔

مسئلہ: مطلقہ غیر مدخولہ عورت کی کوئی عدت نہیں ہوا کرتی بلکہ طلاق کے بعد فوراً اس کا نکاح دوسری جگہ جائز ہے۔

حُفِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقَوْمُوا إِلَيْهِ قَتِينًا ۝۲۳۰

پابندی کرو نمازوں پر خصوصاً درمیانی نماز کی اور کھڑے ہو اللہ کے لئے دُعا مانگتے ہوئے

فَإِنْ خِفْتُمْ فِرْجَآلًا أَوْ رُكْبَانًا ۖ فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَأَذْكُرُوا

پس اگر تمہیں ڈر ہو تو پس پیدل یا سوار ہو کر (جیسا ممکن ہو نماز پڑھو) پھر جب امن میں ہو حباؤ تو خدا کو

اللَّهُ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۝۲۳۱

یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں تعلیم فرمائی اس چیز کی کہ جسے تم نہیں جانتے تھے

نمازِ وسطیٰ کی تاکید

مجمع البیان میں زید بن ثابت سے مروی ہے کہ جناب رسول خدا ظہر کی نمازِ اول وقت میں ادا فرماتے تھے اور یہ نماز تمام باقی نمازوں سے صحابہ پر شاق و دشوار تھی چنانچہ اس نماز میں آپ کے پیچھے ایک یا دو صف نمازیوں کی ہوا کرتی تھی۔ پس آپ نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ جو لوگ اس نماز میں شریک نہیں ہوتے ان کے گھر جلا دوں۔ پس یہ آیت اتری۔

وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ۔ اس سے مراد اکثر روایات ائمہ میں نماز ظہر ہے اور شانِ نزول کی روایت بھی اسی کی تائید کرتی ہے اگرچہ روایت عامی ہے اور اس کو وسطیٰ یعنی درمیانی اس لئے کہا گیا ہے کہ دن کے تقریباً درمیان میں واقع ہوتی ہے ایک روایت میں ہے کہ اس وقت آسمان کے دروازے کھلے ہوتے ہیں میہانگ کہ نماز ظہر ادا کی جائے اور اس وقت دعا مستجاب ہوتی ہے بعض لوگ نماز عصر مراد لیتے ہیں کیونکہ دن کی دو نمازوں اور رات کی دو نمازوں کے درمیان ہے بعض لوگ نماز مغرب مراد لیتے ہیں کیونکہ یہ دن اور رات کے درمیان میں واقع ہے اور بعض لوگ نماز عشاء مراد لیتے ہیں کیونکہ عصر نہ ہونے والی دو نمازوں کے درمیان میں ہے اور بعض لوگ نماز صبح مراد لیتے ہیں کیونکہ رات اور دن کی دو نمازوں کے درمیان ہے کہ وہ دو ایک وقت میں ہیں اور یہ تنہا ایک وقت میں ہے اور یہ سفیدی اور سیاہی کے درمیان میں واقع ہے یہ تمام اقوال علامہ طبرسی نے اپنی تفسیر میں نقل فرمائے اور قول کی تائید میں قائلین نے جو حدیثیں پیش کی ہیں انہوں نے وہ بھی ذکر کی ہیں۔ لیکن تفسیر اہلبیت سے صرف پہلا قول ثابت ہے اور وہ یہ کہ نماز ظہر ہی نمازِ وسطیٰ ہے اور چونکہ آل محمد ہی قرآن کے حقیقی مفسر ہیں لہذا ان کے فرمان کے مقابلہ میں کسی دوسرے کے قول کی کوئی وقعت نہیں ہے چنانچہ ابوبصیر سے مروی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ نمازِ وسطیٰ نماز ظہر ہے اور یہی نماز پہلے پہل حضرت رسالتؐ پر اتری۔ اسی طرح تفسیر برہان میں متعدد روایات مذکور ہیں۔

نماز وسطیٰ کی تاویل

ہم نے کتاب کی جلد اول یعنی مقدمہ تفسیر میں کئی عنوانات کے تحت میں اشارۃً وصراحتاً اس مطلب کو ظاہر کیا ہے کہ تمام اعمال کی اصل معرفت ہے اور معرفت کے بغیر اعمال شرف قبولیت کو نہیں پہنچ سکتے۔ چنانچہ مفضل بن عمر کی روایت کے آخری فقرات یہ ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ معرفتِ امام اصل ہے اور جملہ عبادات اس کی فرع ہیں یا یوں سمجھئے کہ معرفتِ امام باطن اور تمام عبادات اس کا ظاہر ہیں۔ پس فرع اور ظاہر کے بغیر اصل اور باطن سے تمسک پکڑنا سراسر غلط بلکہ شرک ہے اور دشمنِ نبی و امام تمام برائیوں کی اصل ہے اور تمام برائیاں اس کی فرع ہیں پس جو شخص اصل سے نفرت کرتا ہو اور برائیوں سے نفرت نہ کرے جو اس کی فروعات اور اس کی پیداوار ہیں۔ تو وہ جھوٹا ہے کیونکہ دشمنِ امام سے نفرت کرنا اصل اور باطن ہے اور تمام برائیوں سے نفرت کرنا اس کی فرع اور ظاہر ہے اور اصل کی پہچان فرع سے ہی ہوا کرتی ہے۔ ہاں یہ بات کہ معرفت حاصل کر لو اور جو جی چاہے کرو۔ درست ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ امام کی معرفت حاصل کر لینے کے بعد جتنی نیکی کرو مقبول ہے خواہ کم ہو یا زیادہ اور بجز معرفت کے کوئی نیکی نیکی ہی نہیں۔ انتہی۔

پس جب معلوم ہوا کہ معرفت ہر عبادت اور عمل خیر کی روح ہے اور بغیر اس کے کوئی عبادت عبادت ہی نہیں خواہ وہ نماز ہو یا کوئی اور شے ہو تو اس بناء پر قرآن مجید میں جس قدر اعمال خیر کا ذکر ہے ان کا باطن اہلبیت علیہم السلام کی محبت قرار دینا بالکل درست ہے۔

چنانچہ مقدمہ تفسیر صراط الانوار میں بصائر الدرجات سے منقول ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ قرآن کی دو تہائی ہمارے اور ہمارے شیعوں کے حق میں ہے پس جہاں بھی خیر کا ذکر ہے وہ ہمارے اور ہمارے شیعوں کے لئے ہے اور باقی تہائی میں دوسرے لوگ ہمارے ساتھ شریک ہیں اور جہاں بھی شر کا ذکر ہے وہ ہمارے دشمنوں کے لئے ہے۔

اور اسی کتاب میں کافی سے منقول ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ کیا قرآن بولتا بھی ہے؟ آپ نے سائل سے فرمایا کہ ہاں نماز بھی بولتی ہے اس کی شکلی صورت بھی ہے وہ امر بھی کرتی ہے اور نہی بھی کرتی ہے سعد خفاف راوی حدیث کہتا ہے کہ یہ سنتے ہی میرا رنگ نک ہو گیا۔ پس میں نے عرض کی کہ آپ نے ایسی بات فرمائی ہے جس کا اظہار میں لوگوں میں نہیں کر سکتا۔ آپ نے فرمایا۔ لوگ تو ہمارے شیعہ ہی ہیں پس جو شخص نماز کی معرفت نہیں رکھتا۔ وہ ہمارے حق کا منکر ہے پھر فرمایا۔ اے سعد! خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے: اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذٰلِكَ كَرَّمَ اللّٰهُ اَكْبَرُ (پ ۲۱) تحقیق نماز

نہی کرتی ہے فحشاء اور منکر سے اور اللہ کا ذکر اکبر ہے)

پس نہی کرنا کلام ہی ہے اور فحشاء و منکر سے مراد کئی لوگ ہیں اور ہم ذکر اللہ ہیں اور ہم اکبر ہیں۔ نیز اسی کتاب میں علل سے منقول ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام ایک مرتبہ صحن کعبہ سے گذر فرما رہے تھے کہ ایک شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور اس کی نماز کو اچھا پایا۔ پس فرمانے لگے۔ اے شخص! کیا تو اپنی نماز کی تادیل کو جانتا ہے؟ اس نے عرض کی۔ اے سید کائنات کے برادر! کیا عبادت گزاری کے علاوہ نماز کی کوئی دوسری تادیل بھی ہے؟ آپ نے فرمایا! اے شخص! جان۔ تحقیق اللہ تبارک و تعالیٰ نے جناب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث نہیں فرمایا! ساتھ کسی ایسے امر کے جس کی شبیہ اور تادیل اور تنزیل نہ ہو اور یہ سب کچھ اطاعت کے ماتحت ہے پس جو شخص اپنی نماز کی تادیل کو نہیں سمجھتا تو اس کی نماز ناقص اور نامکمل ہے (صاحب مقدمہ اس کی توجیہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ تادیل سے مراد باطن اور تنزیل سے مراد ظاہر ہے۔)

مقصود یہ ہے کہ جناب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم جس قدر ادا امر ظاہرہ لائے ہیں ان کی شبیہ اور مثال ضرور ہے جو باطن کے لحاظ سے مامور اور واجب العمل ہے اور ان ہر دو پر ایمان لانا ضروری ہے پس جو شخص نماز کے باطن کو نہ پہچانتا ہو جس سے مراد امام اور اس کی اطاعت ہے تو اس کی نماز ظاہرہ ناقص ہے۔

باقی تمام عبادات بدنیہ میں سے نماز افضل عبادت ہے اور اس اہم عبادت کو محدود اکل محدود کے علاوہ کسی نے بھی کامل طریق پر ادا نہیں کیا۔ کیونکہ نماز ان کی جان تھی اور یہ نماز کی جان تھی۔ شب و روز میں ایک ہزار رکعت نافلہ کا ادا کرنا انہی کا کام تھا۔ نماز میں مشغول ہو کر اس قدر محو ہو جانا کہ لوگ سمجھیں وہاں سے گزر گئے گویا نماز اور یہ کالب و جان تھے اور ان کے محدود خالی ان کے رنگ و ڈھنگ، ان کے گفتار و کردار اور ان کی رگ و پے میں نماز کے آثار ظاہر و ہدید تھے ان کے جسم کا بال بال، خون کا قطرہ قطرہ، بدن کی رگ رگ نماز و جملہ عبادات الہیہ کا مجسمہ تھا۔ ابتداء دنیا میں تشریف لائے تو گود مادر میں مقام نہ کیا جب تک پہلے سر بسجود نہ ہوئے اور جب دنیا کو آخری الوداع کہا تو نماز کے لباس میں۔ پس اس کمال قرب کی وجہ سے گویا یہ نماز کا وجود تھے اور نماز ان کا وجود تھی۔

نیز نماز بلکہ جملہ عبادات کی مقبولیت کے لئے ان کی دلاء و محبت شرط ہے اور اس کے بغیر اعمال کی مقبولیت مشکلی بلکہ محال ہے کیونکہ انہی کی دلاء و حقیقت نماز کا درس دیتی ہے اور نماز کا طرہ رقیہ سکھاتی ہے اس مطلب کو میں نے جلد اول میں ایک مستقل عنوان کے ماتحت قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے پس انہی وجوہات کی بناء پر باطن قرآن میں نماز سے مراد یہی ہیں۔

مقدمہ تفسیر میں باب الصاد میں بعض کتب امامیہ سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے راوی حریف وادربن کثیر سے فرمایا! اے دادو! اللہ کی کتاب میں نماز ہم ہیں، نہ کوئی ہم ہیں، روزہ ہم ہیں، حج ہم

ہیں۔ شہر حرام ہم ہیں۔ بلد الحرام ہم ہیں۔ کعبۃ اللہ ہم ہیں۔ قبلۃ اللہ ہم ہیں اور وجہ اللہ ہم ہیں۔ الخبر۔

نیز حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے اسْتَوْعِیْذًا بِالصَّلٰوةِ وَرَأْفًا لِّکَثِیْرَةٍ اِلَّا عَلٰی الْخَاشِعِیْنَ کی تاویل میں منقول ہے کہ صبر سے مراد جناب رسالتاً ہے اور صلوة (نماز) سے مراد میری ولایت کا قائم کرنا ہے اسی بناء پر تو خدا نے نماز کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ بھاری ہے اور اس کی طاقت صرف خشوع کرنے والوں کو ہوگی اور خاشعین ہمارے شیعہ ہی ہیں اور صبر کو بھاری نہیں کہا گیا (کیونکہ رسالت کا قائل تو ہر مسلمان ہے) ہر ایت عیاشی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ لَا تَخْشَوْا بِصَلٰوةِیْکُمْ کی تاویل یہ ہے کہ علیؑ کی ولایت کا ایسی اعلانیہ بیان نہ کرو۔ یہاں تک کہ میرا حکم آئے اور لَا تَخْشَوْا بِہَا کی تاویل یہ ہے کہ اس کو بالکل چھپاؤ نہیں بلکہ علیؑ کو اس کی خبر دے دو۔

نیز امام علیہ السلام سے آیت زیر بحث کی تاویل یوں منقول ہے کہ حَافِظُوا عَلٰی الصَّلٰوةِ میں صلوات سے مراد حضرت رسالتاً اور حضرت امیر المومنین اور حضرت فاطمہ اور حضرت حسن اور حضرت حسین علیہم السلام ہیں اور نماز وسطیٰ سے مراد صرف حضرت امیر المومنین ہیں اور قَائِلِیْہِمْ سے مراد ہے آئمہ کی اطاعت کرنے والے بقصد باطنی طور پر یہ ہوا کہ محمدؐ و آل محمدؐ کی ولایت اور محبت کو اپنے پاس محفوظ رکھو۔ خصوصاً ولایت علیؑ اور اللہ کے سامنے ان کی اطاعت کرتے ہوئے اور ان کے نقش قدم پر گامزن ہوتے ہوئے پیش ہوا کرو۔

اقولے حضرت علیؑ کے متعلق زیادہ تاکید کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ مسلمانوں میں اختلاف اسی بزرگوار کی وجہ سے پیدا ہوتا تھا اس لئے خدا نے اس کو خصوصیت سے بیان فرمایا۔ ورنہ ان سب کی محبت و ولایت ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے۔

نیز امام جعفر صادق علیہ السلام سے کَمَنْ لَمْ یَنْتَهِ عَنْ الْمُصَلٰتِیْنَ جَنَّتِیْنَ کا جواب کہ ہم نمازی نہیں تھے۔ کی تاویل میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ وہ کہیں گے چونکہ ہم آئمہ کی اطاعت نہیں کرتے تھے اس لئے جہنم میں ڈال دیئے گئے ہیں۔

پس ان تمام احادیث کے نقل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آئمہ ظاہری عبادات ظاہریہ کا باطن ہیں۔ اور نماز وسطیٰ جس کی تاکید کی گئی ہے ظاہر میں گو نماز ظہر ہے لیکن باطن کے لحاظ سے ولایت امیر المومنین مراد ہے اور اسی پر چونکہ تمام نمازوں کی مقبولیت کا دار و مدار ہے لہذا اس کو خصوصی تاکید کے ساتھ ذکر فرمایا۔ لیکن ابتدا میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے فرمان سے نقل کیا ہے کہ صرف ولایت اہلبیت کا دعوت کر کے عبادت ظاہریہ سے منہ پھیرنا جائز ہے ولایت اہلبیت اصل ہے اور عبادات اس کی فرع ہیں اور اصل بغیر فرع کے نہیں ہوتی اور ظاہر و باطن ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے اور اس مطلب کی مزید تفصیل کتاب کی جلد اول میں "قرآن کے

ظاہر و باطن کے عنوان میں اور تاویل متراکن اور عبادات ظاہریہ کے عنوان میں موجود ہے ملاحظہ فرمائیے۔

دعائے قنوت کا بیان

وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ - تفسیر مجمع البیان میں البرجاء العطاروی سے مروی ہے کہ ہمیں ابن عباس نے مسجد بصرہ میں صبح کی نماز پڑھائی اس میں رکوع سے پہلے قنوت بھی پڑھا اور رفع یدین بھی کیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو کہنے لگے کہ یہی وہ نماز وسطیٰ ہے جس میں قنوت پڑھنے کا حکم ہے نیز تفسیر ثعلبی سے بروایت انس بن مالک نقل کیا گیا ہے کہ جناب رسالت اکرم صبح کی نماز میں قنوت پڑھا کرتے تھے یہاں تک کہ دنیا سے رخصت ہو گئے اور قانتین کا معنی ابن عباس سے یہی منقول ہے یعنی نماز میں بحالت قیام دعا مانگنا۔

صحیح بخاری جلد ۱ سے منقول ہے کہ راوی حدیث کہتا ہے۔ میں نے انس بن مالک سے قنوت کے متعلق دریافت کیا۔ تو انس نے جواب دیا کہ قنوت پڑھا جایا کرتا تھا میں نے پھر پوچھا کہ رکوع سے پہلے یا پیچھے تو اس نے جواب دیا کہ پہلے۔ میں نے کہا۔ کہ مجھے کسی آدمی نے تیرے متعلق بتایا ہے۔ کہ تو رکوع کے بعد قنوت کہتا ہے۔ انس نے کہا جس نے یہ کہا ہے۔ وہ جھوٹا ہے کیونکہ جناب رسالت اکرم نے رکوع کے بعد صرف ایک ماہ قنوت پڑھا ہے۔ یعنی اس کے علاوہ وہ ہمیشہ رکوع سے پہلے پڑھا کرتے تھے۔

قرآن مجید کے اس فرمان پر مذہب شیعہ ہی پورے طور پر عامل ہے اور اہلبیت طاہرین علیہم السلام سے قنوت کے متعلق روایات تو اترے منقول ہیں۔ حتیٰ کہ فروع کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جو شخص قنوت کو بے توجہی کرتے ہوئے چھوڑ دے تو اس کی نماز ناک ہے۔

وفیر :- بروایت زراره حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ جس شخص کو دعائے قنوت نماز میں بھول جائے اور گھر جاتے ہوئے راستہ میں یاد آجائے تو وہیں قبلہ رخ کھڑے ہو کر پڑھ لے۔ پھر فرمایا کہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ کوئی شخص سنت رسولؐ سے بے توجہی برتے یا اس کو چھوڑ دے۔

وفیر :- امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ قنوت میں :- اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَاَسْأَلُكَ عَنَّا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ نیز آپ نے ایک اور روایت میں فرمایا کہ قنوت ہر نماز کے لئے ہے خواہ فرض ہو خواہ نافلہ ہو۔

وفیر :- امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ قنوت ہر نماز میں دوسری رکعت کے رکوع سے پہلے ہے۔ مسئلہ :- نماز جمعہ میں دو قنوت مستحب ہیں ایک پہلی رکعت میں رکوع سے پہلے اور دوسرا دوسری رکعت

میں رکوع کے بعد۔

مسئلہ :- نماز وتر ایک رکعت ہوتی ہے لہذا اس میں قنوت قبل رکوع پڑھا جاتا ہے۔

مسئلہ :- نماز عیدین میں نو قنوت ہوا کرتے ہیں۔ پہلی رکعت میں پانچ اور دوسری رکعت میں چار۔
(احادیث کو اختصار کے پیش نظر ترک کر دیا ہے)

نماز خوف کا بیان

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ سُرُكَبَانًا۔ کافی باب مسئلۃ خوف۔ عبدالرحمن بن ابی عبداللہ روایت کرتا ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت مجیدہ کے متعلق سوال کیا۔ کہ نماز کس طرح پڑھے۔ اور کیا پڑھے۔ درحالیہ کہ چور یا درندہ کا خطرہ ہو۔ آپ نے فرمایا۔ تکیہ الاحرام کہے اور پھر اشارہ سے پڑھنا جائے نیز بردایت ابو بصیر آپ نے فرمایا کہ اگر تم خوفناک زمین میں ہو اور چور یا درندہ کا ڈر ہو تو ایسی حالت میں سواری کے اوپر نماز پڑھ لیا کرو۔

نیز بردایت علی بن جعفر حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مروی ہے۔ راوی نے سوال کیا۔ ایک شخص کے سامنے درندہ آجائے اور نماز کا وقت ہو اور درندہ کے ڈر سے کہیں جانہ سکتا ہو اگر نماز پڑھتا ہے تو رکوع و سجد میں درندہ کے حملہ کا خطرہ ہے اور درندہ بھی قبیلہ کے خلاف جانب میں ہے اگر قبیلہ کی طرف منہ کرتا ہے تو درندہ سے ڈرتا ہے پس وہ شخص ان حالات میں کیا کرے؟
آپ نے فرمایا۔ کہ وہ درندہ کی طرف متوجہ رہے اور نماز شروع کر دے اور قیام کی حالت میں ہی ساری نماز پڑھے۔ رکوع و سجد کے لئے اشارہ کرتا رہے۔

پس قرآن مجید کے اس فرمان کا مطلب معلوم ہو گیا۔ کہ فرماتا ہے کہ اگر تم کو ڈر ہو تو پیدل یا سواری جس طرح ممکن ہو نماز پڑھ لیا کرو۔

خداوند کریم نے احکام شرعیہ میں انسان کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ نہیں رکھا۔ چنانچہ ایک مقام پر فرماتا ہے۔ یُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔ (تحقیق خدا تمہاری آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہاری تسلی نہیں چاہتا)

پس اگر امن کی حالت ہو تو باقاعدہ پورے مشروع و حضور سے عبادت کو تمام شرائط کے ساتھ بجالانا ضروری ہے

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً

اور وہ لوگ جو تم میں سے مر جائیں اور چھوڑ جائیں بیویاں وہ وصیت کر جائیں اپنی بیویوں

لَا زَوْاجَهُمْ مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرِ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا

کے لئے فائدہ (زمانہ و نفقہ و مکان) کی سال تک کے لئے کہ گھر سے نکال نہ دی جائیں۔ پس اگر خود چلی جائیں

جُنَاحٌ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوفٍ ۗ وَاللَّهُ

تو تمہیں کوئی گناہ نہیں کہ وہ جو کچھ کریں اپنے نفسوں کے لئے اچھے طریقے سے اور اللہ تعالیٰ

عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝۳۳ وَالْمُطَلَّقَاتُ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى

غالب حکمت والا ہے اور طلاق شدہ عورتوں کے لئے فائدہ پہنچانا ساتھ نیکی کے (اچھے طریقے سے) واجب

الْمُتَّقِينَ ۝۳۴ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝۳۵

ہے متقی لوگوں پر اسی طرح واضح فرماتا ہے اللہ تمہارے لئے اپنی آیات کو تاکہ تم سمجھو

جیسا کہ خود فرما رہا ہے فَإِذَا أَوْمِتْتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ ۚ کہ جب تم امن کی حالت میں ہو جاؤ۔ تو خدا کو اُسی طرح یاد کرو جس طرح اُس نے تمہیں تعلیم دی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو جس قدر ممکن ہو اور جیسے ممکن ہو اپنے فرائض کو ادا کرو۔

طلاق شدہ عورتوں کے بعض احکام

وَصِيَّةٌ لِّأَزْوَاجِهِمْ ۚ - یہاں فعل محذوف مانا گیا ہے جو وَصِيَّةٌ کا مناسب ہے یعنی فَلْيُوصُوا وَصِيَّةً ۚ۔

تفسیر برہان میں تفسیر عیاشی سے برہایت معاویہ بن عمار مرسلہ مروی ہے کہ یہ آیت چار ماہ اور دس روز کی عدت بتلانے والی آیت سے منسوخ ہے اور نیز آیت میراث بھی اس کی ناسخ ہے۔

اور مجمع البیان میں حضرت صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ پہلے یہ دستور تھا کہ جب ایک شخص مر جاتا تھا تو اس کی بیوہ پر ایک سال تک اسی متوفی کے مال سے خرچ کیا جاتا تھا اور پھر میراث دیئے بغیر اس کو گھر سے نکال دیا جاتا تھا پس اس حکم کو چوتھائی یا آٹھواں حصہ کی میراث والی آیت نے منسوخ کر دیا۔ پس اب عورت کا خرچ اپنے

حصہ میراث سے ہوگا۔

وَالْمُطَلَّاتُ اَلْحِیَ - طلاق شدہ عورت کے حقوق کی تفصیل گزر چکی ہے۔ متعہ (فائدہ پہنچانا) صرف اس مطلقہ کے لئے واجب ہے جو غیر مدخولہ ہو۔ اور اس کا مہر مقرر نہ ہو ورنہ غیر مدخولہ جس کا مہر معتد ہو اس کو طلاق کے بعد نسبت مہر دیا جائے گا۔ اور مدخولہ مطلقہ کو اگر مہر معتد ہو تو سالم مہر ورنہ مہر مثل دیا جائے گا۔ یعنی مطلقہ کی ان تینوں قسموں کے لئے مذہب امامیہ میں متعہ نہیں ہے۔

بِالنَّكَاحِ ط -

خداوند حکیم نے ان احکام میں معروف کے لفظ کو بار بار دہرایا ہے اور انہی آیات میں اسی لفظ کا بارہ دفعہ تکرار کیا ہے۔ اس سے مقصود نکاح۔ طلاق اور ان سے متعلقہ جملہ احکام کی اہمیت کو واضح کرنا ہے اور ازدواجی زندگی کو خوشگوار بناتے ہوئے ہر پہلو میں خوش اسلوبی کے برتاؤ کی تاکید ہے اور معروف کی لفظ مقتضائے عقل، حکم شرع اخلاقی فرائض اور بلند کرداری ہر ایک کی رعایت کو شامل ہے۔

نسوانی زندگی پر اسلام کا احسان

عورت کی حیثیت متہن اور غیر متہن اقوام میں ہمیشہ جدا گانہ رہی ہے لیکن مجموعی طور پر اسے انسانی زندگی کے حقوق سے محروم ہی رکھا گیا ہے۔ بعض ملکوں میں عورت کی حیثیت عام پالتو حیوان کی سی تھی۔ مرد کو کلی اختیار تھا کہ اس کو فروخت کرے یا عاریتہ کسی کو دے دے۔ اسی طرح اس کے کھاتے پیئے اور رہنے سہنے کے لئے حیوانات کا سا سلوک ہوتا تھا اور ساتھ ساتھ گھر کے تمام کاروبار کا بوجھ اسی کے سر پر رہتا تھا حتیٰ کہ بعض مقامات پر حسب ضرورت اس کو ذبح کر کے کھا لینا بھی معیوب نہ تھا بلکہ مرسوم تھا۔

اور بعض ملکوں میں شوہر کی موت عورت کے لئے بدترین طریقہ پر پیغام اجل تھی کیونکہ یا تو اسے نذر آتش یا زندہ درگور کیا جاتا تھا اور یا پھر انتہائی بد حالی، کس میرسی اور ذلت شعاری کی زندگی کے لمحات گزارنے اس کو نصیب ہوتے تھے۔ عورت کے ساتھ کھانا مرد اپنی توہین سمجھتے تھے عرب لوگ لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے پر فخر محسوس کرتے تھے اور جب کسی کے ہاں لڑکی پیدا بھی ہو جاتی تو شرمساری سے اس کا سر جھک جاتا اور منہ سیاہ ہو جاتا۔ ہاں لڑکوں کی پیدائش پر بڑی خوشی محسوس کرتے اور ان کی کثرت پر ناز کیا کرتے تھے خواہ حلال طریقے سے پیدا ہوئے ہوں یا حرام طریقے سے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کرتا تھا کہ ایک لڑکے کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے متعدد لوگ دعویدار ہو جایا کرتے تھے اور آخر کار قرعہ اندازی سے فیصلہ ہوا کرتا اور جس کو لڑکا مل جاتا اس کے

گھر خوشی ہوتی اور اس کو تہنیتی پینامات پہنچتے تھے۔

لڑکی کو زندہ درگور کرنے کی ابتداء بنی تیسرے کی تھی۔ جس کی وجہ یہ ہوئی کہ نعمان بن منذر بادشاہ عرب کے ساتھ ایک مرتبہ ان کی ٹکڑ ہوئی جس میں ان کی شکست ہوئی اور نعمان بن منذر نے ان کی بہت سی لڑکیوں کو اپنی اسیری و کنیزی میں لے لیا جس کا انہیں بڑا درد ہوا۔ پس اس کے رد عمل میں انہوں نے اس فعل شنیع کا ارتکاب کیا اور رفتہ رفتہ ان کی اس بد رسم نے روئی کی آگ بن کر عرب کے دیگر قبائل کو بھی اپنی لپیٹ لے لیا۔

غرضیکہ اسلام سے قبل عورت کی زندگی عمومی طور پر حیواناتی زندگی تھی۔ اسلام جو ایک فطری دین ہے۔ اس نے عورت کے حقوق کی پامالی پر مبصرانہ تنقید کرتے ہوئے انسان کو عدل و انصاف کی دعوت دی اور صنفِ نازک کے حقوق پر روشنی ڈالتے ہوئے اسے انسانی زندگی میں مردوں کے دوش بدوش کھڑا کیا اور فطرت کے اصولوں پر مرد و عورت ہر دو کو انسانیت کی تعمیر و تخریب میں برابر کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ پس ابتداء عالم سے آج تک کی تمام غلط رسوم اور انصاف کش نظریات پر قلم نسخ پھیر دیا اور صنفِ نسواں کو حیوانیت کے تاریک و نحس دور سے نکال کر انہیں انسانیت کی پاک اور روشن فضا میں رہنے کو جگہ دی۔ نیز مردوں کو ان کی اہمیت کی طرف متوجہ فرما کر انہیں ان کا برابر طور پر شریکِ زندگی قرار دیا۔

پیدائشی مساوات قرآن نے صاف طور پر اور کھلے لفظوں میں اعلان فرمایا کہ ہم نے تم کو نہ مادہ سے پیدا کیا ہے۔ یعنی مرد و عورت عالم وجود میں انسانی مشینری کے دو اہم پڑے ہیں اور جس مادہ و عنصر سے مرد کی تخلیق ہوئی ہے، عورت کی پیدائش بھی اسی سے ہے لہذا پیدائشی حق میں عورت مرد کے ساتھ برابر کی حصہ دار ہے۔

عبادت میں مساوات قرآن نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ خدا عورت یا مرد میں سے کسی کے اعمال کو ضائع نہیں کرتا اور نیز ارشاد فرمایا کہ اللہ کے نزدیک مکرم وہ ہے جو اس سے زیادہ تقویٰ کرے۔ پس خدا نے اپنے قرب کا معیار تقویٰ کو قرار دے کر عورت و مرد کو برابر طور پر اس کی طرف دعوت دی۔ بنا بریں منازلِ عرفان و ایقان اور مراتبِ اعمال و افعال میں آگے بڑھنے کے لئے عورت کو مرد کے دوش بدوش چلنے کا حکم دیا۔ پس وہ عورت جو ایمان میں راسخ، عمل میں کامل، علم و دانش میں سابق اور حسنِ اخلاق میں بلند ہو وہ اسلامی نقطہ نظر سے ان مردوں سے افضل و ارفع ہے جو ان صفات سے تہی دامن ہوں۔

پس جس طرح مرد ترقی کر سکتا ہے اسی طرح عورت کے لئے بھی یہ راہیں مسدود نہیں۔ جنت کی بشارت میں مرد و عورت دونوں کو یکساں خطاب ہے اور جہنم کی عقوبت بصورتِ نافرمانی مرد و عورت دونوں کے لئے برابر ہے اور قرآن نے عربوں کی اس رسم کی بھی پُر زور مذمت فرمائی۔ جس کے ماتحت وہ معصوم لڑکیوں کو زندہ دفن کرتے تھے

بہر کیف اللہ کے نزدیک اطاعت گزار کی قدر و منزلت ہے خواہ مرد ہو یا عورت اور اس کی بارگاہ قرب اور صاحبِ عزت و شرف سے دور بلکہ اس کے قہر و غضب کا مورد وہ ہے جو نافرمانی کرے خواہ مرد ہو یا عورت ہو۔ مسلمانوں میں اپنی سابقہ جاہلی رسوم میں سے بعض رسمیں تاحال موجود ہیں۔ مثلاً خداوند کریم کے نزدیک زنا کاری گناہ کبیرہ ہے اور اس جرم کے مرتکب کے لئے سنگساری کی سزا ہے اور عورت و مرد دونوں اس سزائیں شریک ہیں۔ لیکن رسم جاہلی کے ماتحت زنا میں صرف عورت کو مجرم سمجھا جاتا ہے اور مرد کو کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہوتا۔ عورت کی زنا کاری خاندان کے لئے شرمساری کی موجب سمجھی جاتی ہے اور بخلاف اس کے مرد کی زنا کاری پر پورے خاندان میں اگر افتخار کا اظہار نہ بھی ہوتا تاہم شرمساری کا تو نام و نشان ہی نہیں ہوتا۔ اور یہ عرب کی جاہلی رسم کا ایک شرمناک مظاہرہ ہے۔

تمدنی مساوات قرآن نے انسانی تمدن میں عورت کو مرد کے ساتھ برابر کا حصہ دار قرار دیا ہے۔ خورد و نوش اور تمام لوازم زندگی میں جس طرح مرد کمانے کا حق رکھتا ہے اسی طرح عورت بھی حقدار ہے چنانچہ فرماتا ہے کہ مردوں کے لئے اپنا کمایا اور عورتوں کیلئے اپنا کمایا۔ مرد اگر عورت کا وارث ہے تو عورت بھی مرد کی وارث ہے۔ ہاں ایک طرف اگر وراثت میں مرد کو عورت سے دگنا دیا جاتا ہے تو دوسری طرف مصارف زندگی میں عورت پر اخراجات کی ذمہ داری کا کوئی بوجھ نہیں رکھا جاتا۔

پس قرآن نے احکام عبادات و شرائع میں عورتوں کو مردوں کے ساتھ برابر کا شریک کیا ہے۔ سوائے بعض خصوصی موارد کے جن سے عورتوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے جن کا تعلق ان کی صنفی کمزوری و معذوری سے ہے۔ اور اسی طرح صنفی موزونیت کے ماتحت بعض احکام عورتوں سے ہی اختصاص رکھتے ہیں اور ان سے مرد مستثنیٰ ہیں۔ بالجملہ خداوند کریم نے ہر لحاظ سے عورت کو حیوانیت کی پست زندگی سے نجات دے کر اسلام کے ذریعہ سے اس کو انسانیت کی بلند سطح پر قرآن کی روشنی میں قدم آگے بڑھانے کی اجازت دی ہے اور اس کی صنفی اور وضعی بعض کمزوریوں کے پیش نظر اس کو بعض ایسے امور میں داخل ہونے سے منع فرمایا ہے جو اس کی وضع کے منافی ہیں جس طرح جنگ و جہاد اور حکومت و قضا وغیرہ اور بعض امور کی پابندی اس پر خصوصیت سے غائد کر دی ہے جو اس کی صنفی وضع کے لئے انتہائی طور پر موزوں و مناسب ہیں۔ مثلاً پردہ داری، اطاعت شوہر اور تربیت اولاد وغیرہ

مسئلہ مساوات کی مزید توضیح حقوق میں عورت و مرد کی مساوات کا یہ مطلب نہیں کہ ہر معاملہ میں عورت مرد کے برابر قرار دی جائے۔ مثال کے طور پر بچہ، بوڑھا اور جوان سب کی حیثیت یکساں ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسانی فرائض کی بجائے مردی میں بچہ جوان اور بوڑھا سب کی حیثیت

یکساں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جسمانی ساخت اور مناسب قوت برداشت کو ملحوظ رکھ کر ہر ایک کو تمدن میں حصہ دیا جائے یعنی حصہ بقدر جثہ۔ اسی طرح فطری احساسات اور جبلتی رجحانات کے موزوں و مناسب تقاضے عورت اور مرد کو تمدنی زندگی میں تقسیم کار پر مجبور کرتے ہیں۔ پس عورت فطری طور پر اپنی مناسب شان سے جس گوشہ زندگی میں رہنے کی حقدار ہے اُسے اس حد سے پیچھے ہٹانا تقریظ اور آگے بڑھانا افراط ہے اور مرد قدرتی طور پر اپنی موزوں اقدار کے ماتحت زندگی کے جس میدان میں قدم رکھنے کا سزاوار ہے اس کا اس حد سے پیچھے رہنا فرض ناشناسی اور کوتاہ اندیشی ہے اور آگے بڑھنے کی کوشش کرنا حدود سے تجاوز اور اقدار الہیہ سے کھلی ہوئی بغاوت ہے۔

○ مرد کی ساخت خشونت آمیز ہے اور اس کے مقابلہ میں عورت کی وضع لطافت و نزاکت کا مرقع ہے۔

○ مرد قوت و توانائی کا مظہر ہے اور بخلاف اس کے عورت کمزوری و توانائی کا مجسمہ ہے۔

○ مرد میں چستی و ہوشیاری اس کی نوعی خصوصیت ہے اور عورت میں سستی اور تساہل شعاری اس کی صنفی اقتضائے

○ مرد کو دل و گردہ مضبوط دیا گیا ہے جو مصائب و آلام میں کوہ گراں کی طرح جم کر گردش دہر کے طوفانی بگولوں کو سر سے گزار سکتا ہے اور انتہائی کڑی اور سنگین منزلوں میں پوری دل جہتی سے حوادث زمانہ کا ثبات قدم کے ساتھ مقابلہ کر سکتا ہے لیکن عورت کے قلب و جگر میں بیتاب کہاں؟ وہ تو معمولی سے معمولی گھریلو معاملات کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانا تو درکنار اُلٹا ان کے الحجاؤ کا موجب بنتی ہے اور تار عنکبوت کی طرح انہیں اپنی گردن کا پھندا بنا کر اپنی زندگی بھر کے لمحات کو نیم مُردنی حالت میں تبدیل کر لیتی ہے اور ایک ادنیٰ ترین مصیبت کی چوٹ اس کے جگر کو پاش پاش کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے اگر اس کے دل کا غبار اور جگر کا دھواں سحاب غم بن کر آنکھوں سے برس نہ پڑتا تو ذرہ سی مصیبت اس کے لئے جان لیوا ہو جاتی۔ اور ہر مصیبت و تکلیف ناقابل برداشت ہو کر اس کے حرکت قلب کے بند ہو جانے کا بہانہ بن جاتی۔

○ مزاج کے لحاظ سے مرد میں قوت منفرد اس کو بلند کرداری کی دعوت دیتی ہے۔ لہذا وہ اصلاح و تسخیر عالم میں اپنی قوتوں کو صرف کر کے عالم میں نمایاں مقام حاصل کرنے کے درپے ہوتا ہے لیکن عورت کی قوت منفرد کا محیط نظر اور اس کی سوچ بچار کی آخری منزل جسمانی نمائش ظاہری حسن، سحر آفرین وضع قطع اور جاذب نظر شکل و صورت تک محدود ہوا کرتی ہے جس کا پس منظر صرف تسخیرِ قلوب اور عمومی نتیجہ تعمیرِ قصر محبت و شہوت اور تخریبِ منزل معرفت و مردت ہوتا ہے۔ بالجمہ مرد کا نتیجہ فکر ہے دین یا دنیا میں سرفرازی یا نام و نمود میں سر بلندی اور عورت کا نتیجہ فکر ہے محبت بازی اور فریب نگاہی۔ پس اس کے لئے سر پر آرائی زیبہ اور اس کے لئے حسن آرائی موزوں تر ہے۔

نیز مرد میں خود اعتمادی، خود داری اور احساس برتری کا جوہر اس کا فطری نشان ہے لیکن بخلاف اس کے

عورت ان صفات سے یکسر محروم ہے۔ بلکہ عورت کی صنفی پوزیشن ان صفات سے منافی اور متضاد ہے۔ اس قسم کے بے حد و حساب فطری امتیازات موجود ہیں جو مطالعہ قدرت سے زن و مرد کے باہمی تفادات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اگر صفات نفس میں آپ غور فرمائیں گے تو بعض صفات جو مردوں میں موجب کمال ہیں وہ عورتوں میں نقص شمار ہوتے ہیں اور اس کے برعکس بعض صفات جو مردوں میں باعث نقص ہیں وہ عورتوں میں موجب کمال شمار ہوتے ہیں۔ کیونکہ فطری طور پر عورت و مرد میں کمال کا معیار الگ الگ ہے۔ ہاں بعض مردوں میں ان کے شایان شان صفات کا فقدان اور نامناسب رجانات کا وجود یا بعض عورتوں میں مردوں کی سی بعض صفات کمال کا ظہور ان کے باہمی صنفی تفادات پر اثر انداز نہیں ہو سکتا لہذا نوع انسانی کے فلاح و بہبود کے لئے وضع شدہ قواعد کلیہ اور ضوابط عامہ اس قسم کے جزوی اور شاذ و نادر انداز کی خاطر نہ نظر انداز کئے جاسکتے ہیں اور نہ قابل تخصیص یا ترمیم ہو سکتے ہیں۔ مسئلہ مساوات کی مکمل وضاحت ہماری کتاب ”اسلامی سیاست“ میں ملاحظہ فرمادیں۔

بنابریں نوع انسانی کی نشو و نما اور بقاء ارتقاء کے لئے جب زن و مرد کا باہمی اختلاط متعارف فطرت کے حکیمانہ تدبیر نے ضروری قرار دیا۔ جس کا قرآن مجید نے بطور ارشاد کے اعلان فرمایا ہے تو تمدنی اور معاشرتی اصول کے ماتحت حاکم و محکوم کے تعین اور افسردہ ماتحت کے فرق کا اپنی فطری اقدار کے ماتحت بطور ضابطہ قرآن کی زبان سے کھلے لفظوں میں اعلان فرمادیا کہ اَلْاِنْسَانُ جَالٌ قَوَّامٌ عَلٰی الْاِنْسَاءِ (مرد عورتوں پر حاکم ہیں) اس میں نہ عورت کی حق تلفی ہے اور نہ مرد کی پاسداری۔ بلکہ یہ فطری اور مناسب تقسیم کار میں ایک اصولی اور بر محل انتخاب ہے اور اعلان خالق صرف ارشاد کے طور پر ہے ورنہ عقل سلیم خود عورت کو اس کی فطری پوزیشن کے ماتحت مرد پر حکمانہ تسلط عطا کرنا انسانیت کی توہین بلکہ موت سمجھتی ہے۔

اسلام نے عورت و مرد کی باہمی آمیزش اور قلبی آویزش کو منظم و مرتب کرنے کے لئے حد بندی کے طور پر سلسلہ نکاح کا اجراء فرمایا اور اس کے لئے ضروری حدود معین کر دیں تاکہ افراط و تفریط کی راہیں مسدود ہو جائیں۔ نکاح کی پابندی میں متعدد خوبیوں کو مدنظر رکھا گیا ہے جن کا کما حقہ احصا اور اس کی مصالح کا واقعی استقصاء فہم بشر سے بالاتر ہے چونکہ انسان کو عالم موجودات میں دستار کرامت کا حامل قرار دیا گیا ہے لہذا اس کے عنصری و مادی وجود کو جو ہر عقل سے نوازا گیا جو اس ظلمانی ڈھانچے میں علم و معرفت کا روشن چراغ اور نورانی قندیل ہے اگر موجودات عالم کے عام نرم مادہ کے ادارہ جنسی تعلقات کو انسان کے لئے جائز قرار دیا جاتا۔ تو انسان کا طرہ امتیاز خاک میں مل کر رہ جاتا۔ نیز عقل کا وجود کا عدم ہونا اور لوح انسانیت انسان کے امتیازی نقوش سے خالی رہ جاتی۔

جملہ حیوانات، انسانوں کی طرح جسم و روح کا مجموعہ ہیں۔ ان میں ارادہ۔ شوق۔ غضب شہوت وغیرہ قوتیں

موجود ہیں وہ حواس ظاہریہ اور حواس باطنیہ کے بھی حامل ہیں۔ البتہ صرف جو ہر عقل سے وہ محروم ہیں ان میں باہمی جنسی تعلقی کا سلسلہ ہے لیکن حواس ظاہریہ و باطنیہ کی موجودگی کے باوجود ان میں جنسی تعلقات کی تنظیم کا شعور نہیں وہ محرم و نامحرم کے احساس سے خالی ہیں۔ ماں، بہن، بہو، بیٹی کی تمیز وہ نہیں کر سکتے۔ نسلی امتیاز ان کی فہم سے بالاتر ہے۔ اسی طرح وہ اپنی و بیگانی جائز و ناجائز کا فرق نہیں کر سکتے۔ وہ اعتدال و بے اعتدالی کے مفہوم سے نا آشنا ہیں۔ ان میں حیا و بے حیائی، شرم و بے شرمی، مردت و بے مردتی، عزت و بے عزتی، شرافت و کمینگی، حلال و حرام اور نکاح و زنا کی کوئی تمیز نہیں، لہذا ان کی اولاد نہ حلال زادہ ہے نہ حرام زادہ، کیونکہ حلال زادے اور حرام زادے کا فرق تو اس جگہ ہے جہاں حلال و حرام میں فرق بھی ہو۔ لیکن جہاں حلال و حرام میں کوئی امتیاز تک نہ ہو وہاں حلال زادے یا حرام زادہ کا کوئی معنی ہی نہیں رہتا۔ اور یہ سب اس لئے ہے کہ ان کے پاس عقل موجود نہیں۔ پس اگر انسان جو ہر عقل کی موجودگی میں ان مذکورہ بالا معانی کو سمجھنے کے باوجود ان کے وجود و عدم اور اثبات و نفی میں عملی فرق نہ کرے یعنی حلال و حرام، عزت و بے عزتی، شرافت و کمینگی، محرم و نامحرم، اپنی و بیگانی، اور نکاح و زنا کو سمجھنے کے بعد بھی عملی طور پر حیوانات کی طرح بے تمیزی کا رہنا سہنا برداشت کر لے۔ تو انسان کا وجود صحیفہ عالم میں کلنک کا ٹیکہ ہوگا جو صرف غلط کی طرح بنا دینے کے قابل ہو جائے گا۔ پس انسان کا فطری شعور اور طبعی احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ اپنے امتیازی نشان کو برقرار رکھتے ہوئے سلسلہ تولید کو منظم و مرتب طریق سے جاری کرے۔ تاکہ نسل انسانی کا سلسلہ آوارگی سے محفوظ رہ سکے اور حلال زادہ و حرام زادہ میں فرق ہو جائے اور فطری تقاضوں کو پورا کرنے والا انسان بھی وہی ہے جو قیود نکاح کے اندر رہ کر نسل انسانی کو حلال طریق سے آگے بڑھائے ورنہ اس میں اور حیوان میں صرف برائے نام ہی فرق ہوگا اور اس کا اپنے تئیں اشرف المخلوقات کہنا صرف لفظ لسانی اور دعوئے زبانی ہوگا۔ ورنہ درحقیقت وہ اللہ کے نزدیک حیوانات سے بھی بدتر ہوگا کیونکہ حیوان بے چارے تو دولت عقل سے محرومی کی بدولت حلال و حرام کی تمیز سے نا آشنا ہی لہذا وہ قابل مواخذہ نہیں۔ لیکن اگر انسان تمیز رکھنے کے بعد بھی بد تمیزی کا مرتکب ہو تو ظاہر ہے کہ وہ حیوانوں سے بھی بدتر ہوگا۔ پس موجودات عالم میں انسان کے لئے پہلا امتیازی نشان ہے سلسلہ تولید و تناسل کی تنظیم اور زن و مرد کے جنسی تعلقات کا انضباط جس کو زبان شرع میں نکاح کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے۔

تعدد نکاح چونکہ فطری طور پر مرد و عورت میں سے ہر ایک اپنی اولاد میں برابر کا شریک ہے جس طرح وہ اولاد مرد کی ہے اسی طرح عورت کی بھی ہے لیکن مرد کی فطری حاکمانہ پوزیشن اور عورت کی فطری محکومانہ زندگی کا اقتضاء یہ ہے کہ جس طرح جملہ معاملات میں ملکیتی پہلو مرد کی طرف منسوب ہوا کرتا ہے مثلاً یہ گھر فلاں کا ہے یہ زمین فلاں کی ہے حالانکہ مرد و بیوی دونوں انتفاع میں برابر کے شریک ہوا کرتے ہیں بلکہ یہ نسبت مرد کے عورت

انتفاع زیادہ حاصل کرتی ہے کیونکہ گھر میں مرد کم رہتا ہے اور عورت زیادہ رہتی ہے اسی طرح تمام خانگی منفعت کی چیزوں میں گو ملکیت مرد کی طرف منسوب ہے لیکن موقع پر زیادہ سے زیادہ فائدہ عورت ہی اٹھا سکتی ہے کیونکہ وہ گھر سے کم باہر نکلتی ہے۔ پس اسی مناسبت سے اولاد کو بھی باپ کی طرف ہی منسوب کیا جاتا ہے۔ حالانکہ دونوں ماں باپ اُن میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

بنابریں عورت کے لئے بیک وقت متعدد نکاح مردوں میں اولاد کے پیش نظر نزاع و فساد کا پیش خیمہ تھے جو نوع انسانی کے لئے موجب خطر ہے لیکن مرد کے لئے متعدد نکاح اس خطرہ سے باہر ہیں کیونکہ ملکیتی پہلو ہی اسی کی طرف منسوب ہے نیز پہلی صورت میں نسلی امتیاز قطعاً موجود نہیں رہ سکتا اور دوسری صورت میں نسلی امتیاز یقیناً موجود ہے نیز عورت کی حکومانہ پوزیشن اور خانگی امور کی ذمہ داری اور بچوں کی تربیت و نگہداری بیک وقت ایک سے زیادہ نکاح کے لئے اس کو قطعاً اجازت نہیں دیتی۔ بخلاف مرد کے۔ کیونکہ وہ فطری حاکمانہ حیثیت کے ماتحت ان ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہے۔

علاوہ ازیں مرد پیدائشی طور پر تعداد میں عورت سے کم ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ عام ملکوں کی مردم شماری کے اعلانات صاف بتلاتے ہیں کہ عورتیں تعداد میں مردوں سے زیادہ ہیں۔ پس قدرتی نظام اس امر کا متقاضی ہے کہ مرد کے لئے بیک وقت متعدد نکاح کی اجازت ہو۔ ورنہ انسانی عمومی نظام کنٹرول سے باہر ہو جائے گا

اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ مرد کو جسمانی ساخت قوت و توانائی و جملہ اوصاف مردانہ کے ماتحت جہاد و دشمن کا سامنا بھی ہوا کرتا ہے اور عورت سے یہ فریقہ اس کی فطری وضع کے ماتحت ساقط ہے لہذا مردوں کا ایسے مواقع میں مارا جانا خلاف توقع نہیں اور اگر جنگ نہ بھی ہو تب بھی حفاظت مال، جان اور ناموس کے سلسلہ میں مردوں کو متعدد دفع جان پر کھیلنا پڑتا ہے۔ بہر کیف قتل و غارت میں صرف مردوں کا ہی حقد ہے اور عورت ان حالات سے بری ہوتی ہے لہذا مرد کیلئے متعدد نکاح اگر جائز نہ ہوتے تو نظام انسانی میں ہرج مرج واقع ہو جاتی اور ایک عورت کیلئے بیک وقت متعدد نکاح تو جلتی پرتیل کا کام دیتے پس معلوم ہوا کہ تعدد ازواج مرد کا فطری حق ہے جس کی قرآن کریم نے ترجمانی فرمائی ہے اس کو مرد کو بے راہ روی یا عورت کی حق تلفی پر محمول کرنا فطری اقدار کا مقابلہ اور قدرتی نظام سے بغاوت نہیں تو اور کیا ہے؟

اور چونکہ ازدواجی زندگی کی بناء اتحاد و تعاون اور اصلاح تمدن پر ہے لہذا اس بارے میں تشدد اور زبردستی خواہ مرد کی طرف سے ہو یا عورت کی جانب سے ہو۔ انسانیت

پر ظلم عظیم ہے ابتدائے عقد میں اگر تشدد یا زبردستی کو عمل میں لایا گیا تو سرے سے عقد ہی فاسد ہے اور ایسے عقد کو قرآنی عدلیہ قطعاً ناقابل تسلیم قرار دیتا ہے اور عقد کے وقوع کے بعد باہمی ازدواجی دور میں اگر خلاف عدل کوئی بات مرد یا عورت کی جانب سے وقوع پذیر ہو تو شرعی طور پر جرم عظیم ہے۔ صرف مرد کے لئے ضروری نہیں کہ وہ عدل

کا مظاہرہ کرے بلکہ جس طرح مرد پر عورت کے حقوق سے عہدہ برآری ضروری ہے۔ اسی طرح عورت پر بھی مرد کے حقوق کی پاسداری واجب ہے جو لوگ مرد کے لئے تعدد ازدواج کے مسئلہ کی تردید کرتے ہیں۔ وہ ظاہراً یہی اڑے کر شرعی قانون سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ مرد پر عورتوں کے درمیان عدل کی حدود کیا ہیں اور آیا اس صورت میں عورتوں پر بھی کوئی مندریغہ عائد ہوتا ہے یا نہیں؟

جہاں تک شرعی ذمہ داری کا تعلق ہے مرد پر عورتوں کے نان و نفقہ اور مکان رہائش کا انتظام ضروری ہے۔ مرد پر یہ ضروری نہیں کہ اپنی تمام منکوحہ عورتوں کے نان و نفقہ اور مکان رہائش میں بھی ہر حیثیت سے مساوات رکھے۔ البتہ اس پر مجموعی طور سے ان کی ضروریات کی تکمیل ضروری ہے جو ان کے مناسب حال ہو اور سب کے لئے ایک صنف کا کپڑا۔ ایک نوع کا کھانا اور ایک قسم کا مکان وغیرہ خود ساختہ مسائل میں سے ہے جس کی شریعت ذمہ دار نہیں ہے اور اسی طرح مرد پر واجب ہے کہ عورتوں پر شب بامشی کو تقسیم کرے اور اس بارہ میں کسی کی حق تلفی نہ کرے۔ البتہ مباشرت و ہمبستری میں مساوات ضروری نہیں۔ نیز محبت و چاہت میں بھی برابری ضروری نہیں کیونکہ یہ ایک قلبی چیز ہے اور ہو سکتا ہے کہ ایک سے محبت زیادہ ہو اور دوسری سے کم۔ جس طرح کہ حضرت عائشہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آنحضورؐ کی ان سے زیادہ محبت تھی ہاں ظاہری حقوق و احکام و معاملات میں شرعی متعینہ حدود سے باہر قدم نہ رکھا جائے اسی طرح عورتوں پر بھی لازم ہے کہ وہ ہر لحاظ سے مرد کی مرضی سے قدم آگے نہ بڑھائیں اگر وہ مرد کو خواہ مخواہ تنگ کریں۔ بات بات پر مرد سے نبرد آزمائی اپنا شیوہ بنالیں، معمولی معمولی باتوں میں الجھ کر جھگڑا کرنے کی عادت بنالیں۔ ہر معاملہ میں مرد کو مورد طعن و تشنیع قرار دیں۔ اور اس کی عدالت و انصاف پر نکتہ چینی کریں تو شرعی قانون عورتوں کی اس قسم کی ہنگامہ آرائیوں اور شرپسندیوں سے ہرگز گردن زدنی نہیں ہو سکتا۔

عورت پر پردہ داری، امور خانہ داری، بچوں کی پرورش و نگاہ داری وغیرہ کی ذمہ داری ہے جو کہ اس کی جسمانی و وضعی ساخت اور فطری پرداخت سے عین موزوں و مناسب ہے اور اس کے مقابلہ میں مرد حاکمانہ حیثیت سے عورت کے جملہ اخراجات ضروریہ کا ذمہ دار ہے۔ نیز محکومانہ حیثیت سے وہ عدل و انصاف کے پیش نظر خانگی منافع سے بہرہ اندوز ہونے کا حق رکھتی ہے اور مرد حاکمانہ حیثیت سے خانگی، گلی و جڑی امور میں مالکانہ اختیارات کا حامل ہے۔

وقوع نکاح میں اگرچہ طرفین کی رضامندی ضروری ملحوظ رکھی گئی ہے۔ لیکن مرد کی حاکمانہ پوزیشن کے ماتحت ازدواجی سلسلے کے توڑنے کا حق صرف مرد کو دیا گیا ہے کیونکہ مرد کی ذہنی صلاحیتیں عورت کی ذہنی صلاحیتوں

سے کہیں زیادہ ہیں اور ازدواجی مصالح کو جس طرح مرد سمجھ سکتا ہے، عورت نہیں سمجھ سکتی۔ اسی لئے یہ فیصلہ مرد کے ہاتھ میں دیا گیا ہے۔ ہاں بعض نااہل مردوں کی طرف سے قانون شرع کی توہین کے مظاہرات قانون کی خرابی کے موجب نہیں ہو سکتے۔

دراشت میں عورت کو مرد سے نصف دیا جاتا ہے لیکن اس کے مقابلہ میں عورت کا خرچہ مرد پر عائد کیا گیا ہے طلاق کے بعد جس طرح مرد کے لئے دوسری عورت سے نکاح جائز ہے اسی طرح عورت کے لئے دوسرا شوہر جائز ہے۔

عدت کی مصلحت

طلاق یا موت کی صورت میں عورت کو عدت کا پابند کیا گیا ہے تاکہ عورت کی حیثیت عام حیوانات کی طرح نہ سمجھی جائے کہ ایک ملکیت کے زائل ہونے کے بعد فوراً دوسری ملکیت کا پھندا اس کی گردن میں ڈال لیا جائے۔ نیز اس کی محکومانہ زندگی کے پیش نظر اس کو سوچنے کا موقعہ دیا گیا ہے کہ سابقہ تجربات کے ماتحت جدید شوہر کے انتخاب میں اپنے مستقبل کی بہبود کا خیال رکھے اور اندھا دھند دوسرے شوہر کے انتخاب میں عجلت سے کام نہ لے۔ بخلاف اس کے مرد کی چونکہ حاکمانہ پوزیشن ہے لہذا اس کو اتنی مدت کی انتظار کا پابند نہیں کیا گیا۔ کیونکہ ناخوشگواہی کی صورت میں طلاق سے اس کی گلو خلاصی آسانی سے ہو سکتی ہے۔ بخلاف عورت کے کہ بے سوچے سمجھے نکاح کر لینے کے بعد ناخوشگوار حالات کے رونما ہونے کی صورت میں مرد سے اس کا طلاق کی خواہش کرنا اس کے وقار کے منافی ہے اور اس کی عفت و پاکدامنی کے لئے مورد طعن ہے۔ کیونکہ مرد کا عورتوں کو بار بار طلاق دینا اتنا معیوب نہیں جتنا کہ عورت کا مردوں سے متواتر طلاق حاصل کر کے ایک کے بعد دوسرے کے نکاح میں جانا معیوب ہے کیونکہ یہ عورت کی خست مزاجی اور گستاخانہ ذہنیت کی دلیل ہے لہذا شریعت مقدسہ نے ایک مرد سے آزاد ہو جانے کے بعد عورت کو عدت کا عرصہ آزادانہ طور پر سوچنے کے لئے عطا فرمایا کہ وہ ازدواجی زندگی کے نشیب و فراز کو خوب سوچ کر شوہر سابق سے عملی تجربہ جو اسے ہو چکا ہے اس کے ماتحت پوری طرح غور و خوض کر کے عقد جدید کا فیصلہ کرے اور ہر امکانی طریقہ سے ایسی ناخوشگوار فضا میں دیدہ و نستہ کوڈ پڑنے سے گریز کرے۔ جس کا نتیجہ اختلاف و افتراق ہو اور ظاہر ہے۔ کہ عدت و فوات یا عدت طلاق میں عورت کے لئے وقار کا جو پہلو مضمر ہے وہ بلا تاخیر ایک مرد سے دوسرے مرد کی طرف منتقل ہونے میں نہیں ہے اور علاوہ بریں عورت میں حمل کا احتمال بھی اس امر کا مقتضی ہے کہ اس کو ایک شوہر سے فراغ کے بعد ایک مدت تک آزاد رہنا چاہیے اور بعض مقامات پر حمل کے نہ ہونے کا یقین ایک کلیہ قاعدہ اور عام قانون کے لئے باعث تفصیل نہیں ہو سکتا۔ بالجمہ فوات یا طلاق کے بعد عورت کا عدت کی انتظار کرنا اور مرد کا انتظار نہ کرنا عورت کی حق تلفی یا مرد کی پاسداری پر مبنی نہیں۔ بلکہ

فطرتِ انسانی کا تقاضا یہی ہے۔

قانونِ نکاح کی خلاف ورزی کرنے میں جس طرح عورت مجرم ہے اسی طرح مرد مجرم ہے اور ہر دو برابر طور پر سزا کے مستحق ہوا کرتے ہیں اور توبہ کا دروازہ بھی ہر دو کے لئے یکساں کھلا ہے و علیٰ ہذا القیاس۔

خلاصہ بحث پس معلوم ہوا کہ عورت و مرد حقوق میں برابر ہیں جس طرح مرد کو جینے کا حق ہے اسی طرح عورت کو بھی حاصل ہے اور اسلام سے قبل عورت جن جن مصائب اور بدترین مظالم کا شکار تھی اسلام نے اس کو ان سے پوری طرح محفوظ کر لیا۔ لہذا عورت و مرد یکساں طور پر میدانِ عمل میں قدم رکھ سکتے ہیں اور خداوندِ کریم کی بارگاہ میں جس طرح مرد شرفیاب ہو سکتا ہے اسی طرح عورت بھی ہو سکتی ہے۔ نیز اخروی نعمات مرد و عورت دونوں کے لئے یکساں ہے اور قربِ خداوندی کے لئے تقویٰ ہر دو کے لئے یکساں طور پر معیار قرار دیا گیا ہے اور علم و معرفت کے دروازے بھی ہر دو کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوئے ہیں اور احکامِ فروعیہ میں بھی دونوں برابر کے مکلف ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ فطری جداگانہ ساخت اور صنفی باہمی تفاوت کے پیش نظر بعض احکام میں اختلاف ان کی یکسانیت کے اتلاف کا موجب نہیں ہو سکتا۔

پس دینی و دنیاوی ترقی کے لئے عورت و مرد دونوں برابر طور پر آگے قدم بڑھانے کے حقدار ہیں لیکن عورت اپنے فطری راستے پر اور مرد اپنے موزوں طریقہ پر عورت اپنی مخصوص ذمہ داریوں کی پاسبانی کرتے ہوئے اور مرد اپنے عہدہ کی نگہداشت کرتے ہوئے اور حقوقِ زندگی میں مساوات اسی کا نام ہے۔ مرد کا عورت کے حقوق پر دست درازی کرنا یا عورت کا مرد کے حقوق پر ہاتھ ڈالنا اور مرد کا اپنے حقوق سے کوتاہی کرنا، یا عورت کا اپنے حقوق سے غفلت شعاری کر کے اپنی حدود کو مچاندنا ان شرائط و قفس لٹ ہے اسے مساوات کی مقدس لفظ سے تعبیر کرنا انصاف کا خون ہے۔ عورت کا مرد کے دوش بدوش میدانِ عمل میں قدم بڑھانا اگر اپنے اپنے مناسب و موزوں طریق سے ہو اور اپنی اپنی متعینہ حدود کے اندر ہو تو یہی ہے۔ فطرت کا مقرر کردہ سیدھا راستہ جن کو اسلام نے پیش کیا ہے اور اسی کا نام ہے آزادی۔ پس عورت بھی آزادی سے اپنے مقصد کی طرف بڑھے اور مرد بھی آزادانہ اپنے مقصد کی طرف اقدام کریں اور ایک دوسرے کے دوش بدوش دینی و دنیوی ترقیاتی سکیموں کو عملی جامہ پہنائیں لیکن اپنی اپنی حدود کے اندر رہ کر اور یہی ہے اسلامی آزادی و فطری مساوات۔

اشتراکیت کا پس منظر انسان کے مدنی الطبع ہونے کے پیش نظر اجتماعی زندگی کے اصول کی تشکیل میں نظریات ہمیشہ سے متداول رہے ہیں اور ہر دور کے عقلاء انسانی

تمدن میں اصلاح و فلاح کے لئے قوانین مرتب کر کے اجتماعی نظام کی مصلحتی کا اعلان کرتے چلے آئے ہیں لیکن روزِ اول سے لے کر قیامت تک کے لئے اسلام نے اجتماعی زندگی کا جو نظام پیش کیا ہے وہ عقلانی تدابیر اور

امکانی مصالح پر حاوی ہے۔

اشتراکیت کا ڈھونگ بھی من جملہ انہی نظریات کے ہے جو سیاست مدنیہ اور اجتماعی نظام کی خوبی کے لئے منظر عام پر آئے جس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کی ہر شے ہر ایک کے لئے ہے اور ہر چیز میں ہر فرد برابر کا شریک ہے۔ اس نظریے میں صرف انسان کے حیواناتی پہلو کا لحاظ رکھا گیا ہے اور اس کے امتیازی نشان کو سرے سے نظر انداز کیا گیا ہے کیونکہ ہر شے کا ہر ایک کے لئے ہونا مسلم طور پر حیوانی تمثیلات میں سے ہے حیوان کے نظریے میں زمین کی کسی پیداوار میں ملکیتی رنگ ناجائز تفرق ہے وہ ماکول و مشروب اور ازدواجی تعلقات میں تخصیصات کے دشمن ہیں۔ لیکن بخلان اس کے انسان میں عقل و ادراک کا جو ہر جو حیوانی زندگی میں اشتراکی نظریے کے مقاصد کو سمجھتا ہے۔ اُس نے ملکیتی نظریہ اپنایا۔ اور عقول انسانی اسی نظریے کے ماتحت تمدن و اجتماع کی اصلاح کے لئے ہمیشہ قوانین مرتب کر کے نافذ کرتے رہے لیکن انسان بحیثیت ممکن کے ہزار دانا ہو اور لاکھ دانشمند ہو۔ انسانی اجتماعی زندگی کی جملہ خوبیوں پر محیط نظر اور حاوی مطالعہ تو رکھ نہیں سکتا اور نہ تمام مصالح و مفاسد پر عبور اس کے حیطہ امکان میں ہے یہی وجہ ہے کہ عقلاً زمانہ کے وضع کردہ قوانین ہر دور میں تینخ و ترمیم کی زد میں آتے رہے ہیں اور ایک دور میں جو قانون انتہائی سوچ بچار کے بعد مبنی بر اصلاح قرار پا کر نفاذ پاتا ہے فوراً کچھ عرصہ بعد اس کے مفاسد سامنے آکر اس کی تینخ کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور قوانین تمدن میں یہ جوڑ توڑ ہمیشہ سے رہا ہے اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہر معنی اپنے ذاتی جذبات و رجحانات کے ماحول میں تمدن کی اصلاح سوچتا ہے اور متعدد افراد کے جذبات و خواہشات میں وحدت و یکسانگی نہایت مشکل ہے پس ایک دور میں جب یک گونہ جذبات میں اکثریت رونما ہو جائے تو اقلیتی جذبات اُن کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ پس اکثریتی رجحان کے ماتحت اجتماعی قانون پاس ہو جاتا ہے اور مقبوضا عرصہ بعد جب اقلیتی فرقہ اپنی تحریک میں اکثریت کا رنگ حاصل کر لیتا ہے۔ تو وہ اس قانون کے مقابلہ میں بغاوت کا علم بلند کر کے دوبارہ مجلس مشاورت کے انعقاد کی دعوت دیتا ہے اور حسب موقعہ اپنی خواہشات کے ماحول میں قانون کو نیا لباس پہنا کر اپنی ذہنی فتح اور دماغی کامیابی پر فخر و مباہات کرتا ہے اور یہی سلسلہ جاری و ساری رہا کرتا ہے۔ پس قانون تمدن جذبات کے اکثریتی میلان کا نام ہے۔ اس میں فرق نہیں۔ جمہوریت ہو یا شخصیت۔ قانون سازی کی رفتار یہی ہے اور لطف یہ کہ ہر قانون میں ذاتی مفاد کے لئے اور اپنے تئیں اس کی زد سے بچانے کے لئے بعض شقیں ایسی رکھ دی جاتی ہیں۔ جو بوقت ضرورت کام میں لائی جاسکیں۔ اسی وجہ سے عوام میں ایک مقولہ مشہور ہے کہ قانون چھوٹے طبقہ پر سوار ہوتا ہے اور بڑا طبقہ قانون پر سوار ہوتا ہے۔

اسلامی قوانین چونکہ خالق کائنات کی طرف سے وضع شدہ ہیں جو عالمی مصالح پر حاوی بھی ہیں اور جذبات و خواہشات کے ماحول سے بلند و بالا بھی۔ ان میں یہ امکان نہیں کہ کسی قانون میں کوئی مصلحت عمداً جذباتی طور پر یا سہواً اور

لا علمی کے رنگ میں نظر انداز کر دی گئی ہوگی۔ تاکہ ترمیم یا تنسیخ کو اس میں سراغ مل سکے۔ البتہ رفتارِ زمانہ اور گردشِ دہر کے پیش نظر بعض مصالح عامہ میں تبدیلی ناگزیر ہے جو قانون میں ترمیم و تنسیخ کو دعوت دیا کرتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ادیانِ گذشتہ یکے بعد دیگرے منسوخ ہوتے رہے اور در اسلام تک نوبت پہنچی۔ اب اس دین کے بعد خدا کی طرف سے کسی نئے دین نے قدم رکھنا نہیں۔ لہذا اس کے قوانین میں وہ پختگی و دوام ملحوظ رکھ دیا گیا کہ ادوار و ازمناہ کا تفاوت ان کی مصالح میں تبدیلی پیدا کر کے ان کو قابلِ نسخ نہ بنا سکے۔

چونکہ خدائی قوانین میں شخصی و انفرادی جذبات و خواہشات کو ملحوظ نہیں رکھا گیا اور نہ ان میں برسرِ اقتدار طبقہ کے لئے بعض شقیں ایسی رکھی گئی ہیں کہ بوقتِ ضرورت ان سے فائدہ اٹھا سکیں بلکہ ان میں تو وہ یکسانیت ملحوظ ہے کہ چھوٹے سے لے کر بڑے تک اور فقیر سے لے کر شہنشاہ تک سب کے سب برابر طور پر اس کی زد میں آتے ہیں اور کسی کی ذرہ بھر رعایت نہیں ہوتی۔

لہذا ہر دور میں انسانوں کا اکثریتی طبقہ اسلامی نقطہ نگاہ سے باغی رہا ہے اور تمدنی قوانین میں اپنی رائے کو استعمال کرتا چلا آیا ہے تاکہ حکمران طبقہ کے جذبات کا احترام ہو سکے اور کوئی قانون ان کی خواہشات کو کچل نہ سکے جس کا لازمی نتیجہ یہی سامنے آتا رہا ہے کہ قانونِ نت نئے جنم لیتا ہے اور قانون سازی کی مشینِ نت نئے پُرزے تیار کرتی ہے اور انسانیت کو کبھی اطمینان و سکون کا سانس نصیب نہیں ہو سکا اور نہ تمدن و اجتماع میں اصلاح کا پروگرام مرتب ہو سکا بلکہ ہر نیا دن نئے خطرے کا الارم بے کر آیا اور دنیا روز افزوں تر رہی ہے بے اطمینانی اور بے چینی کی منزلیں طے کرتے ہوئے ہلاکت کے قریب سے قریب تر ہوتی گئی اور بایں ہمہ خدائی قانون اور اسلامی نظریہ اپنانے کی جرات تک نہیں کی گئی کیونکہ اس میں جذبات کا التوسیدھا نہیں ہوتا اور دوسری طرف خود ساختہ قوانین اپنی داخلی بیماریوں اور اندرونی کمزوریوں کے پیش نظر تمدن کی اصلاح اور امن عامہ کی بحالی سے خود قاصر ہیں۔ لہذا انسانوں کا ایک امن پسند طبقہ اٹھا اور انہوں نے اشتراکیت کا جھنڈا بلند کر دیا کہ انسانوں کو اپنی موجودہ حیثیت سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر حیوانی ماحول میں پلٹ جانا چاہیے ممکن ہے کہ وہاں کچھ اطمینان و سکون نصیب ہو جائے۔ گویا انتہائی سطحِ نظر اور محض فکرِ صرف یہی نکتہ ہے کہ جذبات و خواہشات کو بھی ٹھیس نہ لگے اور تمدن کی راہیں بھی سہوار رہیں۔ حالانکہ یہ اجتماعِ ضدین ہے کیونکہ انفرادی جذبات اور شخصی خواہشات کا باہمی اختلاف تضاد بلکہ تصادم تک پہنچ کر اشتراکیت میں بھی چین نہیں لینے دے گا اور نظریہ اشتراکیت میں بھی صرف بڑے بڑوں کے جذبات کا احترام ہوگا چھوٹے چھوٹوں کے لئے وہی ظلم و تشدد کے آہنی شکنجے تیار رہیں گے، اچھے محل، عمدہ بیویاں، خوبصورت لباس اعلیٰ مشروبات، نفیس کھانے آرام دہ سواریاں اور قیمتی سامان یہ سب کچھ صرف صاحبانِ اقتدار کے لئے اور انہی لوازمِ زندگی میں سے رومی و ناقص اشیاء عوامِ طبقہ کے لئے مخصوص ہوں گی اور بایں ہمہ زبان

پر بلا تامل اشتراکیت کی رٹ جاری ہے کہ ہر شے ہر فرد کے لئے ہے۔

بہر کیف تمدنی قوانین کے متعلق یہ نظریہ ہے کہ جو عمومی اجتماعی زندگی سے وابستہ ہیں اور ان کا تعلق صرف اسی فانی اور چار روزہ زندگی سے ہی ہے اور بس۔ ان اجتماعی قوانین میں قطعاً اس امر کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا کہ اس دور فانی کے بعد انسان کا کوئی اور ٹھکانا بھی ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو ہمیں اس کے لئے کیا کرنا ہے۔

اسلامی قوانین کی نظر چونکہ صرف اسی فانی دور تک محدود نہیں بلکہ اس کی نظریں اخروی دور پر بھی ہیں بلکہ اخروی دور ہی درحقیقت اس کا مطمح نظر ہے یعنی اسلامی نگاہوں میں دنیاوی زندگی صرف عبوری دور ہے اور اخروی زندگی قیام و سکون کی حقیقی منزل ہے۔ لہذا اسلام اس فانی زندگی کی اصلاح اُس باقی اور غیر فانی زندگی کے لئے کرتا ہے بنا بریں وہ اس زندگی کی خواہشات و جذبات کو پینے کی کھلی اجازت نہیں دیتا مگر اس حد تک کہ بقیر اس کے گزارہ نہ ہو سکے اور اسلام سے باغی ذہنیتیں چونکہ حیاتِ اخروی کے مفہوم سے نا آشنا ہیں اور وہ مالِ زندگی اسی چند روزہ قیام کو قرار دیتی ہیں اور جذبات و خواہشات کی تکمیل کے لئے ان کی نظر میں کوئی دوسرا محل مناسب تو ہے نہیں۔ لہذا وہ کسی قیمت پر اپنے جذباتِ تعیش کو کچلتے پر آمادہ نہیں ہو سکتے اور حصولِ اقتدار کو تکمیلِ جذبات اور تنمِ شہوات کا زینہ قرار دے کر اس کے لئے ہر ممکن قربانی کے لئے تیار ہوتے ہیں اور اس کے بعد اشتراکیت و ملکیت کے نظریے اور عمومی اصلاح و فلاح کے قوانین اور اجتماعی و تمدنی زندگی کے ضوابط صرف اقتدار کی بحالی کے حیلے اور حربے ہیں اور درحقیقت تسکینِ خواہشات اصل مقصد ہے کیونکہ اس دور فانی کے بعد وہ کسی ایسی زندگی کا تصور نہیں کرتے جو سکون و اطمینان کی زندگی ہو یا اگر اس زندگی غیر فانی کا تصور کرتے بھی ہیں تو عقیدہ اتنا ناقص ہوتا ہے کہ اُس اخروی زندگی کے مفاد کو اس فانی زندگی پر ترجیح نہیں دے سکتے اور نہ اس کے حصول کے لئے اس عبوری دور کی خواہشات و جذبات کی قربانی کر سکتے ہیں۔

لیکن اسلام چونکہ اُسی حیاتِ جاودانی کے پُر سکون و پُر اطمینان ماحول میں ابدیت اور لازوال انتفاع کی خوشخبری سناتا ہے لہذا اس زندگی کی تعمیر کو اُس زندگی کی تعمیر کا زینہ بناتا ہے۔ پس اسلام کی نظریں یہ زندگی عبوری دور ہے اور آخرت مقصد سفر ہے لہذا اجتماعی زندگی کی بھلائی کے ساتھ ساتھ اسلام نے نفسی اصلاح اور خانگی بہبود کے لئے بھی قوانین و ضوابط پیش کئے ہیں۔ نفسی اصلاح و فلاح کے ضوابط کا نام ہے علمِ الاخلاق اور خانگی اصلاح کے قواعد و ضوابط کا نام ہے تدبیرِ منزل اور زن و مرد کے باہمی تعلقات اور ازدواجی زندگی کے اصول و فروع اور اس کی فلاح و کامیابی کے ضوابط تدبیرِ منزل کے ماتحت ہیں۔

اسلام سے برسرِ پیکار طبقہ چونکہ اخروی حیثیت کو ملحوظ نہیں رکھتا اور صرف ظاہری تمدن ان کے سامنے ہے لہذا وہ عورت کے لئے تحریکِ آزادی صرف ظاہری تعیش اور اسی فانی سکون و آرام کی خاطر کرتے ہیں

اور اسی میں تمدن کی بھلائی سمجھتے ہیں اور اشتراکیت کا پس منظر بھی یہی ہے اور چونکہ صرف یہی ظاہری پہلو ان کا مطلع نظر ہے لہذا عفت و پاکدامنی، عصمت و شرافت اور غیرت و حمیت وغیرہ فاضلہ صفات ان کی نگاہوں میں فضول اور بے فائدہ ہیں اس لئے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا صرف لذت اندوزی اور تعیش مزاجی کے لئے ہے۔ اور کامیاب انسان وہ ہے جو لذت زندگی سے جی بھر کر سیر ہو سکے۔ پس حیا و شرافت اور عفت وغیرہ یہ صفات ان کے نزدیک مفاد زندگی سے متصادم ہیں لہذا وہ ان کو راستے سے ہٹا کر ظاہری زندگی کو صاف اور پُر لطف بنانے کے درپے ہوتے ہیں اور عورت کی تحریک آزادی کا صرف یہی مطلب ہے لیکن اسلام چونکہ اس دنیا کو عبور گاہ قرار دیتا ہے۔ جیسے کشتی پر سوار انسان۔ کیونکہ کشتی اس کیلئے منزل نہیں بلکہ منزل کشتی کے ماحل پر پہنچنے کے بعد آتی ہے اور حقیقی زندگی وہی ہے جو اس عبوری دور کے بعد نصیب ہوگی۔ لہذا عورت کے لئے حیا و شرافت اور عفت وغیرہ تمام صفات حسنہ کو اس فانی دور میں تعیش مزاجی کے لئے سد راہ ہیں لیکن یہی فاضلہ صفات اس کی اخروی زندگی کا پیش خیمہ ہیں بنا بریں اسلام نے عورت و مرد کی ازدواجی زندگی کے لئے عام اجتماعی و تمدنی قوانین کے علاوہ خصوصی احکام بھی مرتب فرمائے ہیں تاکہ انسانی زندگی کے ہر دو پہلو دنیوی و اخروی سبب ہوئے ہوں نہ اس کے لئے ظاہری ترقی کی راہیں مسدود ہوں اور نہ اخروی ترقی کے راستے بند۔ لیکن چونکہ یہ زندگی دائمی نہیں لہذا اس زندگی کے لئے اسی قدر محنت کرنے کی ضرورت ہے جس قدر ناگزیر ہو اور باقی ماندہ تمام وقت اس زندگی کی اصلاح کے لئے وقف کرنا چاہیے جو دائمی اور باقی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے تدبیر منزل کے قوانین جس طرح اصلاح منزل کے لئے ہیں اسی طرح اس کے ضوابط اصلاح آخرت کے لئے بھی ہیں۔ مثلاً مرد کی حاکمانہ حیثیت اور عورت کی محکومانہ زندگی یا مرد پر اخراجات خانگی کا وجوب اور عورت پر بچوں کی ذمہ داری اسی قسم کے جملہ احکام اصلاح دنیا و آخرت ہر دو کے لئے ہیں۔ پس عورت کی تحریک آزادی کا نظریہ صرف آخرت سے ہی چشم پوشی نہیں بلکہ ظاہری شریفانہ زندگی کے لئے بھی سم قاتل ہے اور اشتراکیت جس میں عورت کو حیا و عفت سے بیگانگی کی تعلیم دی گئی ہے صرف جذبات و شہوات کی تکمیل کا بہانہ ہے اس کو تمدن کی اصلاح میں دخیل کرنا یا اجتماعی نظام میں مؤثر کہنا صرف سادہ لوح طبقہ کی آنکھوں میں دھول جھونکے کے مترادف ہے پس انسان کی حیوان سے ممتاز اور کامیاب زندگی کا مدار صرف اسلامی قوانین کی پیروی ہے اور بس اور ازدواجی زندگی کے لئے اسلام نے جو منطریات پیش فرمائے ہیں۔ عورت و مرد ہر دو کے لئے اس سے بہتر نہ کوئی لائحہ عمل ہے اور نہ ہو سکتا ہے اور بالخصوص منظر یہ طلاق جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ باقی ادیان عالم میں سے صرف اسی مقدس دین کا طرہ امتیاز ہے اور ازدواجی زندگی کو خوشی سے خوش تر اور خوب سے خوب تر بنانے اور زن و مرد کے باہمی تعلقات کو انتہائی خوشگوار رکھنے کے لئے جہاں مرد کے لئے عدل و انصاف اور عورت کے

لئے اطاعت شعاری اور مرد پر اخراجات و مصارف کا وجوب اور عورت پر خانگی تربیتی معاملات کا بوجھ تقسیم کار کے طور پر عائد کئے گئے ہیں تاکہ باہمی اختلاف و انتشار کا سدباب ہو سکے وہاں اختلاف و انتشار باہمی کا آخری حل طلاق قرار دیا گیا ہے تاکہ اختلاف باہمی کے لاعلاج ہونے کی صورت میں زن و مرد کے لئے ازدواج و بالی جان نہ بنارہے۔ بلکہ خیر و خوشی سے آزادانہ طور پر بذریعہ طلاق ایک دوسرے سے الگ ہو کر نئی ازدواجی زندگی میں قدم رکھنے کے قابل ہو سکیں۔

آج دنیا کی مجذب قومیں جن کے مذہب میں طلاق نہ تھی۔ نت نئے نزاعات و فسادات سے تنگ آکر ازدواجی زندگی میں طلاق کے لئے جگہ تلاش کر رہے ہیں جس کو اسلام نے آج سے پونے چودہ سو سال پہلے ضروری قرار دیا تھا۔ پس جذبات و خواہشات کی تکمیل میں انتہا پسندی اور افراط ہے ملکیت یا آمریت۔ اور اس میں آوارگی اور تفریط کا نام ہے۔ نظریہ اشتراکیت اور ان کے بین بین نقطہ اعتدالی پر جم کر رہنا۔ یعنی ان دونوں نظریوں میں حدود و ضروریہ کی پابندی اور میانہ روی کے نظریہ کا نام ہے اسلام۔ چنانچہ جملہ اسلامی فروعی ضوابط و احکام کا محور و مدار صرف یہی اصولی نظریہ ہے اور یہی ہے تعمیر انسانیت کا آخری پروگرام اور تکمیل نظام زندگی کا آخری کورس جو ہر شعبہ زندگی میں راہبری کے فرائض کی انجام دہی کر سکتا ہے۔ مسئلہ کی تفصیل اسلامی سیاست میں ملاحظہ فرمائیں

jabir.abbas@yahoo.com

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ

کبیر تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جو اپنے گھروں سے نکلے ہزاروں کی تعداد میں موت

حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ۖ ثُمَّ أَحْيَاهُمْ

کے ڈر سے ۔ پس فرمایا ان کو اللہ نے کہ مر جاؤ (تو وہ مر گئے) پھر ان کو زندہ کیا ۔

إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَر النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿۲۳۳﴾

تحقیق اللہ صاحب فضل ہے اوپر لوگوں کے ۔ لیکن اکثر لوگ (اس کا) شکر ادا نہیں کرتے

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۳۴﴾

اور تم لڑو اللہ کی راہ میں — اور جانو تحقیق اللہ سُننے جانتے والا ہے

موت کے بعد زندگی اور پھر موت

چونکہ کتب امامیہ میں بکثرت رجعت کے اثبات میں آئمہ ظاہرینؑ سے احادیث منقول ہیں اور یہی شیعی عقیدہ ہے کہ حضرت قائم اہل محمدؐ حج کے ظہور کے زمانہ میں خالص مومنین اور خالص اعدائے دین کو زندہ کیا جائے گا۔ اس پر مخالفین کی طرف سے اعتراض ہوتا ہے کہ موت صرف ایک دفعہ ہے اور اس کے بعد زندگی صرف قیامت کی زندگی ہے۔ دنیا میں دو دفعہ موت خلافت قرآن ہے تو ان لوگوں کی تردید میں قرآن کی ذیلی فرمائش کافی ہے کہ اگر خدا چاہے تو مردوں کو دوبارہ اسی دنیا میں زندہ کر سکتا ہے جیسا کہ یہ آیت صاف طور پر بتلا رہی ہے۔

قصہ :- مجمع البیان میں منقول ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک بادشاہ نے ان کو لڑائی کا حکم دیا پس وہ لڑنے سے بزدل پڑ گئے اور بہانا بنایا کہ وہاں دبا ہے جیتک دبا ختم نہ ہوگی ہم نہ جائیں گے تو خدا نے ان پر موت کو نازل کیا جب موتیں ان میں زیادہ ہوئیں تو وہ موت کے ڈر سے گھروں کو چھوڑ کر نکلی کھڑے ہوئے۔ پس اس پر بادشاہ نے ان پر بددعا کی اور وہ سب مر گئے جب اٹھ دن گذرے تو ان کے جسم بھول گئے اور بدبودار ہو گئے۔ لوگ ان کے دفن کرنے سے چونکہ عاجز تھے لہذا درندوں سے حفاظت کے لئے ایک گہرا گڑھا کھود کر ان کو اس میں ڈال دیا اسی حالت میں عرصہ گذر گیا۔ ان کی لاشیں بوسیدہ ہو گئیں۔ اسی اثناء میں حضرت حزقیلؑ پیغمبر کا وہاں سے گذر ہوا۔ تو متعجب ہوئے اللہ کی جانب سے وحی ہوئی کہ کیا میں تجھے اپنی نشانی دکھاؤں کہ کس طرح میں مردوں

کو زندہ کرتا ہوں تو پیغمبر نے عرض کی۔ ہاں! پس خداوند کریم نے ان کو زندہ فرمایا۔

ایک روایت ہے کہ وہ حضرت حزقیلؑ کی قوم تھی جب ان پر موت آئی تو وہ ان کی تلاش میں نکلے جب ان کو مردہ پایا تو رو دیئے اور عرض کی۔ اے اللہ! یہ میری قوم کے لوگ تیرے حمد گزار اور تسبیح خوان تھے اب ان کے بعد میں تنہا رہ گیا ہوں خدا نے وحی کی کہ میں نے تجھے اُن کے زندہ کرنے میں اختیار دے دیا ہے تو حضرت حزقیلؑ نے فرمایا:۔ احيوا باذن الله۔ یعنی خدا کے اذن سے زندہ ہو جاؤ۔ پس وہ زندہ ہو گئے۔

حمز بن اعین نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا یہ لوگ زندہ ہوئے اور لوگوں کے دیکھ لینے کے بعد مار دیئے گئے یا دنیا میں پلٹ کر دوبارہ آباد ہوئے؟ تو آپ نے فرمایا:۔ نہیں۔ بلکہ وہ گھروں میں کھاتے پیتے رہے شادیاں کیں اور ایک وقت تک زندہ رہے پھر ان کو وقت مقرر پر موت آئی۔

تفسیر برہان میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہ لوگ شام کے شہروں میں سے ایک شہر کے رہنے والے تھے اور وہ شہر ہزار گھرانے تھے اور ان میں طاعون کی وبا پڑتی تھی پس غنی لوگ شہر چھوڑ کر باہر چلے جاتے اور غرباء بوجہ تنگدستی کے کہیں نہ جاسکتے تھے پس یہ لوگ طاعون کا شکار ہو جاتے اور ان میں موت واقع ہوتی اور اس پر غنی لوگ یہ سمجھتے تھے اگر ہم نے شہر نہ چھوڑا ہوتا تو ہم میں موت زیادہ واقع ہوتی اور غرباء کہتے تھے کہ اگر ہم بھی باہر چلے گئے ہوتے تو موت سے بچ جاتے پس انہوں نے مشورہ کیا کہ اگر اب طاعون آیا تو ہم سب شہر چھوڑ کر باہر چلے جائیں گے چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اثنائے سفر میں وہ ایک اجڑی ہوئی بستی میں پہنچے جس کو طاعون نے ہی برباد کر دیا تھا۔ پس یہ لوگ وہیں مقیم ہو گئے۔

اللہ نے اُن پر موت کو بھیج دیا۔ پس وہ سب مر گئے وہ چونکہ ایک سڑک کے قریب تھے لہذا گذرنے والوں نے ان کی لاشوں کو رستہ سے دور علیحدہ ایک جگہ پر جمع کر دیا۔ اسی دوران میں بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر حضرت حزقیلؑ کا وہاں سے گذر ہوا تو ان کی بوسیدہ ہڈیوں کو دیکھ کر رو دیئے اور عرض کی۔ اے اللہ! جس طرح تو نے ان کو موت دی ہے اسی طرح تو زندہ بھی کر سکتا ہے پس وہ تیرے شہروں کو آباد کریں گے۔ تیری مخلوق بڑھے گی اور تیرے دوسرے عبادت گزاروں کی طرح یہ بھی عبادت کریں گے۔

ارشاد باری ہوا۔ کیا تو یہی چاہتا ہے؟ عرض کی! ہاں۔ اے پالنے والے۔ پس خدا نے ان پر اسم اعظم کی وحی فرمائی تو حضرت حزقیلؑ نے وہ اسم اعظم ان پر پڑھا۔ پس ان کے سامنے ان کی ہڈیاں گوشت پوست وغیرہ آپس میں ملنے لگ گئیں اور وہ زندہ ہو گئے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر انہوں نے خدا کی تسبیح و تکبیر و تہلیل کو زبان پر جاری کیا۔

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضِعَّهُ لَهُ أَضْعَافًا

کون ہے جو قرض دے اللہ کو۔ قرض حسن پس خدا اس کو بڑھا کر دے کئی گنا

كَثِيرَةً ۖ وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُطُ ۚ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۲۲۵﴾

زیادہ اور اللہ ہی تنگی اور فراخی عطا کرتا ہے اور اسی کی طرف تمہاری بازگشت ہے

راہِ خدا میں خرچ

مَنْ ذَا الَّذِي الْخ - تفسیر مجمع البیان میں آیت مجیدہ کا شان نزول یوں مروی ہے کہ جناب رسالتؐ نے صدقہ کا ثواب بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جو شخص صدقہ دے اس کو جنت میں اس کا دگنا عطا ہوگا تو ایک شخص ابوالدحداد انصاری نے عرض کی۔ یا رسول اللہ! میرے دو باغ ہیں۔ اگر ان میں سے ایک کو صدقہ میں دے دوں تو کیا جنت میں مجھے اس کا دگنا ملے گا؟ فرمایا ہاں! اس نے عرض کی کہ میرے بیوی بچے بھی میرے ہمراہ ہوں گے فرمایا۔ ہاں! پس اس نے ان دو باغوں میں سے بہترین باغ بطور صدقہ کے جناب رسالتؐ کے حوالہ کر دیا (مستحقین پر تقسیم کرنے کے لئے) تو یہ آیت نازل ہوئی۔ جب ابوالدحداد واپس آیا تو اس کے بیوی بچے اسی باغ میں گئے ہوئے تھے۔ جس کو وہ صدقہ میں دے چکا تھا۔ فوراً باغ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر اپنی بیوی کو بلایا اور کہا کہ میں نے یہ باغ صدقہ میں دے دیا ہے اور اس کے بدلہ میں باغ جنت خرید لیا ہے جس میں میرے بیوی بچے بھی میرے ہمراہ ہوں گے۔ اس نیک بخت بیوی نے جواب دیا۔ خدا تیرے سودا کو مبارک کرے۔ پس وہ سب اس باغ سے نکل آئے۔ اور باغ حضورؐ کے حوالہ کر دیا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِنْهَا۔ یعنی جو نیکی کرے پس اس کو اس کی بہتر جزا ملے گی۔ تو جناب رسالتؐ نے عرض کی۔ اے پروردگار اور زیادہ عطا فرما۔ پس یہ آیت نازل ہوئی مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ امثالِهَا۔ یعنی جو نیکی کرے گا۔ اس کو اس کی دس گنا جزا ملے گی۔ آپ نے عرض کی اے پروردگار! اس سے بھی زیادہ عطا فرما۔ پس یہ آیت مجیدہ نازل ہوئی کہ مَنْ ذَا الَّذِي الْخ - جو بھی اللہ کو قرض دے یعنی راہِ خدا میں صدقہ و خیرات کرے گا تو اس کو اس کی جزا بہت زیادہ بڑھا کر دی جائے گی۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ بہت زیادہ کا مطلب ہے کہ اس کو اس کی جزا اتنی ملے گی کہ حساب و شمار سے باہر ہوگی۔

عنوان الکلام میں جناب امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے کہ صدقہ کی پانچ قسمیں ہیں۔

(۱) ایک کے بدلہ میں دس گنا ثواب اور وہ صدقہ یہ ہے جو ایک فقیر مومن کو دیا جائے جس کے اعضاء صحیح اور سالم ہوں۔

(۲) ایک کے بدلہ میں ستر گنا ثواب۔ یہ وہ صدقہ ہے جو ایسے مومن کو دیا جائے جو خود کما کر اپنے اخراجات کو نبھانے سے عاجز ہو۔

(۳) ایک کے بدلہ میں سات سو گنا ثواب، یہ وہ صدقہ ہے جو مومن فقیر رشتہ دار کو دیا جائے۔

(۴) ایک کے بدلہ میں ستر ہزار گنا ثواب، یہ وہ صدقہ ہے جو والدین پر کیا جائے (یا والدین کے لئے کیا جائے)

(۵) ایک کے بدلہ میں ایک لاکھ گنا ثواب، اور یہ وہ صدقہ ہے جو مستحق مومن علم دین طلب کرنے والے کو دیا جائے۔

سلسلہ عزاداری سید الشہداء علیہ السلام میں خرچ کرنے کے متعلق وارد ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ذات پروردگار کی جانب سے ارشاد ہوا کہ اگر کوئی بندہ نبی مصطفیٰ حضرت خاتم الانبیاء کے نواسہ کی محبت میں اپنے مال سے کسی کو کھانا کھلائے گا۔ یا اس سلسلہ میں کوئی درہم یا دینار خرچ کرے گا۔ تو اس کو دنیا میں اس کا ستر گنا عطا کروں گا۔ اور آخرت میں اس کا مقام جنت ہوگا۔ اس کے تمام گناہ بخش دوں گا۔ مجھے اپنے عزت و جلال کی قسم اگر کسی مرد یا عورت کی آنکھ سے عاشورا یا کسی اور دن میں اس کی مصیبت پر ایک قطرہ آنسو جاری ہوگا۔ تو اس کے نامہ اعمال میں ایک سو شہید کا ثواب درج کروں گا۔

jabir.abbas@yahoo.com

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَكِ مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ

کیا تم نے نہیں دیکھا طوط ہر داران بنی اسرائیل کے بعد حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے

إِذْ قَالُوا لَنَبِيِّ لَّهُمْ اَبْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ

جبکہ انہوں نے کہا اپنے ایک نبی کو۔ کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کیجئے تاکہ ہم اللہ کی راہ

اللَّهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا

میں لڑیں۔ نہ ملایا نبی نے شاید اگر تم پر لڑنا فرض ہو جائے۔ تو تم نہ لڑو۔ انہوں نے

تُقَاتِلُوا قَالُوا وَمَا لَنَا اَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا

جواب دیا۔ ایسا کب ہو سکتا ہے کہ ہم نہ لڑیں اللہ کی راہ میں (حالانکہ حکم جہاد کے علاوہ یہ دکھ بھی تو ہے) کہ ہم کو

مِنْ دِيَارِنَا وَابْنَاءَنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا

اپنے گھروں سے نکال دیا گیا اور بیٹوں سے (جدا کیا گیا) پس جب ان پر مرضی کیا گیا لڑنا۔ تو سب پھر گئے

قَلِيلًا مِنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿۱۱۲﴾

سوائے چند آدمیوں کے اور اللہ ظالموں کو جانتا ہے

طاہوت کا قصہ اور معیار انتخابِ حُر وندی

آلَمْ تَرَ۔ تفسیر برہان میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی موت کے بعد بنی اسرائیل نافرمانیوں میں پڑ گئے دینِ خدا کو تبدیل کر ڈالا اور اللہ کے حکم سے سرکش ہو گئے۔ ان کو نبی ہدایت کرتا تھا لیکن اس کی اطاعت نہ کرتے تھے اور ایک روایت میں وہ نبی حضرت ارمیاء علیہ السلام تھے پس خدا نے ایک قبطنی بادشاہ جالوت نامی کو ان پر مسلط کر دیا کہ اس نے ان کو ذلیل و خوار کیا ان کے مردوں کو قتل و جلا وطن کر دیا مال چھین لئے اور ان کی عورتوں کو قید کر کے کنیزی میں رکھ لیا۔ بنی اسرائیل کا یہ دور غلامی اس قدر سخت تھا کہ وہ تمام شعبہ جاتِ زندگی میں استغلال کی دولت سے یکسر محروم کر دیئے گئے تھے آخر مصائب و آلام کے دُور نے ان کو ایک دفعہ خوابِ غفلت سے چونکنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ ان میں تحریکِ آزادی کی جس بیدار ہوئی اور بہت جلد وہ اپنی تحریکِ آزادی کی تنظیم کے لئے

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا

اور فرمایا ان کو اپنے نبی نے کہ تحقیق اللہ نے تم پر طالوت کو نبی مقرر فرمایا ہے۔ (وہ چیں بجیں ہو کر)

قَالُوا أَتَى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ

کہنے لگے وہ کیسے ہمارے اوپر حکومت کر سکتا ہے؟ حالانکہ ہم اس کی برتیت حکومت کے زیادہ

مِنْهُ وَلَمْ يُوتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ

حقدار ہی۔ اور اس کے پاس وسعت مال بھی نہیں ہے۔ (فرمایا نبی نے) کہ تحقیق اللہ نے تم پر اس کا انتخاب فرمایا

عَلَيْكُمْ وَزَادَكُمْ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي

ہے اور اس کو بڑھایا ہے وسعت علمی اور کمال جسمی کے لحاظ سے اور اللہ جس کو

مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۴۷﴾

چاہتا ہے ملک عطا فرماتا ہے اور اللہ ہی صاحب وسعت و علم ہے۔

اپنے نبی سے قائد اور صدر کے انتخاب کے خواہاں ہوئے اور نبی نے بحکم خداوندی طالوت کو نامزد فرما دیا جو باوجود ان کے سچ پا ہونے کے معزول نہ ہو سکا۔

مجمع البیان میں ہے کہ اس نبی کے نام میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ وہ شمعون بن صفیہ تھے جو لاوی بن یعقوب کی اولاد سے تھے بعض نے اس کا نام یوشع بن نون بتلایا ہے جو حضرت یوسف کی اولاد سے تھے اور حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے اس کا نام اشموئیل منقول ہے کہ زبان عربی میں اس کو اسماعیل کہا جاتا ہے اور مروی ہے کہ جب اشموئیل کو خدا نے مبعوث فرمایا تو چالیس برس تک تو وہ اچھی حالت میں رہے پھر اس کے بعد حبالوت اور عالقه کا معاملہ درپیش ہوا۔

تفسیر برہان کی سابقہ روایت میں ہے کہ بنی اسرائیل میں نبوت ایک خاندان میں (لاوی بن یعقوب کی اولاد میں) اور بادشاہت دوسرے خاندان میں (حضرت یوسف کی اولاد میں یا یہود کی اولاد میں) چلی آرہی تھی اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ اس زمانہ میں بادشاہ کے پاس لشکر کم ہوا کرتا تھا اور نبی ہی اس کے معاملہ کو مضبوط کیا کرتا تھا۔ پس اس نبی نے بحکم خدا ان کا بادشاہ مقرر کیا اور جب جہاد واجب ہوا تو وہ لوگ ثابت قدمی کے عہد سے پھر گئے اور تھوڑے ثابت قدم رہے اور تفسیر برہان میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ وہ تھوڑے بھی ساٹھ ہزار تھے۔

۱۱۔ خدائی انتخاب پر حوت زنی کی جو قطعاً ناجائز ہے۔

(۳) محض اس کی غربت و افلاس کے پیش نظر اس کو خاندان میں گھنٹیا قرار دیا۔ حالانکہ وہ بھی انہی کے خاندان سے تھا اور اولاد یعقوب میں سے تھا۔

(۴) نبی کی نص کے بعد بھی اس کے خلاف اجماع کا ڈھونگ ریایا۔

(۵) اپنے زعم باطل میں پستیہ کی فراوانی کو خاندانی شرف کے مقابلہ میں بے آٹے - یعنی جس کے پاس پستیہ ہو خواہ وہ پست قوم میں سے ہی ہو - وہ خاندانی شرف کا مقابلہ کر سکتا ہے -

۶) معیار انتخاب خداوندی بھی انہوں نے اپنے غلط نظریہ کے ماتحت کثرتِ مال و دولت کو سمجھا ہوا تھا۔

۷، لوگوں میں ہر دس سزائی اور ان کا نظم و نسق اور ان پر حکومتی کنٹرول وغیرہ ان چیزوں کا دار و مدار بھی ان کے نزدیک پیسہ تھا۔

اور بنی نے مندرجہ وجوہات سے سب کو رد کر دیا۔ تمہارے اعتراضات، قیاسات اور اجماعات وغیرہ انتساب

خداوندی کے مقابلہ میں لغو و بے معنی ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ اَصْطَفٰہُ۔ تحقیق اللہ نے ہی اس کا انتخاب کیا ہے۔ پس جس کو اللہ چن لے تو کسی نبی کے صحابی اس کے انتخاب پر ہزار اعتراض کریں، لاکھ قیاس کر لیاں کر کے اس کے خلاف اجماعی پروگرام قائم کریں۔ تاہم وہ اللہ کے انتخاب کو اپنے مقام سے ایک اینچ بھی ادھر ادھر نہیں کر سکتے۔

بنی اسرائیل نے اگرچہ اپنے نبی سے یہ خواہش کی تھی کہ آپ خود ہمارے لئے بادشاہ کا تختہ فرمائیں۔ لیکن نبی

نے ان کے جواب میں فرمایا۔ کہ خدا نے طاوت کو مستر فرمایا ہے گویا وہ نبی اپنے صحابہ کو یہ ذہن نشین کرا رہے تھے کہ تمہارا مجھ سے اس انتخاب کی خواہش کرنا بے محل ہے اور انتخاب کا حق صرف اللہ کی ذات کو حاصل ہے۔ کیونکہ وہ ہر شخص کے ظاہر و باطن کی جملہ خوبیوں یا برائیوں سے مطلع ہے لہذا اس کے انتخاب میں غلطی کا امکان نہیں ہوگا۔ پس اس مقام پر بنی اسرائیل کے نبی حضرت اشویل ہوں یا حضرت ارمیا۔ انہوں نے اس امر کا انکشاف بھی فرمایا ہے کہ نبی کا کام خدائی فرامین و انتخابات کا اعلان کرنا ہے اور بس۔ چنانچہ پہلی دفعہ فرمایا کہ خدا نے اس کو تمہارا بادشاہ مستر کیا ہے۔ جب انہوں اپنا اجماع اس کے خلاف پیش کیا اور بزبان اعتراض اپنے قیاسی مواد کو دہرایا۔ تو پھر بھی نبی نے اپنی طرف سے کچھ پیش کرنے کی بجائے سرداران بنی اسرائیل سے یہی فرمایا۔ کہ حضرات! بس اللہ نے اسی کو چنا ہے۔ لہذا تمہاری چوں و چرا اور قیل و قال سب بے ہودہ ہے۔

پس وہ نبی اپنی طرز کلام دلچیز جواب سے ان کے ذہن نشین یہی بات کرا رہے تھے کہ تمہاری میرے اوپر اس معنی میں ناراضگی بے سود ہے اور مجھ سے اس معاملہ میں نظر ثانی کی درخواست یا اس کے انتخاب کی منسوخی کی خواہش اور جدید انتخاب کی آرزو سب فضول ہے کیونکہ نہ میں پہلے سے اس قسم کے انتخاب کا مجاز تھا اور نہ اب اس کے نسخ و ترمیم کا مجاز ہوں۔ پہلے بھی اللہ نے انتخاب کر کے مجھ سے اعلان کر دیا تھا اور اب اس کی منسوخی یا ترمیم یا نظر ثانی کا حق بھی اُسی کو حاصل ہے گویا اللہ کے علاوہ صحیح انتخاب نہ کوئی کر سکتا ہے اور نہ کسی کو اس کا حق حاصل ہے پس نبی کو نہ اس کے جوڑنے کا حق ہے اور نہ توڑنے کا اختیار ہے۔

نیز نبی نے ان کے شور و غوغا سے متاثر ہو کر خدا سے نظر ثانی کی اپیل بھی نہیں کی۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ انتخاب خداوندی بغیر مصلحت کے ہو نہیں سکتا۔ اور جب مصلحت سے انتخاب ہوا ہے تو اس پر نظر ثانی کی اپیل کا مطلب یہ ہے کہ اُس کو خلاف مصلحت کرنے کے لئے عرض کی جائے اور یہ فعل ایک نبی سے نہیں ہو سکتا تھا۔

۲) آپ نے فرمایا۔ کہ خدا نے اُن کو علمی وسعت عطا فرمائی ہے۔ پہلے جواب میں صرف خدا کے انتخاب کا ذکر کیا جو ان کے تمام اعتراضات اور قیل و قال پر حاوی تھا۔ اس جواب میں ان کو اپنی اصولی غلطی پر تنبیہ فرمایا ہے کہ علم و جہل کے مقابلہ میں ہر حال میں علم کو ترجیح ہے۔ علم جہل پر حاکم ہے جس طرح روشنی تاریکی پر حاکم ہے جہل کی قیاس آرائیاں عالم کے وقار علمی میں رخنہ انداز نہیں ہو سکتیں اور چند جہل کا بل جلی کر شور و غوغا کر کے اجماعی صورت بنا کر ایک غلط جمہوریت کی آواز بلند کرنا ایک عالم کے متعلق خدائی انتخاب کو رد نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اجماعی و جمہوری انتخاب کا مطلب یہ ہے

- (جمہوریت اک راج ہے اقبال کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تو لا نہیں کرتے)
- انہوں نے غربت و افلاس کو معیارِ نا اہلیت قرار دیا تھا۔ خدا نے جہالت کو نا اہلیت و ناموزونیت کا معیار قرار دیا ہے۔
- انہوں نے پیسہ کی فراوانی کو معیارِ انتخاب قرار دیا تھا۔ خدا نے علمی و جاہلیت کو مدار و محور حکومتِ الہیہ قرار دیا ہے۔
- انہوں نے مالداروں کو خاندانی شرف کے مقابلے میں پیش کیا تھا۔ خدا نے علمی برتری کو خاندانی شرافت پر فوقیت دینے کا اعلان فرمایا۔
- انہوں نے صاحبِ افلاس و غربت کو حکومتی نظام سنبھالنے کے لئے اُن فٹ قرار دیا تھا۔ اور خدا نے صاحبِ جاہل کو عوامی نظم و نسق قائم رکھنے کے لئے ناموزوں قرار فرمایا ہے۔
- انہوں نے صاحبِ زر کو رعایا پر کنٹرول رکھنے کا اہل سمجھا تھا۔ اور خدا نے صاحبِ علم کو اس عہدہ کے لئے موزوں قرار دے کر منتخب فرمایا۔
- پس عالم بوریا نشین تخت و سار پر بیٹھنے والے جاہل سے افضل ہے لہذا اگر کوئی غنی ہو تو اپنے مقام پر ہوا کرے۔ لیکن اللہ کے نزدیک نہ اس کے خاندانی جاہ و جلال کی کوئی وقعت ہے اور نہ اس کے مالی کرد و فر کی کچھ قدر و قیمت ہے پس وہ حکومتِ الہیہ اور رعایا کے صحیح نظام کو قائم رکھنے کیلئے یقیناً نااہل اور غیر موزوں ہے اور ایسے کا انتخاب دامنِ انتخابِ الہی پر ایک بد نما داغ ہے۔
- اس کے برعکس اگر کوئی عالم ہے خواہ وہ فاقہ مست اور خاک نشین ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پیوند دار ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اللہ کے نزدیک عالم کی فاقہ مستی جاہل کی شکم پُری سے بہتر۔ عالم کی فقیری جاہل کی امیری سے بہتر۔ عالم کی فروتنی جاہل کی سچ و جج سے افضل اور عالم کی خاک نشینی، جاہل کی سریر آرائی سے محبوب تر ہے۔ لہذا وہی انتخابِ خداوندی کے لئے موزوں اور حکومتِ الہیہ کے نظام کے سنبھالنے کے لئے مزاوار تر ہے۔
- ۱۳۔ اس کے بعد اس نبی نے ان کو ایک اور غلطی کی طرف متوجہ فرمایا۔ تاکہ ان کو مصلحت و حکمتِ انتخابِ قدرت سے کسی حد تک آگاہی ہو جائے اور وہ یہ کہ دشمن کے مقابلہ میں صف آرائی کے لئے غنی اور مالدار ہونا کافی نہیں بلکہ وہاں جسمانی قوت کی ضرورت ہے اور اس میں طاوت تم سب سے زیادہ ہے۔ پس خدائی انتخاب کا تعلق ظاہری جذبات سے نہیں بلکہ حقیقی مصالح سے ہے جہاں دشمن سے جہاد کرنے کی ضرورت ہو وہاں سپاہ کی سرکردگی کے لئے وہ ہی موزوں تر ہو سکتا ہے جو شجاع اور مرد میدان ہو خواہ ظاہری نگاہوں میں فقر و فاقہ کی وجہ سے منظرِ انداز ہی کیوں نہ کیا جاتا ہو؛ اور یقیناً ایسے مقام پر ایسے شخص کا انتخاب جو مرد میدان

نہ ہو۔ خواہ مالدار وغنی ہو کرے۔ ناقابلِ عفو عقلی و روایتی غلطی ہے کیونکہ دشمن پر فتح یا بی حاصل کرنے کے لئے بہادری اور قوتِ جہانی کی ضرورت ہے نہ کہ دولتِ مندی اور توانگری کی۔

سوال: طاوت کو بھی علم و جہانی قوت اللہ کی عطا کردہ ہے اگر یہی چیزیں ان کو عطا فرمادیتا تو کیا حرج تھا جیسا کہ خداوند کریم نے طاوت کو عطا فرمائیں اور ان کو سرے سے ان چیزوں سے محروم رکھا تو پھر معیارِ انتخاب ان چیزوں کو قرار دینا ہی سب یکطرفہ سودا ہے؟

جواب: اسی سوال کا جواب وَاللّٰهُ یُؤْتِیْ مٰلِکَہُ۔ الخ سے دے دیا ہے یعنی مشیتِ خداوندی پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں۔ کیونکہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور یہ بھی اس کی مشیت ہے۔

الحاصل: بنی اسرائیل کی طرف سے طاوت پر دو اہم اعتراض تھے۔ پہلا اعتراض یہ تھا کہ وہ شاہی خاندان سے نہیں ہیں اور اس کی تعبیر انہوں نے اپنے استحقاق کے اظہار میں کی کہ نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْکِ۔ مقصد یہ ہے کہ شاہی خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ہم حکومت کا استحقاق رکھتے ہیں اور اس میں ضمنی طور پر طاوت کا عدم استحقاق اور اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی اور دوسرا اعتراض یہ تھا کہ وہ مالی حیثیت میں کمزور ہیں پس ان کے اعتراض کا جواب تو اس طرح دے دیا گیا کہ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰہُ۔ کہ اللہ نے چن لیا ہے گویا خاندانی استحقاق اس کے چناؤ کے مقابلہ میں کوئی وقعت و اہمیت نہیں رکھتا اور دوسرے اعتراض کا جواب اس طرح دیا کہ نظامِ مملکت کا سنبھالنا مالداروں پر موقوف نہیں بلکہ وہ حسن تدبیر اور جوہر شجاعت کا مہر ہون منت ہے اور جوہر شجاعت، قوت و توانائی کا محتاج ہے اور طاوت میں یہ دونوں خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں لہذا انتخابِ خداوندی بجا اور بر محل ہے۔

پہلے جواب میں جب یہ ارشاد ہوا کہ اس کو اللہ نے چن لیا ہے تو یہ شائبہ پیدا ہوتا تھا کہ بلا وجہ اور بغیر استحقاق کے حکومت کو شاہی خاندان سے نکال کر دوسرے کے حوالے کرنے میں کیا حکمت ہے؟ پس خداوند کریم نے دوسرے جواب میں حکمت کا تذکرہ فرمادیا۔ اور اعلان کر دیا۔ خدائی انتخاب کا تعلق اگرچہ اس کی اپنی مشیت سے ہے لیکن پھر بھی خالی از حکمت نہیں اور وہ حکمت یہ ہے کہ جس کو چنا جا رہا ہے وہ عالم بھی ہے اور شجاع بھی اور بادشاہت کے لئے یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ لیکن یہ مطلب چونکہ قدرے معرضِ خفا میں سے تھا۔ لہذا پھر مزید وضاحت کرتے ہوئے صاف اور کھلے لفظوں میں اعلان کر دیا۔ وَاللّٰهُ یُؤْتِیْ مٰلِکَہُ مَنۡ یَّشَآءُ۔ کہ کسی کو ملک کا عطا کرنا خدائی مشیت ہے۔ وہ جسے چاہے دے دے۔

وَاللّٰهُ وَاَسْمِعُ عَلَیْہُ۔ اس فقرہ میں پھر اسی شبہ کا ازالہ ہے کہ گو ملک کا کسی کو عطا کرنا میری مشیت

سے ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیے کہ مشیتِ عالی از حکمت ہوتی ہے بلکہ اللہ کا مشیتی فعل بھی حکمت کے ماتحت ہی ہوتا ہے لفظ **وَاسِعٌ** میں قدرت اور مشیت کے دائرہ کی وسعت کو بیان کرنا مقصود ہے اور **عَلِيمٌ** کی قید اس کی مشیت کی وسعتوں میں حکمت و علم کے دخل کی طرف اشارہ کرتی ہے جس طرح کہ صاحبانِ ذوق پر مخفی نہیں ہے۔

سوال :- اگر بنی اسرائیل نے بنی و خدا کے انتخاب پر اعتراض کرنا تھا تو پہلے اپنے میں سے ایک کو چن لیتے اور بادشاہ بنا لیتے۔ بنی سے اس چناؤ کی درخواست کیوں کی؟

جواب :- اس صورت کے بغیر ان کا اپنا چناؤ کسی صورت میں پایہ تکمیل تک پہنچ ہی نہ سکتا تھا۔ کیونکہ تمام سربراہانِ افراد اور سردارانِ قوم اپنا نام امیدواروں کی فہرست میں گنوا دیتے اور اس صورت میں تمام قبیلوں کی آپس میں سرچھیڑا ہو جاتی اور بدترین نتیجہ برآمد ہوتا۔ لیکن جب ان کے سامنے ایک ایسے شخص کا انتخاب ہوا جس کو وہ سب نہ چاہتے تھے تو اس کے خلاف ہنگامہ آرائی کر کے باہمی طور پر کسی ایک پر جمع ہو جانا ممکن تھا۔ کیونکہ اس صورت میں جذبات کا اُجماع چونکہ ایک مبین شخص کے خلاف شدت کی صورت میں ہوتا ہے لہذا یہ قربانی کرنا آسان ہوتا ہے کہ چلو میں نہ سہی کوئی دوسرا برادری کا آدمی سہی بہر کیف وہ نہ ہو جس کو ہم متفقہ طور پر نہیں چاہتے۔

نصیحت و عبرت قرآن مجید میں اس قسم کے واقعات اور حکایات صرف ظاہری دلچسپی کے لئے نہیں دہرائے گئے بلکہ چونکہ قرآن مجید قیامت تک کے لئے موعظہ بھی ہے اور دستور العمل بھی لہذا اس کے تمام قصص و حکایات تاقیامت امتِ مرحومہ اسلامیہ کے لئے دعوتِ عمل ہیں۔ ایک نبی کا واقعہ اور ان کی امت کے ساتھ گفت و شنید اعتراضات و جوابات اور ان سب کا ردِ عمل یہ باتیں صرف کانوں کی ہوس کو ٹھنڈا کرنے کے لئے نہیں بلکہ درس حاصل کرنے کے لئے ہیں۔

پس آیاتِ زیر بحث میں جہاں مقابلہ دشمن میں ثباتِ قدمی کی دعوت دی گئی ہے اور بزدلی کی مذمت کی گئی ہے۔ وہاں ساتھ ساتھ اس اہم مطلب کے چہرہ سے بھی نقاب کشائی کی گئی ہے کہ عہدہ حکومتِ الہیہ کے لئے عہدہ دار کا انتخاب صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جس کا اعلان کرنے کا نبی کو حق حاصل ہے۔ اور امت کو نہ اس پر اعتراض کرنے کی اجازت ہے اور نہ اس معاملہ میں ان کا اجماع کوئی وقعت رکھتا ہے۔ اب مسلمان ذرا سوچیں کہ ہمارے نبی نے بھی ہمارے اوپر کوئی حاکم مقرر کیا ہے یا وہ ہم کو اندھیرے میں چھوڑ کر چلے گئے تو اس کا جواب کتبِ فریقین سے بتواتر ملتا ہے۔ کہ نبی نے ہمیں بار بار بتایا۔ گھر میں بتایا۔ سفر میں بتایا۔ مسجد میں بیان کیا۔ جنگوں کے مواقع پر بیان کیا۔ فرداً فرداً سنایا۔ اور کھلے جلسوں میں بسانگ دہل اعلان فرمایا۔ پہلے پہل دعوتِ ذوالعشیرہ میں اپنی تصدیق کرنے والے کے لئے اپنے بعد کے لئے

خلافت کی پیش کش فرمائی۔

اور سب سے آخر میدان غدیر میں ایک لاکھ سے زیادہ کے مجمع میں کھلے الفاظ میں خلافت کا اعلان فرمایا اور صرف یہ نہیں بلکہ دستار بندی بھی کرائی اور صحابہ سے بیعت بھی کرائی اور صحابہ کرام نے بیچہ کٹ کے گرانقدر الفاظ سے علی کو خراج عقیدت بھی پیش کیا۔

ان کے علاوہ حدیث مواخات - حدیث طبر - حدیث منزلت وغیرہ میں صاف طور پر علی کی خلافت کو بیان فرمایا اور حدیث الثقلین کو کئی بار دہرا دہرا کر تمام مسلمانوں کے ذہن نشین کرانے کی کوشش فرمائی۔ کہ میرے بعد سوائے میری آل کے تمہارے لئے کوئی قرآنی مسائل کو حل کرنے کے لئے اہل نہیں ہے۔ یہی قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن اُن کے ساتھ ہے اور یہ آپس میں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ وہ تمہیں جو حق کوثر پر میرے پاس لے آئیں گے۔

لیکن افسوس کہ امت اسلامیہ نے گزشتہ واقعات کو صرف کانوں تک ہی محدود رکھا اور قرآن نے گزشتہ اقوام و ائم کے جس جس کو دار کو غلطی اور بے راہ روی سے تعبیر کیا تھا مسلمانوں نے صرف زبان سے قرآن کے فیصلہ کی تصدیق کر لی لیکن علی وہی کیا جو گزشتہ امتیں کر گزریں۔ حضرت رسالت اکبر کے مقرر کردہ خلفاء کو پیچھے ہٹانے اور دوسروں کو آگے بڑھانے میں وہی مہمانی تجویز کئے جو گزشتہ امتوں نے کئے تھے جن کو قرآن نے رد کر دیا تھا اور باوجودیکہ معیار قرآنی کے مطابق حضرت علی انتخاب حکومت الہیہ کے لئے تمام سے موزوں تر تھے اور خدا کی طرف سے منتخب بھی تھے۔ پوری امت میں نہ اُن سے بڑھ کر کوئی عالم تھا اور نہ ان سے زیادہ کوئی شجاع تھا۔ دیگر اوصاف کمالیہ میں بھی وہ اپنی نظیر آپ ہی تھے لیکن امت کا رویہ وہی رہا جس کو تاریخ گزشتہ کے طور پر قرآن نے عبرت حاصل کرنے کے لئے دہرایا تھا۔ اس مقصد کی مزید وضاحت ہماری کتاب "اسلامی سیاست میں ملاحظہ فرمائیں۔"

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ

اور ان کو اپنے نبی نے بتایا کہ تحقیق اس کے بادشاہ بننے کی علامت یہ ہے کہ تمہارے پاس

التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ

تابوت آئے گا جس میں سکین ہے (تمہارے لئے) تمہارے رب سے اور بقیہ (تبرکات) ان چیزوں سے جو

الْمُوسَىٰ وَالْهَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ إِنَّ فِي

چھوڑ گئے حضرت موسیٰ و ہارون کے ہاتھوں اس کو اٹھالائیں گے۔ تحقیق اس میں

ذَٰلِكَ لَآيَةٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿۱۲۸﴾

تمہارے لئے نشانی ہے۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

تابوت بنی اسرائیل

وَقَالَ لَهُمْ۔ گویا انہوں نے اپنے نبی سے طاوت کی بادشاہت کی نشانی طلب کی اور نبی نے یہ فرمایا کہ تمہارے پاس تابوت آئے گا اور برہان میں حضرت باقرؑ سے مروی ہے کہ یہ وہی تابوت تھا جس میں حضرت موسیٰ کو اپنی والدہ نے بند کر کے دریا میں ڈال دیا تھا اس میں تورات کی الواح اور موسیٰ کی زرہ اور دیگر تبرکات بند تھے بنی اسرائیل اس کی تعظیم کرتے تھے حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد وہ ان کے وصی و خلیفہ کے پاس تھی۔ پس کچھ عرصہ بعد انہوں نے اس کی تعظیم چھوڑ دی۔ حتیٰ کہ بچے اس کے ساتھ رستوں میں کھیل کر تے تھے جب تک انہوں نے تابوت کی عزت کی وہ خود بھی عزت میں رہے اور جب وہ گناہوں میں پڑ کر تابوت کی عزت سے کنارہ کش ہوئے تو مبتلائے مصائب ہو گئے اور مروی ہے کہ ان کے دشمن جب ان پر غالب ہوئے تو ان کے باقی سامان لوٹنے کے ساتھ ان سے وہ تابوت بھی چھین لئے گئے تھے۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ تابوت حضرت آدم پر اتر ا تھا اور اس میں تمام انبیاء کی تصویریں تھیں اور درثہ بورش بنی اسرائیل تک پہنچا تھا اور امام موسیٰ کاظمؑ سے مروی ہے کہ اس کا طول تین ذراع اور عرض دو ذراع تھا (برہان) لڑائی کے وقت اس کو شکر کے سامنے رکھتے تھے اور اس سے آواز پیدا ہوتی تھی اور چل پڑتا تھا اور فوج اس کے پیچھے چلتی تھی جب وہ ٹھیر جاتا تو وہ بھی ٹھیر جاتے تھے۔

فِيهِ سَكِينَةٌ۔ اس کے مطلب میں اختلاف ہے بعض روایات میں ہے کہ تابوت سے جنت کی ہوا نکلتی تھی اور وہی سکینہ تھی اور علامہ طبرسی نے فرمایا ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ سکینہ کا معنی امن و اطمینان ہو کیونکہ اس تابوت میں بھی بنی اسرائیل کے لئے سکون و قلب و اطمینان ہوتا تھا ممکن ہے کہ اس سے مراد آثارِ علم کا بقیہ اور تبرکاتِ انبیاء ہوں۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے سکینہ کا معنی دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ وہ اللہ کی پیدا کردہ روح تھی جو بولتی تھی اور جب اُن کو آپس میں اختلاف درپیش ہوتا تو وہ ان کے ساتھ کلام کرتی تھی اور خبر دیتی تھی (برہان)

اَلْمُوسَىٰ وَهَارُونَ۔ اس مقام پر آلِ موسیٰ و آلِ ہارون سے مراد خود موسیٰ و ہارون ہیں اور عرب میں آلِ فلاں بول کر خود وہ شخص مراد لینا عام اور کہتے ہیں کہ اس تابوت میں حضرت موسیٰ کی نعین اور حضرت ہارون کا عمامہ بھی تھا۔ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ۔ فرشتوں کے اٹھانے کا مطلب بعضوں نے تو یہی بیان کیا ہے کہ جانبِ آسمان سے فرشتے اٹھا کر لائے۔ چنانچہ ابن عباس سے یہی قول مروی ہے اور بعضوں نے کہا ہے کہ جب بنی اسرائیل کے دشمن ان پر غالب آئے اور ان سے تابوت چھین لیا۔ اور انہوں نے تابوت کو اپنے بتخانہ میں لے جا کر رکھ دیا۔ پس تابوت کے پہنچتے ہی تمام بُت منہ کے بل گر گئے۔ تو انہوں نے تابوت کو دہاں سے نکال کر شہر کے باہر کہیں رکھ دیا۔ پس ان لوگوں کی گردنوں میں درد پیدا ہو گیا اور جہاں تابوت رکھتے تھے وہاں و باد اور موت عام ہو جایا کرتی تھی۔ لہذا انہوں نے باہمی مشورہ کیا کہ اس کو یہیں سے نکال دینا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے اس کو دو بسیلوں پر مضبوط کس کر باندھ دیا۔ اور ان دو بسیلوں کو ہانک دیا۔ پس ملائکہ ان کو بنی اسرائیل کے پاس لائے اس روایت کے اعتبار سے تَحْمِلُہ کا معنی صرف لانا ہو سکے گا نہ کہ اٹھانا۔

مقدمہ تفسیر مرقۃ الانوار میں ہے کہ۔ احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ تبرکاتِ انبیاء مثلاً الواح اور عصا موسیٰ اور ان کے علاوہ باقی چیزیں ائمہ معصومین علیہم السلام کے پاس موجود تھیں اور تابوت بھی ان کے پاس تھا۔ کیونکہ یہ چیزیں اسی میں تھیں اور بعض زیارات کے کلمات میں ہے کہ تم دہی ہو جن کے پاس تابوت سکینہ پہنچائی گئی اور بعض زیارات میں ہے کہ تم وہ ہو کہ خدا نے تم کو اپنی حکمت کا تابوت قرار دیا ہے اور اسی کتاب میں مناقب بن شہر آشوب سے مروی ہے کہ جناب رسالت کی وفات کے بعد حضرت جبرائیلؑ اہلبیت کو پُرسا دینے کے لئے آیا اور سلام دیا یہاں تک کہ اس نے کہا اَللّٰہُ تَابُوتٌ عَلَیْہِمْ وَاَوْسَرْتُکُمْ کِتَابَہُ۔ یعنی تم کو خدا نے اپنے علم کا صندوق و تابوت بنایا ہے اور تمہیں اپنی کتاب کا دارث بنایا ہے۔

بعض مفسرین نے اس مقام پر سکینہ سے مراد روح سکون لیا ہے جو خداوند کریم مومنین کو عطا فرماتا ہے اور اس کو سکینہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ اس سے دل و دماغ میں سکون و اطمینان آجاتا ہے اور احادیث جو سکینہ کے متعلق وارد ہوئی ہیں ان کی تائید بھی اسی معنی کے مطابق کی گئی ہے۔ (واللہ اعلم)

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ

پس جب روانہ ہوا طالوت فوج سے کہ تو کہا کہ تحقیق اللہ تمہارا امتحان کرنے والا ہے۔

بَنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي ۚ وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ

ایک نہر سے پس جو اس سے پئے گا وہ میرا نہ ہوگا اور جو اس سے نہ پئے گا وہ میرا ہوگا مگر وہ جو اپنے ہاتھ

مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ ۚ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا

سے ایک چلو لے لے (اس پر مرج نہیں)۔ پس سب نے اس سے پیا۔ سوائے ان کے تھوڑے آدمیوں

قَلِيلًا مِّنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا

کے۔ پس وہ جب وہاں سے گذر گئے بمعہ ان لوگوں کے جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے وہ کہنے لگے

لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ ۚ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ

کہ آج ہماری طاقت نہیں کہ جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کریں ان لوگوں نے کہا جو یہ سمجھتے تھے کہ ہم

أَنَّهُمْ مُّلَاقُوا اللَّهِ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ

اللہ سے ملنے والے ہیں کہ بسا اوقات تھوڑی جماعتیں فتح پالیا کرتی ہیں بڑی جماعتوں پر بحکم خدا

طالوت و جالوت کی لڑائی کا قصہ

فَلَمَّا فَصَلَ - گویا بنی اسرائیل نے نشانی طلب کی اور وہ تالوت اسی بیان کردہ صفت کے ساتھ ان کے پاس آیا۔ تو انہوں نے طالوت کو اپنا حکمران تسلیم کر لیا۔ اور اسی ہزار یا ستر ہزار کی تعداد میں باختلاف روایت فوج سے کہ جب د کے لئے روانہ ہوئے۔ پس خدا نے ان کے صبر کا امتحان لیا تاکہ سچے ایماندار اور جھوٹے کافروں کا فرق معلوم ہو جائے۔ جب نہر کے کنارے پہنچے تو طالوت نے ان کو امتحان کی حقیقت سے آگاہ کیا۔ کہتے ہیں کہ وہ نہر اردن اور فلسطین کے درمیان تھی اور بعض کا خیال ہے کہ وہ نہر فلسطین تھی۔

احتجاج سے مروی ہے کہ طاؤد دس یمانی نے حضرت امام محمد باقرؑ سے دریافت کیا کہ وہ کون سی چیز ہے۔

جس کا تھوڑا حلال ہے اور زیادہ حرام ہے آپ نے فرمایا وہ نہر طالوت ہے جس کا ایک چلو حلال اور زیادہ پینا حرام تھا۔

وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَلَمَّا بَرَسُواْ لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ

اور اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے اور جب نیکے جالوت اور اس کے لشکر کے سامنے تو یہ

قَالُوْا رَبَّنَا اٰفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا

دعا مانگی۔ اے ہمارے رب ہمیں صبر کی توفیق دے اور ہمیں ثابت قدمی عطا کر اور کامیاب فرم پر

عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ ﴿۲۵﴾

ہماری نصرت فرما

اَلَا قَلِيْلًا۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ وہ تین سوتیرہ تھے کہ بعضوں نے ایک چلو پیا تھا اور بعضوں نے کچھ بھی نہ پیا تھا اور بعض کہتے ہیں وہ کل چار ہزار تھے لیکن ان میں سے باقی منافق ہو گئے اور صرف تین سوتیرہ ثابت قدم رہے اور کہتے ہیں۔ طالوت نے نافرمانوں کو واپس کر دیا اور صرف ایمان والوں کے ساتھ نہر کو عبور کیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں بصراحت موجود ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جنہوں نے چلو پیا تھا وہ سیر ہو گئے اور جنہوں نے حرص زیادہ کیا۔ ان کی پیاس بڑھ گئی اور ہونٹ بھی سیاہ ہو گئے (حاشیہ مقبول)

قَالُوْا اَلَا طَاقَةٌ لَّنَا۔ چونکہ ان کی تعداد کم تھی اور ادھر جالوت کے پاس بہت کافی فوج تھی۔ اس لئے بعض لوگ گھبرا کر یہ بات کہنے لگے جو قرآن میں ہے۔

قرآن مجید کے الفاظ سے طالوت کا مومن یا کافر ہونا واضح نہیں ہوتا لیکن اشارات و کنایات کی رو سے طالوت کا ایمان اُن کے مومن ہونے کا پہلو زیارہ روشن ہے چنانچہ بعضوں نے ان کی نبوت کا قول بھی کیا ہے جیسا کہ ص ۱۱۲

پر گزر چکا ہے البتہ تاریخ سے اس کے مومن نہ ہونے کے قول کو تقویت پہنچتی ہے چنانچہ طبری نے لکھا ہے کہ اعلان جنگ کے بعد طالوت نے اپنی فوج میں اعلان کیا تھا کہ جو شخص جالوت کو قتل کرے گا میں اس کو اپنی لڑکی کا رشتہ بھی دوں گا اور اس کے نام کا سکھ بھی جاری کر دوں گا جب حضرت داؤد نے جالوت کو قتل کیا تو اس نے جب وعدہ داؤد کو لڑکی بیاہ اور ان کے نام کا سکھ بھی جاری کر دیا اور حضرت داؤد نے اپنی خدا داد استعداد سے جب لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تو اُن کی مقبولیت عامہ سے گھبرا کر طالوت نے اپنے اقتدار کی بجائی کیلئے ان کو اپنے راستے سے ہٹانے کی ٹھان لی اور اسی قلبی کدورت کو عمل میں لانے کیلئے اس نے بنی اسرائیل کے کافی علماء مراد لے تاکہ اس بہانہ سے کئی حضرت داؤد کو بھی قتل کر دیا جائے لیکن اللہ نے اس کے ارادہ ناسد کو پیچھے نہ دیا چنانچہ ایک آنے والی جنگ میں طالوت خود دشمن کے ہاتھوں مارا گیا اور حضرت داؤد جو نائب السلطنت کے عہد پر پہلے فائز تھے حکومت کا تاج ان کے سر پر رکھا گیا اور وہ طالوت کے بعد مملکت اسرائیل کے مطلق فرمان روا ہو گئے۔

فَهَزَمُوهُمْ بِأَذْنِ اللَّهِ ۖ وَكَلَّ دَاوُدُ جَالُوتَ وَأَشَهُ

پہلے انہوں نے ان کو شکست دہی باذن خدا اور قتل کر دیا داؤد نے جالوت کو اور عطا کیا اس کو

اللَّهُ الْمُلْكُ وَالْحِكْمَةُ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ۖ وَلَوْلَا دَفْعُ

اللہ نے ملک اور علم شریعت اور اس کو سکھایا جو چاہا اور اگر نہ ہوتا خدا کا دفع

اللَّهُ النَّاسَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِن

کرنا بعض (مفسد) لوگوں کا بذریعہ بعض دوسرے لوگوں کے تو زمین فساد سے بھر جاتی۔ لیکن

اللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ۚ تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ

اللہ صاحب فضل ہے اوپر عالمین کے یہ اللہ کی آیات ہیں

نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝

جن کو ہم آپ پر حق کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور آپ یقیناً رسولوں میں سے ہیں

حضرت داؤد کی شجاعت

وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ بنی اسرائیل کے نبی کو یہ وحی ہوئی تھی کہ جانو کہ وہ شخص قتل کریگا جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زرہ فٹ ہوگی اور وہ شخص لاوی بن یعقوب کی اولاد سے ہے جس کا نام داؤد ہے اور دنیاں پر اتا ہے اور اس کے باپ کا نام ایشا ہے (اسی) ایشا کے دس فرزند تھے اور حضرت داؤد سب سے چھوٹے تھے پس جب طالوت کے پاس لشکر جمع ہوا۔ تو انہوں نے ایشا کو کہلا بھیجا کہ آپ اپنے بیٹوں کو لائیں پس جب وہ حاضر ہوئے تو حضرت موسیٰ کی زرہ باری باری سے ہر ایک کو پہنائی لیکن وہ کسی پر فٹ نہ آئی بلکہ کسی سے بڑی اور کسی سے چھوٹی ہوتی تھی تو طالوت نے دریافت کی کہ ان کے علاوہ آپ کا کوئی فرزند بھی ہے؟ انہوں نے جواب دیا۔ کہ ہاں! ان سب سے چھوٹا ایک ہے جس کو دنیوں کی حفاظت کے لئے ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ پس ان کو طلب کیا گیا۔ جب ان کو پیغام پہنچا تو وہ غلیل مارنے کی ایک کسان (فلاخن یا گوچن) اپنے ساتھ لئے وہاں سے روانہ ہوئے۔ رستہ میں تین پتھروں نے یکے بعد دیگرے آواز دی

کہ ہمیں اسے داؤد اپنے ساتھ لیتے جائیے۔ کہ تیرے کام آئیں گے پس انہوں نے ان کو اپنے توبرہ میں رکھ لیا اور وہ فیروزہ کے پتھر کی قسم سے تھے اور حضرت داؤد تنومند بہادر اور قوی ہیکل جوان تھے۔ پس جب طالوت کے پاس پہنچے تو انہوں نے ان کو حضرت موسیٰ کی زرہ پہنائی جو ان کو پوری طرح فٹ آئی۔

پس القصد جب طالوت کا لشکر جالوت کے لشکر کے مقابلہ میں آیا۔ تو جالوت کی شجاعت کا بڑا چرچا ہوا۔ حضرت داؤد نے ان سے کہا کہ جس کے بارے میں اتنی بڑی بڑی باتیں کر رہے ہو۔ خدا کی قسم ایک بار مجھے دکھا دو۔ اُسے ضرور قتل کروں گا۔ حضرت داؤد کا کہنا تھا کہ پورے لشکر میں اُن کے جرأت مندانہ کلام کی آواز مشہور ہوئی اور اُن کو طالوت کے سامنے لایا گیا۔ طالوت نے دریافت کیا کہ آپ کی قوت بازو کی کیا حد ہے اور آپ نے کس حد تک اپنی طاقت کو آزمایا ہے (کہ اس قدر جرأت امیر و عورے کرتے ہو) تو انہوں نے کہا کہ میری قوت بازو یہ ہے کہ شیر جب میری دُنبیوں پر حملہ آور ہوتا تھا۔ تو میں اس کو پکڑ لیتا تھا اور اس کے سر کو قابو کر کے اس کی ڈاڑھیں کھول کر اپنی دُنبی وغیرہ اس کے منہ سے پھڑا لیتا تھا۔ تب طالوت اور لشکریوں کو اطمینان حاصل ہوا۔

پس جب صبح کو دونوں لشکر ایک دوسرے کے بالمقابل ہوئے تو جالوت اپنے ہتھیار لگا کر میدان میں آیا۔ بقول صاحب عمدة البیان تقریباً انیس من لوہا یوزن ہندی کے برابر اس کے جسم پر ہتھیار تھے اور تقریباً چھ من وزن کا اس کے سر پر خود تھا۔ ہاتھی پر سوار تھا اور اس کے سر پر ایک تاج تھا اور پیشانی پر ایک یا قوت تھا جو چمکتا تھا اس کا لشکر اس کے سامنے کھڑا تھا۔

حضرت داؤد نے فلاخن میں ان تین پتھروں سے ایک پتھر رکھ کر لشکر جالوت کے مینہ (دائیں حصہ) پر مارا۔ جب وہ پتھر ان پر گرا۔ تو وہ بھاگ گئے۔ پھر دوسرا پتھر لشکر جالوت کے میسرہ (بائیں حصہ) پر مارا تو پتھر کے پڑنے سے وہ بھی بھاگ کھڑے ہوئے پس تیسرا پتھر سیدھا جالوت کو نشانہ بنا کر مارا تو وہ پتھر اس کی پیشانی پر ٹھیک اسی یا قوت والے مقام پر پڑا۔ جو اس کے سر کو پھوڑ کر دماغ تک جا پہنچا اور ہاتھی کی پشت سے دھڑم زمین پر گر پڑا۔

لوگوں میں حضرت داؤد کی شجاعت کا ڈنکا بج گیا اور اس واقعہ کے بعد حضرت داؤد کو بادشاہت کے لئے منتخب کیا گیا اور بنی اسرائیل نے ان کی حکومت کے سامنے سر تسلیم خم کر لیا۔ اہل تفسیر نے اس واقعہ کو اسی طرح ہی بیان کیا ہے اگرچہ کئی تفسیروں کے مختلف بیانات کو میں نے یک جا کر دیا ہے۔

وَكُلُّ لَدَا قَعُ اللّٰہِ النَّاسِ۔ اس فقرہ کا ایک معنی تو وہ ہے جو تحت اللفظ موجود ہے اور حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے اس کا معنی یوں منقول ہے کہ اگر نہ تو خدا کا معاف کرنا اور درگزر کرنا۔ بعض گنہگار لوگوں سے بتصدق دوسرے بعض نیک لوگوں کے۔ تو تمام اہل ارض عذاب خداوندی کی وجہ سے درہم برہم ہو چکی ہوتی۔ لیکن اللہ تمام جہانوں پر صاحب فضل و کرم ہے چنانچہ حضرت صادق علیہ السلام سے بطریق مختلفہ مروی ہے کہ خدا ہمارے نماز گزار شیعوں کی

وجہ سے بے نماز شیعوں سے درگزر فرمالیتا ہے ورنہ اگر سب بے نماز ہوتے تو یقیناً ہلاک ہو جاتے اور ہمارے روزہ دار شیعوں کی بدولت بے روزہ شیعوں سے عذاب ٹال دیتا ہے ورنہ اگر سب بے روزہ ہو جاتے تو معذب کر دیئے جاتے اور ہمارے زکوٰۃ دینے والے شیعوں کی وجہ سے بے زکوٰۃ شیعوں سے درگزر کرتا ہے ورنہ اگر سب تارک زکوٰۃ ہو جاتے تو ہلاک ہو جاتے۔

اور ہمارے حاجی شیعوں کے صدقہ سے تارک حج شیعوں سے درگزر کرتا ہے ورنہ اگر سب تارک حج ہو جاتے تو ہلاک ہو جاتے اور فرمایا کہ خدا کی قسم یہ آیت تمہارے ہی حق میں اتری ہے اور اس سے تم ہی مراد ہو اور تمہارے غیر مراد نہیں ہیں۔

(تفسیر البرہان)

ربیع الاول بارہ عشری سے بردایت ابن عمر مروی ہے کہ جناب رسالت اکرم نے فرمایا کہ خداوند کریم ایک نیک مسلمان کی بدولت اس کے قریب بسنے والے ایک لاکھ گھرانوں سے مصیبت کو دفع فرماتا ہے اور پھر آپ نے یہی آیت پڑھی۔ مجمع البیان میں جابر بن عبد اللہ انصاری سے منقول ہے کہ جناب رسول خدا نے ارشاد فرمایا کہ ایک مرد مسلمان جو نیک اور صالح ہو، کی بدولت خداوند کریم، اس کی اولاد، اس کی اولاد کی اولاد اور پھر ان کی اولاد، اور اس کا باقی خاندان اور اس کے جوار میں بسنے والے خاندانوں کی حالتوں کو سنوار دیتا ہے اور اس نیک مرد مسلمان کی بدولت وہ سب حفظ و امان خدا میں آجاتے ہیں۔ پس طاوت کے انتخاب اور حضرت داؤد کی شجاعت کی بدولت بنی اسرائیل کو دشمن پر کامیابی نصیب ہوئی اور ہر قسم کی مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل ہوا۔ اور اس تجربہ کے بعد بنی اسرائیل کو اپنے سابقہ اختراعات کی غلطی کا علم ہو گیا اور انہیں معلوم ہو گیا کہ واقعی خدائی انتخاب ہی امن و سلامتی کا مژدہ لاسکتا ہے اور علم و جسمانی طاقت ہی معیار انتخاب ہوتی ہے۔ اس معاملہ میں خاندانی جاہ و جلال و زور و دولت اور فراوانی مال پر نازاں ہونا صرف طاقت اور ناقابت اندیشی ہے اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ اعلان قدرت کے بعد جماعی پروگرام کی ترتیب مفت کی ہنگامہ آرائی ہے۔

بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے متعلق قرآن مجید میں کوئی نص نہیں ہے لیکن یہ بات صرف ان کی قرآنی مطالب سے چشم پوشی اور پہلو تہی، بلکہ حد اور تعصب کی ائینہ دار ہے۔ قرآن مجید میں ائم سابقہ کے واقعات صرف قصہ خوانی کے طور پر نہیں ہیں بلکہ وہ تو تاقیامت انسانی فلاح و مہبود کا ایک معیار بیان کرتا ہے خواہ اس کا تعلق اخروی مفاد سے ہو یا دنیوی فلاح سے ہو۔ خواہ تدبیر منزل کے متعلق ہو یا سیاست عامہ کے متعلق ہو۔ جب ایک امت کے لئے ایک معیار قائم کیا گیا اور قرآن نے اسے بیان کر کے اس کے نتائج سے مجبور و شناس کر دیا تو تاقیامت وہ معیار تمام امتوں کے لئے ایک نص کی حیثیت رکھتا ہے پس امت اسلامیہ میں اگر جناب رسالت اکرم کے بعد انتخاب خلافت ضروری ہے اور ہے بھی ضروری تو جو بھی اس معیار پر پورا اترے وہی اہل ہے کہ خلیفۃ اللہ سے کہا جائے اور ظاہر ہے کہ حضرت علیؑ کے علاوہ اس معیار انتخاب پر کوئی بھی پورا نہیں اتر سکا تو قرآنی مذکورہ بالا آیات حضرت علیؑ کی خلافت پر نص نہیں تو کیا ہے۔ نص اور معیار کے درمیان

فرق اور اس کی ضروری وضاحت ہماری کتاب 'اسلامی سیاست' میں ملاحظہ فرمائیے۔

فلسفہ جذب و دفع

اس میں شک نہیں کہ عالم میں جذب و دفع کی دونوں قوتیں اپنے اپنے مقام پر عمل پیرا ہیں اور نظام عالم کی دیوثیت و بقائیں ان کو خصوصی دخل ہے ورنہ اگر ان دونوں میں سے ایک کا وجود ختم ہو جائے تو پورا عالم عدم کی گود میں جا کر اُرم لے گا زمین میں اپنی جگہ جذب موجود ہے جسے کشش کہا جاتا ہے اور سورج میں اپنے مقام پر یہی جذب و کشش موجود ہے پس اگر ان میں دفع کی قوت موجود نہ ہو تو ایک دوسرے سے ٹکرا کر ختم ہو جائیں گے اسی طرح عالم علوی کے تمام اجرام چاند سورج اور ستارے وغیرہ انہی دونوں قوتوں کی بناء پر برقرار ہیں۔ یعنی عالم وجود کے علوی یا سفلی اہم پُرزے قوت جذب کی بناء پر ایک دوسرے سے اس قدر دور نہیں جاسکتے کہ باہمی افادہ و استفادہ سے محروم رہ جائیں اور قوت دفع کی بناء پر ایک دوسرے کی طرف کچ کر تباہی و بربادی سے بھی ہٹنا نہیں ہوتے۔ پس جب تک یہ جذب و دفع کا توازن قائم ہے عالم باقی ہے اور جب یہ توازن ختم ہوگا۔ بقا کی کشتی گرداب میں آکر ساحل فنا پر جا دم لے گی۔

اگر عالم علوی سے قطع نظر کر کے صرف عالم سفلی کا نظر غائر سے مطالعہ کیا جائے تو وجود عناصر و عنصریات میں انہی دونوں قوتوں کی کار فرمائی موجود ہے۔ نہ یہ ایک دوسرے سے اس قدر دور ہیں کہ باہمی نفع رسانی سے محروم ہوں اور نہ ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں کہ لڑ کھڑا ہو جائیں۔ اسی طرح زمین کی ہر جزوی پیداوار کو الگ الگ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر ایک میں یہی دونوں اصول کار فرما نظر آتے ہیں۔ خواہ جمادات ہوں یا نباتات اور حیوان ہوں یا انسان، یعنی کوئی ذی روح یا غیر ذی روح مخلوق ایسی نہیں جو کلی نظام میں ان دونوں قوتوں سے متاثر ہوئے بغیر افادیت کی حامل ہو۔ وجود انسانی جس کو عالم اصغر سے تعبیر کر کے عالم اکبر کا خلاصہ کہا گیا ہے اور حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی طرف ایک شعر بھی منسوب ہے

اَتَزَعِدُّ اَنَّكَ جِزْمٌ مَّصْغِيْرٌ وَفِيْلِكَ اَطْوٰى اَلْعَالَمِ الْاَكْبَرِ

وَ اَنْتَ اَلْكِتَابُ الْمُبِيْنُ الَّذِيْ بِاَحْرَافِهٖ يَنْظُرُ الْمُضْمَرُ

کیا تو اپنے آپ کو ایک چھوٹا سا جسم خیال کرتا ہے حالانکہ تجھ میں ایک عالم اکبر پنہاں ہے اور تو وہ کتاب مبین ہے جس کے حروف سے راز ہائے پوشیدہ کھلتے ہیں۔

اس مختصر سے وجود کی طبیعت میں جذب و دفع کی دونوں طاقتیں ظاہر و باہر ہیں اور دونوں کی بدولت نظام جسم قائم ہے اور جب تک ان میں توازن موجود ہے نظام جسم باقی ہے اور جب توازن ختم ہو جاتا ہے موت سوار ہو جاتی ہے اور فردا فردا ہر حیوان کی یہی کیفیت ہے اور یہی تجاذب و تدافع جس طرح فرد و فرد میں نظام شخصی کا محافظ ہے اسی طرح ہر نوع

اور صنف میں نظام نوعی و صنفی کا کفیل ہے اور پورے وجود سفلی میں نظام کلی کا ضامن ہے اور تمام عالم میں نظام اتم و اکمل کا ذمہ دار ہے جو نظام کلی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ یہ دونوں قوتیں فطری طور پر تحفظ و بقائے نظام میں کلی و جزوی ہر دو طریق سے دخیل ہیں۔ اور ان کا باہمی توازن روح حیات ہے۔

قرآن مجید نے اس مقام پر اسی فطری اصول کو پیش فرماتے ہوئے جہاد کو انسان کشی کے الزام کے پیش منظر بربریت اور سفاکیت سے تعبیر کرنے والوں کو متنبہ فرمایا ہے کہ اگر دفع کا اصول نہ ہوتا اور جذب ہی جذب پر عمل ہوتا تو نظام انسانی درجہ برہم ہو جاتا۔ کیونکہ انسان میں تفسیر موجودات کا جذبہ جو اسے فطرت سے تفویض ہوا ہے اس کے پیش نظر وہ ہر معاملہ میں اور ہر مرحلہ پر اپنی ہر محبوب و مرغوب شے کے حصول کا متنبہ رہتا ہے اور ہر شوق و خواہش کی تکمیل کا آرزو مند ہوتا ہے بنا بریں وہ اسی تلاش میں ہر گوشہ میں جھانکتا ہے اور ہر وادی میں قدم رکھنے کی جرأت کرتا ہے۔ اور چونکہ ہر انسان کی فطرت کا تقاضا یہی ہے تو مرغوبات و مشہیات میں تضاد ضروری ہے اور بغیر تدافع کے ناممکن ہے کہ کوئی بھی کسی مرغوب چیز سے بہرہ اندوز ہو سکے۔ بلکہ جذب کا معنی دفع کے بغیر اور دفع کا معنی جذب کے بغیر قطعاً پورا ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ جذب کا معنی ہے کسی شے کو حاصل کرنا یعنی اس کی ضد اور نقیض کو دفع کرنا اور اسی طرح دفع کا معنی ہے کسی ناپسند حالت یا چیز کو دور کرنا یعنی اس کی ضد یا نقیض کو حاصل کرنا۔ پس یہ دونوں مفہوم ایک دوسرے کے بغیر پورے ہو ہی نہیں سکتے۔

پس جب یہ دونوں قوتیں فطری ہیں تو تمدن و اجتماع سے ان کا ٹکراؤ ضروری ہے اور ڪَانَ النَّاسُ اُمَّةً کی تفسیر میں گزر چکا ہے کہ لوگوں کی اس مقام پر وحدت سے مراد ہے فطرت اولیہ میں یکسانگی یعنی فطرت اولی کے اعتبار سے وہ سب کے سب مدنی البطح تھے اور اتحاد و تعاون ان کا ذاتی جوہر تھا۔ لیکن تجاذب و تدافع کے فطری اصولوں کے ماتحت ان میں اختلاف ضروری تھا۔ لہذا خداوند کریم نے انبیاء و مرسلین کو بھیج کر ان کو جذب و دفع میں توازن قائم کرنے کی دعوت دی تاکہ جذب و دفع اپنے نقطہ اعتدال میں رہ کر تمدن و اجتماع سے ٹکرائیں جو نظام انسانی کے لئے از بس ضروری ہے لیکن جذبات و خواہشات کا و فور انبیاء کی اس دعوت سے ٹکرا گیا اور چونکہ انبیاء کی یہ دعوت اقتدار پر ضرب کاری تھی لہذا بالخصوص طاقت و ثروت رکھنے والا گروہ کھلم کھلا بغاوت پر اُتر آیا۔ اور ان کے اتباع اور نچلا طبقہ جو علم و معرفت سے کورا ہونے کی وجہ سے ہا ہوا شور و غوغا کا تماشائی طور پر نظارہ گر تھا انہوں نے بلا سوچے سمجھے بڑوں کی ہاں میں ہاں ملائی شروع کر دی اور انبیاء کے خلاف اپنے بڑوں کا سہارا لیتے ہوئے زبان درازی طعن و تشنیع اور ایذا رسانی سے ان کو ستانے لگ گئے۔ لیکن بالآخر حقیقت بین اور حق شناس طبقہ کم و بیش ہر زمانہ میں انبیاء کا ہم آہنگ بھی ہوتا رہا۔ تو چونکہ انبیاء تمدن کی اصلاح کے پیش نظر جذب و دفع میں اعتدال کی

دعوت دیتے تھے تاکہ انسانیت صفحہ عالم پر خوب پھولے پھلے اور ان کے مخالفین خواہشات و شہوانی جذبات کے ماتحت جذب و دفع میں بے راہ روی اور بے اعتدالی کے علم بردار تھے اور بالخصوص برسرِ اقتدار گروہ جن کی عیاشانہ زندگی اور رنگ رلیاں اس توازن و اعتدال کے بعد موت سے ہم آغوش ہو جاتیں وہ خاص طور پر دعوتِ انبیاء سے برسرِ پیکار تھے اور ان لوگوں کو بے اعتدالیوں کی کھلی چھٹی دینا چونکہ پوری نوعِ انسانی کے لئے پیامِ موت تھا اور زبانی تبلیغ کی ان کے ہاں کوئی پذیرائی نہ تھی لہذا حکمِ جہاد دیا گیا تاکہ نوعِ انسانی میں سے اس جتنے کو الگ کر دیا جائے جو پوری نوع کے وجود کے لئے باعثِ خطرہ ہے پس معلوم ہوا کہ ذاتی مفاد کی خاطر کسی کو قتل کرنا نفس کشی اور ظلم ہے لیکن نوعِ انسانی کی حفاظت کے لئے فردِ خبیث کو موت کے گھاٹ اتار دینا پوری نوع پر احسانِ عظیم اور انسانیت نوازی ہے۔

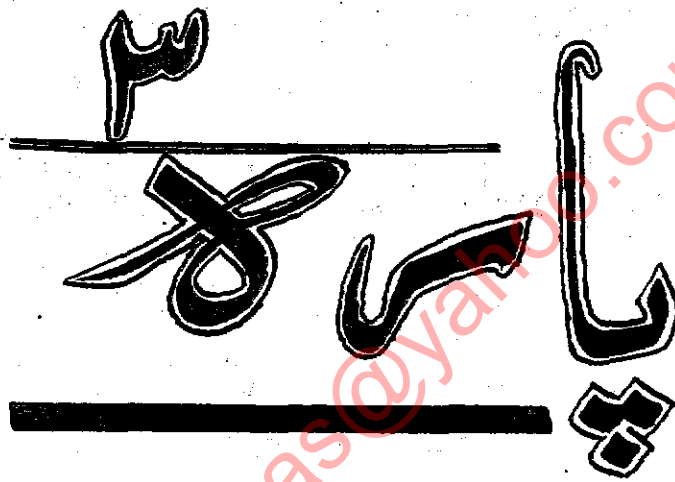
آیت مجیدہ میں دفع کو خدا نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے کیونکہ یہ دفع عام فطری جذب و دفع پر حاکم ہے کیونکہ فطری جذب و دفع میں افراط و تفریط کو ختم کرنے اور ان میں اعتدال و توازن کو قائم کرنے کے لئے انبیاء کو جس جہاد کا حکم دیا گیا وہ دفاعِ عام فطری دفاع سے الگ ہے جس طرح کہ ان کا جذب عام فطری جذب سے جداگانہ ہے کیونکہ انبیاء کی تبلیغ جو انسان کے تمدن کو ہموار راہوں پر چلانے کے لئے تھی وہی ان کا جذب تھا اور جو لوگ اس تمدن میں بے راہ روی اور بد اعتدالی کو اپناتے ہوئے درحقیقت پوری نوع کے لئے معرضِ خطر تھے بلکہ وجودِ انسانیت پر وہ حملہ آور تھے ان کو اس طبیبانی اور سرکشی سے باز رکھنا اور انسانیت پر ان کے اس حملہ کو روکنا اور ان کے سامنے علمِ جہاد بلند کرنا ان کا دفع تھا۔ گویا انبیاء نوعِ انسانی کے لئے حکیم و ڈاکٹر تھے جس طرح ڈاکٹر بدنِ انسانی میں توازن و اعتدال کی بحالی کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اگر کوئی عضو اس قسم کا مریض ہو کہ اس کا مرض پورے بدن کے لئے معرضِ خطر ہو اور اس کا علاج بھی کسی صورت میں نہ ہو سکتا ہو تو حفاظتِ بدن کے لئے اس کو سر سے کاٹ دیتا ہے اور اس عضو کو کاٹ دینا جو پورے بدن کے خلاف علمِ بغاوت اٹھائے ہوئے تھا۔ ڈاکٹر کا ظلم و تشدد شمار نہیں ہوگا۔ بلکہ پورے بدن پر اس کا یہ فعل احسانِ عظیم ہوگا۔ اسی طرح نوعِ انسانی میں توازن و اعتدال کی بحالی کے لئے انبیاء روحانی ڈاکٹر ہیں اور ناقابلِ اصلاح افراد اور پوری نوع کے مفاد کو خطرہ میں ڈالنے والے مفسدِ اشخاص کو صفحہ دنیا سے مٹا دینا وجودِ انسانیت پر ان کا احسان ہے۔ اور چونکہ وجودِ انسانیت کے علاج کے لئے خدا نے ہی ان کو یہ اختیارات دے کر بھیجا ہے تو بنا بریں ان کے دفع کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔

پس اسلام تمدن و اجتماعِ انسانی کی حفاظت اور اس سے برسرِ پیکار قوتوں یعنی تجاذب و تلافیع میں توازن و اعتدال کے قائم کرنے والا فطری دین ہے جس کے تمام قوانین انہی فطری اصول کے ماتحت ہیں۔ لہذا اسلام سے بغاوت فطرتِ انسانی سے بغاوت کرنے کے مترادف ہے اور اسلامی اصول و فروع سے الجھنا انسانیت

سے دشمنی کرنے کے برابر ہے اور اس بغاوت کو فرد کرنا اور باغیوں کی سرکوبی کرنا انسانیت کا فطری حق ہے۔ جس کا علم بڑا خداوند کریم نے انبیاء کو قرار دیا ہے۔

اسی بناء پر ارشاد فرماتا ہے کہ اگر خدا کا دفاع نہ ہوتا بعض مفسدین کو بذریعہ بعض کے تو پوری زمین فساد سے بھر جاتی۔ یعنی پورا نظام درہم برہم ہو جاتا اور آخر میں فرماتا ہے وَلَقَدْ عَلَّمْنَا اللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ۔ یعنی اللہ عالمین پر صاحب فضل ہے۔ ارضی فسادات کے قطع قمع کا دار و مدار دفاع کو قرار دینے کے بعد اس فقرہ کو آخر میں ذکر کرنا اس امر کے لئے ہے کہ دفاع اگرچہ بعض مفسد افراد کے حق میں فائدہ مند تو بجائے خود نقصان دہ ہے۔ لیکن پورے عالمین کے لئے یعنی نظام کئی کے لئے حکم دفاع ضروری ہے اور دفاع کا حکم نظام کئی کے لئے مفید تر بلکہ عالمین کے لئے یہ حکم خدا فضل عظیم اور احسان جسیم ہے۔

jabir.abbas@yahoo.com



تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ

ان رسولوں میں سے بعض کو بعض پر ہم نے فضیلت دی۔ بعض ان میں سے ایسے ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا۔

وَسَأَفَع بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ۖ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ

اور بلند کیا ان میں سے بعض کو درجات کے لحاظ سے اور دیں ہم نے عیسیٰ بن مریم کو واضح دلیلیں اور اس کی

وَإِيْدُنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَقْتُلَ الَّذِينَ مِنْ

تائید کی روح القدس کے ذریعے اور اگر اللہ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ۔ جو ان کے بعد تھے۔

بَعْدِهِمْ مَنْ يَغِي مَا جَاءَ تَهُمُ الْبَيِّنَاتِ وَلَكِنْ اخْتَلَفُوا فَمِنْهُمْ مَنْ

بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح دلیلیں آچکی تھیں لیکن انہوں نے اختلاف کیا پس بعض ان میں سے ایمان

أَمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَقْتُلُوا وَلَكِنْ اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ۚ

لائے اور بعض کافر ہوئے اور اگر اللہ چاہتا تو وہ لڑائی نہ کرتے۔ لیکن اللہ جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔

رکوع نمبر ۱۰

فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ - کل انبیاء جن کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے، پر ایمان لانا ضروری ہے ان میں سے ایک کا انکار کرنے والا ایسا ہی کافر ہے جیسا سب کا انکار کرنے والا۔ لہذا یہ فرق کرنا کہ کسی کو نبی ماننا اور کسی کا انکار کرنا کفر ہے لیکن ان انبیاء کے لئے بعض کی بعض پر فضیلت کا اقرار کرنا ایمان ہے۔ کیونکہ انبیاء میں سے حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰؐ اولو العزم پیغمبر ہیں اور باقی سب غیر اولو العزم ہیں اور اولو العزم ان سب سے افضل ہیں اور پھر ان سب سے حضرت محمد مصطفیٰؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو انصاف حاصل ہے کیونکہ وہ صرف انسانوں پر مبعوث تھے اور محدود قوم و قبیلہ و علاقہ کے نبی تھے اور آنحضرت عالمین (جنت و انس) کے رسول ہیں اور اس آیت مجیدہ میں خداوند کریم یہی بیان فرماتا ہے کہ انبیاء و رسل میں سے بعض سے بعض افضل و برتر ہیں

وَمِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ - اس سے بظاہر حضرت موسیٰ علیہ السلام مراد ہیں۔ کلام خدا میں علم کلام کے ماہرین کافی بحث تمحیص کیا کرتے ہیں مختصر طور پر اس قدر جان لیسا کافی ہے کہ انسان چونکہ مدنی الطبع ہے اور افہام و تفہیم کے لئے

ایک ذریعے کا محتاج ہے اور سوائے کلام کے اس بارے میں اور کوئی مفید اور کارآمد ذریعہ ہو نہیں سکتا۔ لہذا انسان اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے کلام کا محتاج ہے اگر انسان میں یہ اجتماعی اور تمدنی زندگی نہ ہوتی تو کلام کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔ حیوانات میں سے بھی بعض حیوان دوسرے بعض حیوانات کو اپنے مافی الضمیر سے مطلع کرتے ہیں لیکن حروف سے مرکب الفاظ کے ذریعے سے نہیں بلکہ مہمل سی آوازوں سے یا آنکھوں کے ذریعے سے یا قوتِ شامہ کے واسطے سے اور علیٰ ہذا القیاس اور یہ طریقہ ان کا آپس میں کلام کہا جاسکتا ہے اسی طریقہ سے جنات و ملائکہ کا کلام اپنی مخصوص نوعیت سے ہوگا۔ پس موجوداتِ عالم میں سے ہر ایک کے ساتھ اللہ کا کلام کرنا ان کی اپنی اپنی جداگانہ نوعیت و استعداد کے اعتبار سے پہلے بعض خطابات میں اس کے قول یا کلام سے مراد امر تو کہنی ہے جس طرح زمین یا آسمان یا اسی قسم کی رُوح و ارادہ نہ رکھنے والی مخلوق سے عہد اطاعت طلب کرنا اور ان کو قبول کرنا اور صاحبانِ رُوح و ارادہ اور حاملانِ عقل و دانش مثلاً جنات و ملائکہ اور انسان وغیرہ سے اس کے کلام کرنے کا مطلب ہے۔ بہرہ طریقہ جس سے اس کے اوامر و نواہی و جملہ خطابات کا مطلب سمجھا جاسکے۔ پس انسانوں سے اس کا کلام حروف سے مرکب الفاظ کے ذریعے سے ہوگا چنانچہ ان کے لئے افہام و تفہیم کا سہل طریقہ یہی ہے اور جنات و ملائکہ کے ساتھ کلام اس لب و لہجہ یا طرز و طریقہ سے ہوگا جو ان کی تفہیم کے لئے ضروری ہو۔ بہر کیف موجوداتِ عالم کی ہر ہر صنف اور ہر ہر نوع کے ساتھ کلام ہر ایک کی جداگانہ حیثیت کے لحاظ سے اسی کے مخصوص انداز میں مقصد کی تفہیم کا نام ہے۔

پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلیم اللہ ہونا یا اعتبار مجاز نہیں بلکہ باعتبار حقیقت ہے اور ان کے ساتھ کلام سے مراد وحی یا انشاء یا کوئی اور طریقہ نہیں بلکہ کلام حقیقی ہے۔ ورنہ ان کی خصوصیت نہیں رہے گی۔ کیونکہ باقی انبیاء بھی وحی یا انشاء یا الہام وغیرہ سے تو نوازے گئے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ خدا کا کلام منہ یا زبان سے صادر ہونے والا کلام ہو کیونکہ یہ صورت مستلزمِ حدوث ہے اور خدا اس صفت سے مبرا اور منزہ ہے بلکہ مراد ہے کلام کا ایجاد کرنا خواہ اس کا جو طریقہ اور جواب و لہجہ بھی ہو اور اس کے کلام کی کہنہ کو جاننا اور اس کی کما حقہ کیفیت سے مطلع ہونا انسانی امکان سے باہر ہے۔ نیز کلام۔ خدا کی صفات ذات سے نہیں جس طرح علم قدرت اور حیات وغیرہ بلکہ یہ صفات افعال میں سے ہے جو کہ محدث ہیں اور احادیث اکثراً اسی معنی پر دلالت کرتی ہیں۔

وَقَدْ بَعْضُهُمْ دَرَجَاتٍ۔ یہاں بعض سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ لئے گئے ہیں ان کو تمام وہ معجزات عطا کئے گئے جو گزشتہ نبیوں کو دیئے گئے تھے اور ان کا قرآن مجید کا معجزہ تمام معجزات سے افضل ہے کیونکہ باقی معجزات ظاہر ہونے کے بعد ختم ہو گئے اور قرآن کا معجزہ قیامت تک باقی ہے۔ تفسیر برہان میں کتب امامیہ معتبرہ سے بروایت اصح بن نباتہ منقول ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے ایک روایت میں فرمایا کہ خداوند کریم نے انبیاء میں پانچ روحیں خلق فرمائی ہیں (۱) روح القدس (۲) روح الایمان (۳) روح الشہوة (۴) روح القوتہ (۵) روح البدن۔

پس روح القدس کے ذریعہ سے ان کو نبوت یا رسالت عطا ہوئی اور اسی کی بدولت ان کو چیزوں کا علم مرحمت ہوا۔
روح ایمان کے ذریعہ سے انہوں نے اللہ کی عبادت کی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ تسلیم کیا۔
روح قوت کے ذریعہ سے وہ دشمنوں سے جہاد کرتے رہے اور اسی سے اپنے معاشیات کا انتظام فرماتے رہے۔
روح شہوت کی وجہ سے انہوں نے بعض اوقات اچھا کھانا بھی کھایا اور جوان عورتوں سے نکاح بھی کیا۔
اور روح بدن کے ذریعہ ان کا سلسلہ نشوونما دیا وہی انجام پذیر ہوا۔ پیدا ہوئے اور بڑے ہوئے۔
وَكُلُّ شَاءِ اللَّهِ مَا أَقْتَسَلُ الَّذِينَ - یعنی خداوند کریم دین میں کسی کو مجبور نہیں فرماتا ورنہ اگر ایسا کرتا تو پھر دلائل واضح کے بعد
کوئی کیوں گمراہ ہوتا اور جہاد و قتال تک نوبت کیوں آتی لیکن خداوند کریم کی جانب سے ایمان قبول کرنے اور نہ کرنے
میں انسانوں کو مجبور نہیں کیا گیا لہذا ہر دور میں انبیاء کے بعد اختلاف ہوتا رہا بعض ایمان لاتے اور اس پر ثابت قدم رہتے
اور بعض کافر ہو جاتے تھے اور اس وجہ سے سلسلہ جہاد و قتال قائم رہا۔

برہان میں امالی شیخ سے بروایت اصبح بن نباتہ منقول ہے کہ ایک شخص حضرت امیر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور
کہنے لگا کہ مولا! یہ فرمائیے کہ جن لوگوں کے ساتھ ہم لڑ رہے ہیں۔ ہمارا ان کا دین ایک۔ رسول ایک۔ نماز ایک اور حج ایک ہے
تو ان کے متعلق ہم اعتقاد کیا رکھیں؟ آپ نے فرمایا۔ ہمارا ان کے متعلق وہی عقیدہ ہے جو خدا نے قرآن میں بیان فرمایا ہے اس نے دوبارہ
پوچھا تو آپ نے یہی آیت مجیدہ پڑھی اور فرمایا کہ جب اختلاف واقع ہو گیا تو چونکہ ہم خدا اور رسول خدا کے ساتھ ادلی ہیں۔ لہذا ہم اَلَّذِينَ آمَنُوا
کے مصداق ہیں اور وہ اَلَّذِينَ كَفَرُوا کے مصداق ہیں۔ پس ان لوگوں سے لڑنا مشیت و ارادہ خداوندی سے ہے ایک اور روایت میں ہے کہ
اس سائل نے جنگ جمل کے موقع پر سوال کیا تھا۔ اصبح کہتا ہے کہ میں پاس موجود تھا۔ پس جب آپ نے دلیل قرآنی کے ساتھ جواب فرمایا
تو اس شخص نے کہا۔ رب کعبہ کی قسم کہ وہ لوگ یقیناً کافر ہیں یہ کہہ کر میدان کارزار میں کود پڑا۔ اور لڑ کر درجہ شہادت پر فائز ہوا۔

سوال ہر انبیاء کی بعثت کے بعد جنگ جمل امتوں میں کیوں باقی رہا۔ حالانکہ اس کو ختم ہو جانا چاہیے تھا جس کی وجہیں ڈھپ ہیں۔
۱۔ خداوند کریم نے انسان کی سعادت دنیوی و اخروی کے لئے انبیاء بھیجے جن کو واضح معجزات اور آیات یتینا عطا کی گئیں پس
انبیاء کی دعوت اسلامیہ کے بعد یقیناً نزاعات کا قلع قمع ہو جانا ضروری تھا۔ خصوصاً اسلام کا دائرہ وسیع ہو جانے کے بعد تو جھگڑا
فساد تو برائے نام بھی نہ رہتا۔ کیونکہ اتحاد و اتفاق اسلام کا خصوصی رکن ہے۔

۲۔ اسلام کی حقیقت کا دلوں پر چھا جانا کدورت قلبیہ کو ختم کر دیتا ہے لہذا استقرار دعوت نبوت کے بعد قتل و مقاتلہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی؟
جواب۔ آیت مجیدہ میں رسل کی بعثت اور ان کا باہمی تفاضل ظاہر کرنے کے بعد سوالیہ مذکور کے جواب کا بیان ہے کہ چونکہ تمام
امور کو خدا نے علل و اسباب کا تابع بنایا ہے اور قتل و مقاتلہ کی علت ہے اختلافات کا وجود۔ پس اگر اختلافات ختم ہو جاتے تو
ظاہریاں بھی ختم ہو جاتیں لیکن نہ اختلافات ختم ہوا۔ نہ لڑائی ختم ہوئی ہاں اگر خدا چاہتا تو سرے سے امور کو اسباب کا تابع نہ بناتا یا اسباب
کو غیر مؤثر قرار دیتا۔ پس قتل و قتال وغیرہ کا خاتمہ ہو جاتا لیکن اس میں جبر لازم آتا اور خدا کی مشیت کے وہ منافی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ

اسے ایمان والو۔ خرچ کرو ہمارے دیئے ہوئے رزق سے۔ پہلے اس کے کہ وہ دن آجائے جس میں سودا

يَوْمَ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ۖ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۱۳۵﴾

نہ ہوگا نہ دوستی (بجز ایمان کے) اور نہ شفاعت (بغیر مومن کے) اور کافر ہی ظالم ہیں

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۚ لَا تَأْخُذُهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ ۚ لَهُ

اللہ کہ اس کے بغیر کوئی بھی مستحق عبادت نہیں ہے جو حقیقی و قدیم ہے نہ اس پر غلبہ کرتی ہے اور نہ نیند اس کا

مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ

ہی ہے تمام وہ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ کون (جبرأت کر سکتا) ہے کہ سفارش کرے (کسی کی) اس کے سامنے

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ

بجز اس کے اذن کے وہ جانتا ہے وہ واقعات جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں اور جو ان کے بعد آئیں گے اور وہ نہیں احاطہ کر سکتے کسی

إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ ۖ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۚ

چیز کا اس کے علم میں سے مگر جس کو وہ چاہے۔ وسیع ہے اس کی کرسی آسمانوں اور زمینوں سے اور نہیں دشوار اس پر ان دونوں کی حفاظت اور وہ تمام

رکوع نمبر ۲ تَفْسِيرُ آيَةِ الْكُرْسِيِّ

وَلَا شَفَاعَةٌ۔ اس مقام پر شفاعت کی ظاہر نفی کی گئی ہے اور چونکہ شفاعت کا ہونا احادیث میں تو اتار سے ثابت ہے بلکہ قرآن میں بھی دوسرے مقام پر شفاعت ثابت ہے چنانچہ آیت الکرسی میں إِلَّا بِإِذْنِهِ کا کلمہ شاہد ہے کہ جن کو اذن ہو گا وہ شفاعت کریں گے اور اس سے مراد انبیاء و ائمہ ہیں جو گنہگار ان امت کی شفاعت کریں گے بلکہ یہ بھی منقول ہے کہ بعض نیک مومن بھی حد تک شفاعت کر سکیں گے لہذا اس مقام پر شفاعت کی نفی غیر مومن کے لئے ہے۔

مجمع البیان میں کتب عامہ سے مروی ہے کہ عبد اللہ بن عمر کہتا ہے کہ جناب رسول خدا نے فرمایا۔ جو

آیت الکرسی کی فضیلت شخص ہر فریضہ نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھے گا تو بوقت موت اس کی قبض روح خود خداوند عالم

اپنے یہ قدرت سے فرمائے گا اور اس کا ثواب انبیاء کے ہمراہ جہاد کر کے شہید ہونیوالوں کے برابر ہوگا اور حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضورؐ نے بر سر منبر ارشاد فرمایا کہ جو شخص ہر نماز فریضہ کے بعد آیتہ الکرسی پڑھتا رہے تو اس کے اور جنت کے درمیان صرف موت ہی کا فرق رہ جاتا ہے اور اس کو ہمیشہ نہیں پڑھتے مگر صدیق یا عابد۔ اور جو شخص اس کو سونے سے پہلے تلاوت کرے تو خدا اس کو جمعہ ہمسایوں کے امن میں رکھے گا۔ ایک اور حدیث میں حضورؐ نے فرمایا کہ تمام کلاموں کا سردار قرآن ہے اور تمام قرآن میں سورۃ بقرہ سترار ہے اور تمام سورۃ بقرہ میں آیتہ الکرسی سردار ہے فرمایا۔ اے علیؑ اس میں پچاس لفظ ہیں اور ہر لفظ میں پچاس برکتیں ہیں۔

اور حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جو شخص ایک مرتبہ آیتہ الکرسی کو پڑھے تو خداوند عالم اس سے دنیا و آخرت کی ایک ایک ہزار سختیاں دُور فرماتا ہے کہ کم از کم سختی دنیا کی فقر اور کم از کم سختی آخرت کی عذاب قبر ہے۔ اور ایک روایت میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ ہر شے کی ایک چوٹی ہوتی ہے اور قرآن مجید کی چوٹی آیتہ الکرسی ہے۔ مومنوں کے قبرستان میں آیتہ الکرسی پڑھ کر ثواب ان کو بخشا بہت باعثِ ثواب ہے۔

خواص :- ۱۔ ہر نماز فریضہ کے بعد پڑھنا رزق کی زیادتی کا موجب ہے۔

۲۔ صبح و شام پڑھنا۔ چور۔ ڈاکو۔ آتش زنی وغیرہ سے حفاظت کا موجب ہے۔

۳۔ روزمرہ ہر فریضہ نماز کے بعد پڑھنا سانپ و بچھو کا تعویذ ہے بلکہ جن دالنس اس کو ضرر نہ پہنچا سکیں گے۔

۴۔ اگر اس کو لکھ کر کھیت میں دفن کیا جائے تو کھیت چوری اور نقصان کی آفت سے محفوظ رہے گا اور باعثِ برکت ہے۔

۵۔ اگر لکھ کر دوکان میں رکھی جائے تو بہت باعثِ برکت ہے۔

۶۔ گھر میں لکھ کر رکھنا چوری سے امان کا باعث ہے اگر مرنے سے پہلے پڑھ لے تو بہشت میں اپنی جگہ دیکھے گا۔

(از عمدۃ البیان)

۷۔ سوتے وقت ہر روز آیتہ الکرسی کا پڑھنا فالج سے حفاظت کا باعث ہے۔ (برہان) فرمان صادق علیہ السلام **سَلِّطْ وَلَا تَكُومْ**۔ منقول ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا۔ کہ تیرا خدا جاگتا ہے یا سوتا ہے تو حضرت موسیٰ نے اپنی مناجات میں بارگاہِ خدا میں عرض پیش۔ پس ارشاد ہوا کہ تو ایک شب دروز خواب نہ کر۔ اس کے بعد ایک فرشتہ دو شیشیاں لے کر نازل ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم سنایا کہ ان دونوں کو ہاتھوں میں رکھ اور ان کی حفاظت کر اور نیند نہ کرنا، لیکن چونکہ ان پر پورے شب دروز کی بیداری کی وجہ سے نیند کا غلبہ تھا۔ ہر چند انہوں نے نیند کے دفع کرنے کی کوشش کی لیکن آخر کار نیند غالب آئی اور ہاتھ پر ہاتھ جو لگا تو دونوں شیشیاں چور ہو گئیں۔ پس جبریل نازل ہوا۔ اور کہا کہ خدا فرماتا ہے۔ اے موسیٰ! تو خواب میں دو شیشیوں کو محفوظ نہیں کر سکا۔ اگر میں سو جاؤں تو زمین و آسمان کا نظام کون محفوظ کرے گا۔ (زمعدۃ البیان) اور یہودیوں نے یہی سوال جناب رسول خداؐ سے بھی کیا۔

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿۱۵۵﴾ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ

(صفات نقص سے بلند کبریا میں) عباد عظیم سے نہیں زبردستی دین میں تحقیق ظاہر ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے۔ پس

مِنَ الْغَىِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ

جو کفر کرے شیطان کا اور ایمان لائے اللہ کے ساتھ تو گویا اس نے

بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۵۶﴾

پکڑا دستاویز محکم کو جو کبھی نہ ٹوٹے گا۔ اور خدا سُننے جانتے والا ہے

تو آیت الکرسی نازل ہوئی۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ کیا جنت والے سوئیں گے تو فرمایا کہ نیند موت کی بہن ہے۔ وہاں نہ جنتی سوئیں گے اور نہ دوزخی سوئیں گے۔ (البرہان) ج ۲ ص ۳۳۲

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَهِيَ سَاعِدَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ صادقین علیہم السلام سے مروی ہے کہ کرسی سے مراد اس مقام پر علم ہے یعنی خدا کا علم آسمان اور زمین پر حاوی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کرسی سے مراد عرش ہے اور بعض نے قدرت ملک اور سلطنت اس سے مراد لی ہے۔ نیز منقول ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کی حیثیت کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہے جس طرح ایک انگوٹھی ایک وسیع جنگل میں اور کرسی کی نسبت عرش سے بھی ایسی ہے جس طرح ایک انگوٹھی یا چھلا ایک وسیع جنگل میں پڑا ہو۔

علم ہیئت والوں کے نزدیک کرسی سات آسمانوں کے اوپر محیط ہے اور وہ اس کو فلک البروج کہتے ہیں اور ان کے نزدیک تمام ستارے اور بروج وغیرہ اسی میں ہیں

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ۔ روایت میں ہے کہ خداوند کریم نے اپنے ناناؤں سے ناموں میں سب سے پہلے اپنی ذات مقدس کے لئے الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ کو منتخب فرمایا۔

لَا إِكْرَاهَ۔ اس کے شان نزول کے متعلق بعضوں نے کہا ہے کہ ایک انصاری ایک حبشی غلام صبح نامی کو اسلام لانے پر مجبور کرتا تھا۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔

اور بعضوں نے کہا ہے کہ ایک مرتبہ شام سے کچھ تاجر وادعیہ ہوئے انہوں نے حصین انصاری کے دو بیٹوں کو نصرانیت کی دعوت دی پس وہ دونوں نصرانی ہو گئے اور ان کے ہمراہ شام چلے گئے اس پر حصین نے جناب رسول خدا کو خبر دی تو یہ آیت نازل ہوئی۔

بعض لوگ اس کو آیت جہاد سے منسوخ جانتے ہیں اور بعض کے نزدیک یہ حکم صرف ذمی کافروں کے لئے مخصوص ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اعمال شرعیہ کی بجا آوری میں انسان مختار کل ہے اور اس پر اللہ کی طرف سے

کوئی جبر نہیں کیونکہ نیکی و بدی ہر دو کا رستہ بتایا جا چکا ہے اب انسان کی اپنی مرضی نیکی کی طرف آئے یا برائی کی طرف جائے گا یہ آیت اس عقیدہ کو چیلنج کر رہی ہے کہ نیکی و بدی سب اللہ ہی کر داتا ہے اور انسان اپنے افعال میں مجبور ہے۔ حاشاً و کلاً ہم تفسیر کی جلد ۱ میں پہلے رکوع کے تحت میں مسئلہ جبر کو بیان کر چکے ہیں۔

علمی نکتہ

چونکہ دین کی اصل معرفت و اعتقادات ہے اور اعمال و عبادات مالیہ و بدنیہ اس کی فروعات ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اعتقاد کیفیت قلبیہ ہے جس میں جبر و اکراہ مؤثر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے لئے علیحدہ علل و اسباب ہیں جو اس کے حصول کا پیش خیمہ ہوا کرتے ہیں۔ پس لا اکراہ فی الدین کا جملہ ترکیب نحوی کے لحاظ سے یا تو جملہ خبریہ ہے تو مقصد یہ ہے کہ دین ایک ایسی چیز ہے جس میں جبر و اکراہ قطعاً داخل نہیں ہوا کرتا۔ اور یہ اُن لوگوں کی تردید ہے جو کہتے ہیں کہ اسلام تلوار سے زور سے پھیلا ہے اور اگر یہ جملہ انشائیہ قرار دیا جائے تو دین کے قبول کرانے کے لئے جبر و تشدد کو منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ جبر اعمال ظاہریہ و افعال بدنیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ قلبی میلان اور اعتقادی رجحان میں اس کا کوئی اثر نہیں ہوا کرتا۔ لہذا جبر کا استعمال بے ہودہ اور بے معنی ہے۔

قَدْ تَبَيَّنَ الشُّدُّ۔ یہ نفی اکراہ کی تعلیل ہے کہ کوئی حاکم کسی امر ضروری میں تشدد و جبر کو اس وقت استعمال کرتا ہے۔ جب ماتحت میں فعل مامور بہ کی خوبی و بدی کے سمجھنے کی اہلیت نہ ہو۔ جس کی وجہ سے وہ فعل مامور بہ کی مصالح سے مطلع نہ ہو سکے یا ماتحت میں سمجھنے کی اہلیت ہو لیکن بعض مصلحتوں کی وجہ سے اس کو سمجھنا خلاف مقصود ہو تو ان حالات میں امور ضروریہ کی بجا آوری میں تشدد سے کام لیا جاتا ہے اور مامور بہ کے لئے سوائے تقلیدی رویت کے اور کوئی چارہ کار نہیں ہوتا۔ لیکن دین اسلام کی اچھائی اور اس کے رد کرنے کی برائی کو سمجھنے کے لئے نہ انسانوں میں فہمی مغذوری ہے کیونکہ اس کے اصول فطری اور مطابق عقل ہیں اور نہ حاکم مطلق نے ان کے سمجھانے میں کوئی کمی کی ہے بلکہ وحی اور نبوت کے ذریعے سے ہدایت اور گمراہی کے ہر دو طریق پوری طرح واضح کر دیئے گئے ہیں۔ پس اس وضاحت کے بعد جبر و اکراہ کا سوال باقی ہی نہیں رہتا۔ بلکہ صاحب عقل و فہم انسان نفع و نقصان کے سمجھنے کے بعد اپنے اختیار و ترک میں مختار ہے لہذا اس میں جبر کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔

نیز اس بیان سے یہ امر بھی پوری طرح واضح ہو گیا کہ دین اسلام زور تلوار سے ہرگز نہیں پھیلا۔ بلکہ اس کے مشن کی صداقت اور اس کے اصول کی مبنی بر حقیقت جاذبیت نے چہار وائگ عالم میں اس کی مقبولیت کا ڈنکا بجایا اور اس کی فطری و طبعی ناقابل تردید براہین نے فضائے عالم میں اس کا جھنڈا لہرایا ہے پس روز روشن کی طرح اس امر کی بھی وضاحت ہو گئی کہ یہ آیت تا قیام قیامت منسوخ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کسی حکم کی منسوخی موت ہو سکتی ہے جبکہ پہلے اس کی علت کو منسوخ کیا جائے اور

میں اس عدم اکراہ کی علت ہے ہدایت و گمراہی کے رستوں کی وضاحت اور یہ علت تا قیامت قابل نسخ نہیں۔ لہذا اس کا معطل حکم یعنی جبر و تشدد کے استعمال کی منع بھی ہرگز نسخ پذیر نہیں ہو سکتا۔ پس جن لوگوں نے اس حکم کو جہاد والی آیات سے منسوخ قرار دیا ہے یہ ان کا اشتباہ ہے اور اسلام کی جملہ لڑائیاں دین اسلام کی نشر و اشاعت کی خاطر نہیں تھیں۔ بلکہ جو لوگ انسانیت کے اس فطری حق پر پردہ ڈالنے اور شمع توحید کو بجھانے کے درپے تھے۔ اسلام کی لڑائیاں بحکم جہاد۔ اس نفیس ترین شارع فطرت یعنی کلمہ توحید کی حفاظت کے لئے مرت و دفاعی حیثیت سے تھیں۔ نہ ان میں تو بیع دائرہ اسلام کی ہوس کا فرما تھی اور نہ ملک گیری کا جذبہ موجب تحریک تھا۔ کیونکہ ملک گیری کا جذبہ تبلیغ اسلام سے بالکل منافات رکھتا ہے اور جبر و تشدد اور فائتخانہ انداز دائرہ اسلام کی توسیع میں فائدہ بخش نہیں کیونکہ اصل دین ہے معرفت اور وہ اکراہ سے حاصل کی نہیں جاسکتی الطاغوت سے مراد شیطان یا سرکش خواہ جن ہو یا انسان، یا کاہن یا جادوگر، یا بت ہے (باقوال مفسرین)

برایت ابو بصیر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ قائم آل محمد علیہ السلام سے پہلے جو جھنڈا بلند ہو پس سمجھ لو کہ اس کا اٹھانے والا طاغوت ہے۔ تفسیر قمی سے نقل کیا گیا ہے کہ طاغوت سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے آل محمد کے حقوق کو غصب کیا۔

الْعُرْوَةُ الْوُثْقَى - تفسیر برہان میں ابن عباس سے منقول ہے کہ جناب رسالتاً نے فرمایا کہ جو شخص الْعُرْوَةَ الْوُثْقَى سے تمسک پکڑنا چاہے جو کبھی نہ ٹوٹے گا تو اس کو چاہیے کہ میرے بھائی اور وصی حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت سے تمسک پکڑے کیونکہ اس کا محب و موالی ہلاک نہ ہوگا اور اس کا منکر و دشمن نجات نہ پائے گا۔

(۲) حذیفہ بن اسید سے مروی ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا۔ اے حذیفہ! میرے بعد تم پر اللہ کی حجت علی بن ابی طالب علیہ السلام ہے۔ اس کا کفر اللہ کا کفر، اس کا شرک اللہ کا شرک۔ اس میں شک اللہ میں شک۔ اس سے کنارہ اللہ سے کنارہ، اس کا انکار اللہ کا انکار اور اس پر ایمان اللہ پر ایمان ہے۔ کیونکہ وہ رسول اللہ کا بھائی، ان کا وصی۔ ان کی امت کا امام ہے اور وہ اللہ کی مضبوط رستی اور الْعُرْوَةُ الْوُثْقَى ہے جو ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اس (علی) کے متعلق دو قسم کے انسان ہلاک ہوں گے۔ ایک غالی جو ان کو اپنی حد سے بڑھا کر خدا یا خدا کی صفات میں شریک کہیں گے) دوسرے مقصر (جو اس کو اپنے حقوق سے پیچھے ہٹا کر دوسروں کو اس کی جگہ دیں گے)۔ اے حذیفہ۔ علی سے جدا نہ ہونا، ورنہ تو مجھ سے جدا ہو جائے گا۔ اور علی کی مخالفت نہ کرنا، ورنہ تو میرا مخالف ہوگا۔ کیونکہ علی محمد سے ہے اور میں علی سے ہوں۔ جس نے اس کو ناراض کیا اُس نے مجھے ناراض کیا اور جس نے اس کو راضی کیا اُس نے مجھے راضی کیا۔

(۳) اسناد سابق سے جناب رسالتاً نے فرمایا حسین کی اولاد سے ہونے والے امام جس نے ان کی اطاعت کی۔ اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے ان کی نافرمانی کی۔ اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ یہی عروہ وثقی ہیں اور یہی اللہ تمسک پہنچنے کا وسیلہ ہیں۔

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۚ وَ

اللہ دلی ہے ایمان والوں کا کہ ان کو نکالتا ہے (کفر کی تاریکیوں میں سے طرف نور (ہدایت) کے اور

الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اُولٰٓئِهِمُ الطَّاغُوتُ لَا یُخْرِجُوْنَهُم مِّنَ النُّوْرِ

وہ لوگ جو کافر ہیں ان کے اولیاء شیطان ہیں۔ کہ ان کو نکالتے ہیں نور (ہدایت) سے طرف

اِلَى الظُّلُمٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

(کفر کی) تاریکیوں کے۔ ایسے لوگ جہنم میں جانے والے ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے

(۴) نیز جناب رسول خدا سے منقول ہے کہ جو شخص عروہ وثقی (دستاویز حکم) سے تمسک پکڑنا چاہے۔ پس وہ علی اور اس کی اہلبیت کی محبت کو اختیار کرے۔

(۵) جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے ایک اپنے لمبے خط میں ارشاد فرمایا۔ کہ رسول خدا اپنی امت میں ایک کتاب خدا اور دوسرے اپنا وصی علی بن ابی طالب چھوڑ گئے۔ جو امیر المؤمنین امام المستین جیل اللہ التین العروہ الوثقی اور عہد مژدہ ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا مصدق ہے۔

(۶) بطریق مخالفین۔ عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ سے منقول ہے کہ حضرت رسول خدا نے حضرت علی کو فرمایا: اَنْتَ الْعُرْوَةُ الْوُثْقٰی (تو خدا کی حکم دستاویز ہے)

(۷) امام علی رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ جناب رسالت اکبر نے فرمایا۔ میرے بعد تاریک فتنہ ہوگا۔ نجات وہی پائے گا جو عروہ وثقی سے تمسک پکڑے گا۔ جب اس کے متعلق دریافت کیا گیا کہ وہ کون تھے؟ تو فرمایا۔ کہ سید الوصیین کی ولایت میرے بعد چھا گیا کہ سید الوصیین کون ہے؟ تو فرمایا۔ امیر المؤمنین۔ پھر پوچھا گیا کہ وہ کون ہوگا؟ تو فرمایا کہ جو مسلمانوں کا حاکم اور میرے بعد امام ہوگا پھر سوال ہوا کہ آپ کے بعد امام اور مسلمانوں کا حاکم کون ہوگا تو آپ نے فرمایا۔ کہ وہ میرا بھائی علی بن ابی طالب ہے اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ تفسیر برہان میں کافی اور دیگر کتب امامیہ سے بروایت عبداللہ بن ابی یوسف منقول ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی کہ میں لوگوں سے ملتا جلتا ہوں تو مجھے تعجب ہوتا ہے کہ بعض لوگ جو آپ سے تو لا نہیں رکھتے اور فلاں فلاں سے دوستی رکھتے ہیں۔ ان میں امانت سچائی اور وفا پائی جاتی ہے اور ایک قوم جو آپ سے تو لا رکھتی ہے، ان میں وہ امانت، وفا اور سچائی نہیں پائی جاتی۔ راوی کہتا ہے کہ یہ سنتے ہی امام علیہ السلام سیدھے ہو بیٹھے اور غصے میں میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا جو شخص ظالم امام کی ولایت کا قائل ہو

جو خدا کی طرف سے نہیں اس کا کوئی دین نہیں اور جو شخص امام عادل منصوص من اللہ کی ولایت کا قائل ہو اس پر کوئی عتاب نہیں۔ میں نے عرض کی کہ اُن کا کوئی دین نہیں اور ان پر کوئی عتاب نہیں؟ تو فرمایا۔ ہاں! اُن کا کوئی دین نہیں اور ان پر کوئی عتاب نہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ کیا تو نے خدا کا یہ فرمان نہیں سنا۔ فرماتا ہے۔ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا یُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ط اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا ان کو گناہ کی تاریکیوں سے نکال کر توبہ اور بخشش کی نورانیت کی طرف منتقل کر دیتا ہے کیونکہ وہ امام عادل سے تو لا رکھتے ہیں جو کہ منصوص من اللہ تھا اور خدا فرماتا ہے وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا اَدْلِیَآءُ لَهُمُ الطَّاغُوتُ یُخْرِجُوْنَهُم مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے وہ نور اسلام میں تھے جب انہوں نے امام ظالم کو امام مان لیا جو اللہ کی طرف سے نہ تھا کہ وہ ان کی ولایت کی وجہ سے نور اسلام سے نکل کر کفر کی تاریکی میں چلے گئے۔ پس خدا نے کفار کے ساتھ ان کے لئے جہنم واجب کر دیا۔ پس وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

ابن ابی یعفور کہتا ہے کہ میں نے عرض کی کیا۔ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا سے عام کافر مراد نہیں ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ کافروں کے پاس پہلے نور ہی کون سا تھا جس سے وہ نکالے گئے؟ بلکہ اس سے وہی معنی مراد ہے جو میں نے بیان کیا۔ بروایت ابن شہر آشوب امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آیت مجیدہ میں نور سے مراد ولایت علی ابن ابی طالب ہے اور ظلمات سے مراد دشمنان علی کی ولایت ہے اور طاغوت سے مراد علی بن ابی طالب کی ولایت کے منکرین اور ان کے دوست ہیں۔

ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے دشمن ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ خواہ اپنے نزدیک انتہائی متقی، زاہد اور عبادت گزار ہی کیوں نہ ہوں۔
اقول:۔ اس مطلب کو استدلالی رنگ میں ہم نے کتاب ہذا کی جلد اول یعنی مقدمہ تفسیر میں مفصل بیان کیا، عدل، احباط، شفاعت اور ولایت آل محمد اور ضرورت امام کے عناوین ملاحظہ فرمائیں۔ نیز اسی جلد میں اسی پارہ کے رکوع مذاکی تفسیر کے ذیل میں اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ کے تحت میں کسی قدر بیان کیا گیا ہے۔

مسئلہ:۔ یہ دو آیتیں ویسے آیتہ الکرسی سے الگ ہیں لیکن بعض نمازیں جن میں آیتہ الکرسی پڑھی جاتی ہے مثلاً نماز وشت یا نماز غریہ وغیرہ تو وہاں آیتہ الکرسی سے مراد یہ تینوں آیتیں ہوا کرتی ہیں۔ یعنی ان نمازوں میں هُمْ فِیْهَا خَلِدُوْنَ تک پڑھنا چاہیے جس طرح کہ کتب فقیہ میں مذکور ہے۔

الَّذِي إِلَىٰ الذِّئِ حَاجٌّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ أَتَاهُ اللَّهُ الْمَلِكُ

کیا تم نے نہیں دیکھا وہ شخص جس نے جھگڑا کیا ابراہیم سے اس کے رب کے متعلق اس لئے کہ دیا اس کو خدا نے ملک

إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ

جب فرمایا ابراہیم نے کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ تو کہنے لگا کہ میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں۔

فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ

تو فرمایا ابراہیم نے کہ تحقیق اللہ لاتا ہے سورج کو مشرق سے پس تو لا کر دکھا مغرب کی طرف سے۔ تو لا جواب

الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۲۵۸﴾

ہو گیا کافر۔ اور خدا نہیں ہدایت فرماتا۔ اس قوم کو جو ظالم ہو

رکوع نمبر ۳ نمود کا حضرت ابراہیمؑ سے مناظرہ

اَلْعَزَّوَجَلَّ۔ یہ قصہ حضرت رسالت کی تسلی و اطمینان کیلئے ہے کہ ہمیشہ سے دشمنانِ خدا نبیوں کو ستاتے رہے اور نبی حوصلہ کرتے رہے ہیں۔
إِلَى الذِّئِ۔ حضرت ابراہیمؑ سے جھگڑا کرنے والے کا نام نمود بن کغان تھا اور کہتے ہیں کہ یہ پہلا شخص ہے جس نے خدائی
دعوئے کیا۔ اور تفسیر برہان میں ابوبصیر سے منقول ہے کہ ایک دفعہ حضرت یوسف بادشاہ کے پاس آیا تو بادشاہ نے
ان کو ابراہیمؑ سمجھ کر ان سے مزاج پرسی کی۔ حضرت یوسف نے فرمایا کہ میں ابراہیمؑ نہیں ہوں بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے فرزند
حضرت اسحقؑ کا پوتا ہوں۔ یہ وہی بادشاہ تھا جس نے ابراہیمؑ سے مناظرہ کیا تھا؟ اس کی عمر چار سو برس تھی اور جوان تھا؟
مناظرہ کا موضوع۔ توحید تھا اور یہ مناظرہ حضرت ابراہیمؑ کی بت شکنی کے بعد اور آگ میں ڈالے جانے سے
پہلے واقع ہوا تھا اور بعض نے کہا ہے کہ آگ میں ڈالے جانے کے بعد تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرے سے خدا کے
وجود کا منکر نہیں تھا بلکہ لوگوں کو دھوکا دینے کیلئے اس فعلِ شیع کا مرتکب تھا جس طرح کہ فرعون مصر پس اس کا خدائی دعویٰ
صرف دنیاوی گھمنڈ پر تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے دلیل پیش فرمائی کہ میرا خدا مارتا اور جلاتا ہے تو اس نے جواب میں کہہ دیا کہ
ایسا تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ آپ نے پوچھا۔ کیسے؟ اس نے کہا کہ دردِ واجب القتل قیدیوں کو حاضر کر کے ایک کو رہا کر دوں گا
اور دوسرے کو قتل کر دوں گا۔ چنانچہ اس نے ایسا کر بھی دیا آپؑ فرمایا اگر تو جلا سکتا ہے تو قتل کرنے کے بعد اسی کو زندہ کر دکھا۔

اس میں اگرچہ وہ لاجواب تھا۔ لیکن عوام الناس ان باریکیوں کو نہ سمجھتے تھے۔ پس فوراً آپ نے پہلی بات کی تائید میں سورج کے ابھارنے کو دلیل پیش فرمادیا۔ اب نمرود نے سمجھا کہ اگر میں یہ کہتا ہوں کہ مشرق سے میں لایا کرتا ہوں تیرا خدا مغرب سے لائے تو اس کو یقین تھا کہ ابراہیمؑ ایسا کر لے گا اور میں زیادہ شرمسار ہوں گا۔ لہذا خاموشی کو غنیمت سمجھا۔ کیونکہ دل سے تو وہ خدا کی قدرت کا معترف تھا اور اپنے آپ کو عاجز جانتا تھا۔

تنبیہ:۔ مردوں کو زندہ کرنا۔ یا دوشمس کو بدل دینا صرف اللہ ہی کا کام ہے۔ اسی لئے حضرت ابراہیمؑ نے ان فعلوں کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا۔ بلکہ اللہ کے وجود کی دلیل قرار دیا ہے۔ پس اگر کسی کا بل انسان (خواہ نبی ہو یا امام) سے اس قسم کے افعال ظہور پذیر ہوں تو یہ ان کے خدا ہونے کی دلیل نہیں بلکہ یہ ان کے خدا دوست ہونے کی علامت ہے کہ خدا نے ان کی صداقت منوانے کے لئے ان کی دعا کو قبول کر کے نظام ظاہری کو بدل دیا۔ کیونکہ اس مقام پر اگر نمرود ضد کرتا تو حضرت ابراہیمؑ کے لئے خداوند کریم نظام شمسی کو تبدیل فرما کر ان کی صداقت کو تسلیم کر داتا۔ لیکن نمرود کی ہارنے اس حد تک نوبت کو آنے ہی نہ دیا۔ پس کسی انسان کا بل کی دعا سے نظام شمسی کی تبدیلی اس کی خدائی کی دلیل نہیں اور اسی طرح باذن خدا مردوں کو زندہ کر لینا بھی خدائی کی دلیل نہیں۔ بلکہ خدا وہ ہے جو اپنے مخصوص بندوں کی شان دکھانے کے لئے ان کی دعاؤں کو یہ اثر بخش دیتا ہے کہ ان سے اس قسم کے خارق عادت افعال ظہور پذیر ہوں۔

پس حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے لئے رد شمس یا مردوں کا زندہ ہونا۔ ان کی بارگاہ رب العزت میں عظیم المنزلت ہونے کی دلیل ہے کہ ان کی دعاؤں کو مستجاب فرما کر خدا نے ان کی شان و عظمت کا سکھ لوگوں کے دلوں پر بٹھا دیا ہے۔ بعض جہلاء مقررین اس مقام پر عوام کو دھوکا میں ڈالتے ہوئے یہ کہہ جاتے ہیں کہ دیکھو ابراہیمؑ نے رد شمس کو تو حید کی دلیل قرار دیا اور حضرت علیؑ نے رد شمس کر دکھایا۔ پس حضرت ابراہیمؑ کے بیان کردہ قاعدہ کی رُو سے یہ خدا ٹھہرے اور بعض جہلاء سے مجھے شاید خود سننے کا اتفاق ہوا ہے کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں اور قرآن نے بھی ملت ابراہیمی پر چلنے کا درس دیا ہے اور ابراہیمؑ کا عقیدہ یہ ہے کہ جو مغرب سے سورج کو لا کر دکھائے وہ خدا ہے۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ ملت ابراہیمی کی رُو سے علیؑ خدا ہے۔ معاذ اللہ۔

ایمان والوں کو خداوند کریم اس قسم کے فاسد عقائد سے محفوظ رکھے۔ بیان کرنے والے صرف نعرہ لگوانے اور اپنی خطابت کا سکھ بٹھانے کے لئے یہ سب جتن کرتے ہیں۔ جس سے عوام کا اعتقاد اور اپنی عاقبت تباہ کرتے ہیں۔ رد شمس کے متعلق حقیقت یہ ہے کہ جناب امیر المومنین کے زانو پر جناب رسالتؐ کا سر تھا۔ بیدار کرنا مناسب نہ سمجھا لہذا اشارے سے نماز پڑھ لی۔ حضورؐ کی آنکھ کھلی تو دریافت فرمایا کہ نماز کا کیا ہوا۔ آپ نے جواب میں عرض کی۔ کہ حضورؐ! اشارے سے پڑھ لی ہے۔ حضرت رسالتؐ نے دعا مانگی۔ اے میرے اللہ اگر تیرا بندہ علیؑ تیری اور تیرے رسولؐ کی اطاعت میں تھا۔ تو تو اس کے لئے شمس کو واپس پھیر دے۔ پس ابھی جناب رسالتؐ کی دعا ختم ہی نہ ہوئی تھی کہ سورج واپس آیا اور حضرت علیؑ نے نماز

اداکی۔ مہر کیف سورج کا واپس پلٹنا خدا کا فعل ہے اور وہ اپنے خاص بندوں کی دعا کو قبول کر کے ان کے لئے ان چیزوں کو معرض ظہور میں لاتا ہے اگر حضرت ابراہیم کو مزدت پڑتی اور دعا کرتے تو ان کے لئے بھی سورج مغرب سے طلوع کرتا جس طرح کہ حضرت علیؑ کے لئے بوقت مزدت جناب رسالتؐ کی دعا سے سورج مغرب کی طرف سے پلٹ آیا۔ پس خدا وہ بالا و برتر ذات ہے جو اپنے مخصوص بندوں کی دعاؤں کو اتنا زبردست اثر عطا فرمادیتا ہے کہ ان کے طفیل نظام عالم میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے اور بلائیں خدایاں اس سے بھی زیادہ کرنے پر قادر ہے۔ نیز ردّ شمس کی روایات متعدّد ہیں اور الفاظ مختلفہ وارد ہیں اور سب کا مال یہ ہے کہ خدا نے ردّ شمس کے بارے میں دعا کو مستجاب فرمایا اور سورج واپس پلٹا۔ پس جو شخص انبیاء یا ائمہ کو اس قسم کے معجزات یا خارق عادات چیزیں دیکھے کہ خدا مانیں یا خدا کا شریک مانیں وہ کافر اور مشرک ہیں۔ انبیاء اور ائمہ علیہم السلام اس قسم کے لوگوں سے بیزار ہیں۔ خداوند کریم تمام مومنین کو اس قسم کے بے ہودہ اور بے بنیاد عقائد سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

نیز اگر یہی بات درست ہو کہ جن کے لئے سورج واپس پلٹ آئے پس اس کو خدا مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر نمرود حضرت ابراہیمؑ کے سامنے بھند ہو جاتا اور حضرت ابراہیمؑ خدا سے دعا مانگ کر سورج کو پلٹا دیتے (اور یقیناً ایسا ہی ہوتا کیونکہ سچے اور برحق اولوالعزم پیغمبر تھے اور ان کی دعا مستجاب تھی) تو ایسی صورت میں عوام الناس نمرود کو خدائی دعوے میں جھوٹا قرار دے کر حضرت ابراہیمؑ کو خدا تسلیم کر لینے میں حق بجانب ہوتے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اور اگر ایسا ہوتا۔ تو جس طرح وہ لوگ نمرود کو خدا کہہ کر مشرک تھے اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کو خدا مان کر بھی مشرک ہی رہتے۔ خدا وہ ہے جس نے ابراہیمؑ کو ابراہیمؑ بنایا، محمدؐ کو محمد بنایا، اور علیؑ کو علی بنایا۔ یہ سب اس کے عہد میں اور وہ ان سب کا معبود ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ چار آدمی پورے ردّے زمین کے بادشاہ گذرے ہیں۔ دو مسلمان اور دو کافر۔ حضرت سلیمان بن داؤد اور حضرت ذوالقرنین یہ دونوں مسلمان اور نمرود اور بخت نصر یہ دونوں کافر تھے (غالباً ان کے پوری زمین پر بادشاہ ہونے کا مقصد یہ ہو گا کہ ان کے زمانہ میں ان کا اقتدار پورے ردّے زمین پر تسلیم تھا اور باقی کسی خطہ زمین کا کوئی حکمران ان کے آگے سر اٹھانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا)۔ مجمع البیان میں ابن عباس سے مروی ہے کہ چتر نمرود کے منہ پر بیٹھا اور اس کو کاٹا۔ نمرود نے اس کو پکڑنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو وہ اڑ کر اس کے ناک کے سوراخ میں چلا گیا پس یہ جو نہی اس کے نکلنے کی کوشش کرتا رہا وہ آگے گھسٹ گیا۔ حتیٰ کہ اس کے دماغ تک جا پہنچا۔ پس خداوند کریم نے اس کو چالیس شب و روز اسی عذاب میں گرفتار رکھا۔ اور پھر اس کو ہلاک کر دیا۔

یہ سب ذات مقدّسہ الہیہ کی مصلحتیں ہیں اگر نہ چاہا تو چار سو سال تک اپنے دشمن کو مسند الوہیت پر قبضہ جمائے ہوئے رہنے دیا اور اسے ذرہ بھر بھی عذاب زندگی کا مزہ نہ چکھایا۔ لیکن جب چاہا تو کسی کی سطوت کو مٹانے کے لئے چتر کو مسلط کر دیا اور کسی کی الوہیت مفروضہ کو دریاؤں کی بہروں کی نذر کر دیا۔

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْبَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّى

یامثل اُس کے جو گذرا ایک بستی سے اور وہ اپنی چھتوں پر گری ہوئی تھی (دلیں) کہا کیسے زندہ کرے گا

يُحْيِي هَذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ

ان کو سزا موت کے بعد پس خدا نے اس کو مار دیا ایک سو برس پھر اس کو اٹھایا۔ فرمایا

كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ

کہ تو کس قدر سویا ہے۔ عرض کی کہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ سویا ہوں فرمایا بلکہ تو تو ایک سال

مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ إِلَى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ

سوچا ہے پس دیکھ اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کی طرف کہ وہ متغیر نہیں ہوئیں اور دیکھ

إِلَى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ

اپنے گدھے کی طرف۔ اور تاکہ تجھے لوگوں کے لئے ہم نشانی بنائیں اور دیکھ طرف ان کی ہڈیوں کے کہ کس طرح ہم

نُنشِرُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ

ان کو جوڑتے ہیں پھر ان کو گوشت پہناتے ہیں پس جب بات واضح ہو گئی تو کہنے لگے میں جانتا ہوں۔ تحقیق

موت کے بعد زندگی

أَذْكَالَ ذُنَى۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ وہ عزیر علیہ السلام تھے اور حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے بھی ایسا ہی منقول ہے لیکن امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ وہ حضرت ارمیاء علیہ السلام تھے پس ان ہر دو روایتوں کی تو جہہ اس طرح ہو سکتی ہے کہ شاید یہ ایک ہی شخص ہو اور اسی کے دو نام ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ دو شخص ہوں اور ہر دو کو اس قسم کا دائعہ پیش آیا ہو۔

عَلَى قَرْبَةٍ۔ وہ بستی جس کی چھتیں گری ہوئی تھیں وہ بیت المقدس کا شہر تھا جس کو نجات نہر نے خراب کیا تھا۔

قَالَ أَنَّى يُحْيِي۔ حضرت عزیر یا ارمیاء کا یہ کہنا کہ خدا ان کو کیسے زندہ کرے گا یہ بطور تعجب یا انکار کے نہیں تھا کیونکہ نبی کو ان چیزوں پر شک نہیں ہوا کرتا اور ان کا ایمان کامل ہوا کرتا ہے نبی تو نبی بلکہ اگر کوئی عام مومن بھی خدا کے زندہ کرنے پر شک یا انکار کرے تو صغیر اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ پس ان کا یہ کہنا صرف اس لئے تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ خداوند کریم ان

کو دوبارہ زندہ کرے۔ گویا انہوں نے اپنی درخواست کا اظہار ان لفظوں میں کیا۔

نخت نصر کا قصہ

تفصیل اس قصہ کی جو کتب تفسیر میں مذکور ہے وہ اس طرح ہے کہ جب بنی اسرائیل نے برائیوں کو اپنا شیوہ بنالیا اور اللہ کے حکم سے بالکل سرکش ہو گئے تو حضرت ارمیاء پینمبر کو وحی ہوئی۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں بنی اسرائیل پر بوجہ ان کی بدکاریوں کے ایک بدترین انسان کو مسلط کر دوں گا۔ جو بدطینت اور حرام خور ہوگا۔ وہ ان کو قتل کرے گا۔ ان کی عورتوں کو قید کرے گا اور ان کے شہروں کو خراب کرے گا۔

حضرت ارمیاء نے بنی اسرائیل کے علماء سے اس کا بیان کیا تو انہوں نے عرض کی کہ قصور تو امرِ اہلِ طبقہ کا ہے۔ غریب طبقہ اور کمزور لوگ اس عذاب میں کیوں گرفتار ہوں گے۔ حضرت ارمیاء بارگاہ رب العزت میں گذار ہوئے تو خداوند کریم کی طرف سے ان کو سخت تنبیہ ہوئی اور ارشاد ہوا کہ ان سے کہہ دیجئے کہ اگرچہ تم برائیوں کے مرتکب نہیں ہو۔ لیکن تم بُروں کی برائی پر تو راضی ہے ہو تم نے منکر کو دیکھا اور اُس سے ہنسی نہیں کی۔ لہذا اس عذاب میں تم بھی ان کے ساتھ برابر کے شریک ہو۔ پس حضرت ارمیاء نے عرض کی کہ میرے اللہ! مجھے بتا کہ وہ کون شخص ہوگا۔ تاکہ میں اس سے جا کر اپنے اور اپنے بال بچوں کے لئے امان طلب کر لوں۔ تو وحی ہوئی کہ تو فلاں مقام پر جا۔ وہ ابھی لڑکا ہے جو اس وقت سخت بیمار ہے چلنے پھرنے کے قابل نہیں۔ اس کی پیدائش خبیث تر اس کا جسم نجیف تر اور اس کی غذا خسیس تر ہے۔

پس حضرت ارمیاء اسی شہر میں تشریف لائے تو دیکھا کہ ایک سرائے میں وہ ایک مزملہ پر کس مہر سی کے عالم میں پڑا ہوا ہے۔ اس کی ماں ردئی کے ٹکڑے ایک پیالہ میں لے کر اس پر سورنی کا دودھ دوہتی ہے تاکہ وہ نرم ہو جائیں پھر اس کو کہلاتی ہے۔ حضرت ارمیاء نے جانا کہ یہ وہی ہے جس کی اللہ سبحانہ نے خبر دی تھی۔ پھر اس سے دریافت کیا کہ تیرا نام کیا ہے تو اس نے اپنا نام نخت نصر بتایا۔ اب تو ان کو یقین ہو گیا کہ یہ وہی ہے پس اس کے علاج میں مشغول ہو گئے۔ مہانتک وہ تندرست ہو گیا۔ پھر فرمایا کیا تو مجھے پہچانتا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ صرف اتنا جانتا ہوں کہ تو ایک نیک آدمی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں بنی اسرائیل کا نبی ہوں۔ میرا نام ارمیاء ہے۔ خدا نے مجھے خبر دی ہے کہ وہ تجھے بنی اسرائیل پر غلبہ دے گا اور تو ان کو قتل کرے گا۔ یہ سن کر نخت نصر اس وقت حیران و ششدر سا ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت ارمیاء نے فرمایا کہ تو میرے لئے امان نامہ لکھ۔ تو حضرت ارمیاء کے فرمانے پر اس نے امان نامہ لکھ دیا۔

تندرست ہو جانے کے بعد نخت نصر کا دستور تھا کہ رات کے وقت پہاڑ کی طرف نکل جاتا اور لکڑیاں جمع کر کے لاتا۔ اور ان کو بازار میں بیچ کر گذراوقات کرتا تھا اور اسی سے ترقی کرتے کرتے ایک بار سوخ سفید پوش انسان ہو گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس نے لوگوں کو بنی اسرائیل سے لڑنے کے لئے اپنی طرف بلانا شروع کر دیا اور لوگ بھی کافی تعداد میں اس کے

حلقہ گجوش ہو گئے۔ یہاں تک کہ کثیر تعداد میں ایک تہزار لشکر لے کر بیت المقدس کی طرف متوجہ ہوا۔ کیونکہ وہ بنی اسرائیل کا سکن تھا۔ حضرت ارمیاء علیہ السلام کو جب بخت نصر کی فرج کشی کی خبر پہنچی تو وہ امان نامہ ساتھ لئے گدھے پر سوار ہو کر شہر سے باہر تشریف لائے لیکن لشکر اس قدر زیادہ تھا کہ ان کی بخت نصر تک رسائی نہ ہو سکی تو انہوں نے ایک لکڑی کے سرے پر اس امان نامہ کو باندھ کر بلند کیا۔ جب بخت نصر نے یہ دیکھا۔ تو اُن کو اپنے پاس بلا کر دریافت کیا کہ آپ کون ہیں؟ فرمایا کہ میں وہی ارمیاء بنی ہوں جس نے تجھے بادشاہی کی بشارت دی تھی اور یہ وہی امان نامہ ہے جو تو نے مجھے لکھ کر دیا تھا پس بخت نصر نے جواب دیا کہ تجھے بے شک امان ہے لیکن تیرے اہلبیت (گھر والوں) کے لئے کوئی امان نہیں۔ پس وہ بیت المقدس کے شہر میں داخل ہوا شہر کے وسط میں ایک ٹیلہ دیکھا کہ اس کے درمیان سے خون جوش مار کر اُبلتا ہے اور بند نہیں ہوتا۔ اس نے لوگوں سے دریافت کیا کہ اس کا ماجرا کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ بنی اسرائیل کے بادشاہ نے ایک بنی کو قتل کیا تھا اور یہ اس بنی کا ناحق خون ہے کہ ہم لوگ جس قدر اس پر مٹی ڈالتے ہیں یہ اور زیادہ جوش زن ہوتا ہے۔ اور یہ بنی حضرت یحییٰ بن زکریا تھے اور ان کے قتل کی وجہ یہ تھی کہ اس دور کا بنی اسرائیل کا بادشاہ زانی و بدکار تھا۔ جب حضرت یحییٰ سے اس کا گذر ہوتا۔ تو آپ اس کو اس فعل بد سے روکتے تھے اور خوف خدا کی طرف متوجہ فرماتے تھے۔

ان بدکار عورتوں میں سے ایک عورت نے جب کہ بادشاہ نشہ شراب میں چور تھا۔ بادشاہ سے کہا کہ اے بادشاہ یحییٰ کو قتل کر دیا جائے کیونکہ یہ ہماری عیش پسندی میں دخنہ اندازی کرتا ہے، بادشاہ نے فوراً اس کے قتل کا حکم دے دیا پس حضرت یحییٰ کے سر کو طشت میں اٹھا کر بادشاہ کے سامنے لایا گیا۔ تو اس پاک سر سے آواز آئی فرمایا۔ خدا سے ڈر۔ تیرے لئے زنا کاری حلال نہیں۔ پس طشت میں خون کھولنے لگ گیا۔ یہاں تک کہ زمیں پر جاری ہو گیا اور اس کا جوش بڑھتا گیا اور جوں جوں کوشش اس کو روکنے کی کی گئی۔ توں توں وہ زیادہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یہ مٹی کا پہاڑ بن گیا۔ اور بخت نصر کے غرور اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل ہونے کے درمیان ایک سو برس کا فاصلہ تھا۔

پس بخت نصر نے قسم کھالی کہ میں بنی اسرائیل کو اس وقت تک قتل کرتا رہوں گا جب تک یہ خون بند نہ ہو گا مردوں عورتوں بچوں حتیٰ کہ ان کے حیرانوں کو بھی قتل کرتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ان کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ لیکن باوجود اس کے حضرت یحییٰ کے خون کا جوش بند نہ ہوا۔ اس نے دریافت کیا کہ کیا ابھی ان شہروں میں بنی اسرائیل سے کوئی آدمی موجود ہے تو کہا گیا کہ ایک بڑھیا فلاں مقام پر رہتی ہے پس اس کو قتل کرنے کا حکم دیا چنانچہ وہ قتل کر دی گئی اور جب وہ قتل ہوئی تو حضرت یحییٰ کا خون بند ہوا۔ اور کہتے ہیں کہ یہ وہی عورت تھی جس نے بادشاہ کو حضرت یحییٰ کے قتل کا مشورہ دیا تھا۔

اس کے بعد بخت نصر بابل کی طرف آیا۔ اور یہاں ایک شہر تعمیر کیا اور حضرت دانیالؑ پر غمیر کر ایک کنواں کھدوا کر اس میں ڈال دیا۔ اور ایک عرصہ تک ان کو وہاں محبوس رکھا۔ بیت المقدس کے نبی کو دھجی ہوئی کہ بابل کے فلاں کنویں میں دانیالؑ کو آب و غذا پہنچاؤ۔ پس وہ نبی آیا اور کنویں کے کنارہ سے جھانک کے سلام کر کے

انجام بخت نصر

آواز دی۔ حضرت دانیالؑ نے جواب میں لبیک کہا۔ اس نبیؑ نے کہا کہ خداوند کریمؑ نے بعد سلام کے تجھے آب و طعام بھیجا ہے اس کو قبول کیجئے اور اس کو کنویں میں لٹکایا۔ حضرت دانیالؑ نے خداوند کریمؑ کا شکریہ ادا کیا۔ بایں الفاظ

اس اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے اپنی یار سے نہیں بھلایا۔ اس اللہ کی حمد ہے جو دعا مانگنے والے کی دعا کو رد نہیں فرماتا۔ اس اللہ کی حمد ہے جو توکل کرنے والوں کو خود کافی ہوتا ہے۔ اس اللہ کا شکر ہے جو اپنی ذات پر بھروسہ کرنے والے کو اپنے غیر کے حوالہ نہیں کرتا۔ بلکہ خود اس کا کفیل ہوتا ہے۔ اس اللہ کا شکر ہے جو احسان کا بدلہ احسان سے دیتا ہے۔ اس اللہ کا شکر ہے جو صبر کے بدلہ میں نجات عطا فرماتا ہے۔ اس اللہ کی حمد ہے جو مصائب کے بعد ان کو دفع بھی فرماتا ہے اس اللہ کا شکر ہے کہ تمام حیلوں کے ختم ہو جانے کے بعد اُسی کی ذات پر بھروسہ باقی رہ جاتا ہے اور اس اللہ کا شکر ہے کہ جب ہم اپنے اعمال سے بظن ہو جائیں تو اس کی رحمت کی امید دل میں ہوتی ہی ہے۔

بخت نصر نے خراب میں دیکھا کہ اس کا سر لوہے کا اور پاؤں پیتل کے اور سینہ سونے کا ہے فوراً بخومیوں کو بلا کر پوچھا کہ بتاؤ میں نے کیا دیکھا ہے۔ وہ کہنے لگے۔ بادشاہ۔ آپ خواب بیان فرمائیں۔ تب ہم اس کی تعبیر بیان کریں گے ورنہ ہمیں کیا معلوم کہ آپ نے کیا دیکھا ہے؟ بخت نصر کہنے لگا کہ میں تم کو تنخواہیں حرام کی دیتا ہوں۔ جب تم اتنی سی بات بھی نہیں بتا سکتے۔ پس فوراً ان سب کو قتل کر دیا۔

بعض حاضرین نے کہا۔ کہ یہ چیز وہی شخص ہی بتا سکے گا جو کنویں کی تاریکی میں مدت سے زندگی کے دن گزار رہا ہے پس حضرت دانیالؑ کو حاضر کیا گیا۔ بخت نصر نے پوچھا سوال پیش کیا۔ حضرت دانیالؑ نے اس کو خواب کا سب ماجرا سنا۔ اور اس کی تعبیر بتائی کہ بس! اب تیرا ملک زائل ہے اور تو تین دن تک قتل ہو جائے گا اور تیرا قاتل ایرانی باشندہ ہوگا یہ سنتے ہی بخت نصر نے شہر کے ہر دروازہ پر سخت پہرہ بٹھا دیا۔ اور حکم دیا کہ جو بھی اس طرف آئے اس کو قتل کر دو اور حضرت دانیالؑ کو اپنے پاس رکھا۔ کہ اگر تین روز گزر گئے اور میں قتل نہ ہوا تو تجھے قتل کر دوں گا۔ تیسرے دن جب شام ہوئی تو بخت نصر کو پریشانی اور غم لاحق ہوا۔ اور اسی پریشانی کے عالم میں گھر سے باہر نکلا۔ اس کا غلام جو اس کے بچے کی خدمت کرتا تھا۔ اس کے سامنے آیا اور وہ غلام ایرانی تھا لیکن بخت نصر کو اس کی خبر نہ تھی۔ پس بخت نصر نے اس کو تلوار دی اور حکم دیا کہ تیرے سامنے جو بھی آئے اس کو قتل کر دے خواہ میں ہی کیوں نہ ہوں۔ غلام نے تلوار لے کر اسی جگہ بخت نصر کو اسی تلوار سے ڈھیر کر دیا۔

جب بخت نصر بنی اسرائیل کو قتل کر چکا تو نبیؑ کی طرف پیغام بھیجا کہ تو اللہ کا نبیؑ ہے اگر چاہے تو میرے ہاں قیام کر دو

حضرت ارمیاء یا حضرت عزیرؑ کی موت

اور نہیں تو جہاں جاؤ۔ میری طرف سے کُلی اجازت۔ آپ نے وہاں سے روانگی کو پسند فرمایا۔ اس کے بعد قصہ وہی ہے جس کو قرآن مجید بیان فرما رہا ہے۔

قَالَ كَيْفَ كَيْفَتْ - حضرت ارمیا جب روانہ ہوئے تھے تو گدھے پر سوار تھے اور ان کے ساتھ زاد راہ انجیر و انگور اور شیرہ تھا۔ پس جب اس بستی سے ان کا گذر ہوا جس کو بخت نصر نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ کشتوں کے پُشتے لگے ہوئے تھے دل میں سوچا کہ خدا ان کو کیسے زندہ کرے گا۔ یعنی ان کی زندگی کی خواہش کی تاکہ اپنی آنکھوں سے قدرتِ خدا کو ملاحظہ کریں۔ پس خدا نے ان کو موت دے دی اور ایک سو سال تک وہ وہاں مر کر سوئے رہے۔

جب وہ پہلی دفعہ وہاں سوئے تھے تو دن چڑھا ہوا تھا اور جب سو برس کے بعد خدا نے ان کو دوبارہ زندہ کیا تو سورج مغرب کی طرف تھا۔ پہلے پہل ان کی آنکھوں میں روح پلٹائی گئی اور سوال کیا گیا کہ بتائیے تم یہاں کس قدر ٹھہرے رہے ہو؟ جواب دیا کہ ایک دن کا بل۔ پھر جب سورج کی طرف نگاہ کی تو فوراً کہا۔ بلکہ دن کا کچھ حصہ۔ پس ارشاد ہوا۔ نہیں بلکہ تم تو یہاں ایک سو سال ٹھہرے رہے ہو۔ اب اپنی یا اپنے گدھے کی ہڈیوں کو ملاحظہ کرو کہ ہم کس طرح ان کو آپس میں جمع کرتے ہیں اور پھر ان پر گوشت پہناتے ہیں تو اس کے بعد حضرت ارمیا دیکھتے رہے اور ان کے سامنے ان کے بقیہ بدن کی ہڈیاں جو خاکستر ہو گئی تھیں اکٹھی ہونی شروع ہو گئیں اور آپس میں ملتی گئیں جب سب اعضاء اپنے مقام پر آگئے تو اوپر گوشت پوست پھر مکمل ہو گیا اور خود بھی اٹھ بیٹھے اور ان کا گدھا بھی زندہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔

پھر ارشاد ہوا کہ فَانْظُرْ إِلَى طَعَامِكَ - یعنی اپنے زاد راہ کو ملاحظہ کرو جو کہ بہت جلد خواب ہو جانے والی چیزیں ہیں۔ لیکن بقدرتِ خدا ابھی تک مثل تازہ کے ہیں اور باسی نہیں ہوئیں۔ پس جب حضرت ارمیا نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ ملاحظہ کیا۔ کہنے لگے۔ بے شک مجھے یقین ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے (یہ واقعہ حضرت قائم آل محمدؑ کی طویل زندگی پر وارد ہونے والے تمام اعتراضوں کا جواب ہے جو خدا ایک بہت جلد خراب ہو جانے والے عام میوہ جات کو ایک عرصہ دراز تک تروتازہ رکھ سکتا ہے کیا وہ اپنے کسی خاص بندے کو ایک طویل عرصہ تک زندہ رکھنے پر قادر نہیں ہے شک وہ ہے اور اس نے اپنی مصلحت سے ایسا کیا ہے۔

یہ قصہ اگرچہ بعض روایات میں حضرت ارمیا کی طرف منسوب ہے لیکن زیادہ مشہور حضرت عزیرؑ کے متعلق ہے اور حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ جب حضرت اپنے گھر سے نکلے تھے تو ان کی زوجہ حاملہ تھی اور ان کی عمر اس وقت پچاس برس کی تھی۔ جب سو برس کے بعد دوبارہ زندہ ہوئے تو ان کی عمر وہی پچاس برس ہی تھی جب گھر تشریف لائے اور ان کا فرزند اس وقت سو برس کا تھا اور عمر میں حضرت عزیر سے پچاس برس بڑا تھا اور یہ اللہ کی آیات میں سے ہے کہتے ہیں کہ بخت نصر نے تورات کو جلا دیا تھا۔ پس جب حضرت عزیر واپس آئے تو انہوں نے تورات کو اذہم نو اپنے حفظ سے لکھ دیا۔ بنی اسرائیل اس بات پر باد رہیں کرتے تھے کہ یہ وہی تورات ہے یا اس میں کمی یا بیشی ہے تو ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ میرے دادا نے اپنے باغ میں تورات کا نسخہ دفن کر دیا تھا۔ مجھے وہاں سے چلو۔ تاکہ اسے وہاں سے نکال کر مقابلہ کر کے دیکھیں۔ جب تورات کا وہ نسخہ برآمد کر کے لائے اور اس کے ساتھ اس کا مقابلہ کر لیا گیا۔ تو ایک حرف تک

حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی۔ اور چار پرندوں کے پکڑنے اور ان کو قیمہ کر کے پہاڑوں پر تقسیم کرنے کا حکم ہوا۔
 وَخُذْ أَشْجَعًا مِّنَ الطَّيْرِ۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ وہ چاند پرندے۔ مور، مرغ، کبوتر
 اور کوا تھے۔ اور امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ وہ گدھ، مور، بطخ اور مرغ تھے۔ پس حضرت ابراہیمؑ نے
 وہ چار پرندے پکڑے ان کے گوشت کے ٹکڑے کئے ان کو آپس میں ملا کر قیمہ کر لیا اور دس پہاڑوں پر اس کا ایک
 ایک ٹکڑا رکھ دیا اور ہر ایک کی چوہچ اپنی انگلیوں میں محفوظ رکھی اور اس کے بعد باری باری سے ایک ایک کو بلایا پس
 بقدرت خدا ان کے اجزاء ہوا میں پرواز کرنے لگے اور ہر پرندہ کی جڑیں علیحدہ علیحدہ کیجا ہونے لگ گئیں اور جب
 ان کے جسم مکمل ہو گئے اور ان میں روح داخل ہو گئی تو دوڑ کر حضرت ابراہیمؑ کی طرف متوجہ ہوئے اور حضرت صادقؑ سے
 منقول ہے کہ حضرت ابراہیمؑ (بطور امتحان کے) ایک پرندہ کی چوہچ دوسرے پرندہ کے سامنے کرتے تھے تو وہ اس کو
 قبول نہ کرتا تھا۔ جب اس کی اپنی چوہچ سامنے کرتے تو وہ اس کو قبول کر لیتا تھا۔ پس اس طریقہ سے ان کے جسم مکمل
 ہو گئے۔ پس حضرت ابراہیمؑ نے ان کی چوہچوں کو چھوڑ دیا۔ تو وہ اڑ گئے اور اپنے کھانے پینے میں مصروف ہو گئے۔

چونکہ پہلے ارشاد فرمایا کہ خدا ایمان والوں کا ولی ہے اور ان کو ظلمات سے نور کی طرف لے جاتا ہے اس
 وجہ سے رابطہ کے بعد ایمان کی طرف لے جانے کے مدارج اور اسباب ہدایت کی تفصیل کو ان آیات میں واضح فرمایا
 کہ ہدایت و رشد کے تین طریقے ہیں۔

پہلا طریقہ۔ دلیل و برہان۔ جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے غرود کے مقابلہ میں اختیار فرمایا۔ پس صاحبان انصاف
 کے لئے حضرت ابراہیمؑ کا استدلال قبول ایمان کے لئے کافی تھا اور اس کے بعد جو یقین و اعتقاد پیدا ہو، اُسی کا نام ہے
 ایمان اور اس طریقہ سے حاصل ہونے والے یقین کو اہل معرفت علم الیقین کہتے ہیں۔

دوسرا طریقہ۔ شہادت عینی۔ جس طرح حضرت عزیر کو آنکھوں سے مشاہدہ کرایا گیا۔ اور اس درجہ کو اہل معرفت
 عین الیقین سے تعبیر کرتے ہیں۔

تیسرا طریقہ۔ علت و معلول پر ہر دو کی سیر یعنی اصل واقعہ کا مشاہدہ بھی ہو اور اس کی علت کی نشاندہی بھی
 ہو اور یہ ہدایت کا قوی ترین مرتبہ ہے جس کو حق الیقین کہا جاتا ہے۔

جس طرح کہ حضرت ابراہیمؑ کا پرندوں کو ذبح کر کے ان کے قیمہ کو پہاڑوں پر رکھ کر پھر پکارنا اور ان کا زندہ
 ہو کر ان کے پاس آنا۔

گویا حق کو مان لینے اور تسلیم کر لینے کے مراتب ہیں۔ پہلا مرتبہ تو ہے صرف کسی کے کہنے پر سر جھکا لینا اور
 صادر کر دینا اور یہ ہے انقیاد و اطاعت کی منزل کمال، نہ طلب دلیل ہو نہ طلب مشاہدہ اور نہ طلب ذوق ہو۔ گویا ادھر
 سے ارشاد ہوا اور ادھر سے گردن حاضر ہو یہ ہے حقیقی اسلام و تسلیم لیکن یہ تسلیم چونکہ صرف تقلید ہی تقلید ہوتی ہے لہذا اس میں ثبات

نہیں ہوتا۔ بلکہ ادنیٰ سے شکوک و شبہات سے اس کا زوال متوقع ہوا کرتا ہے اس لئے کہ اس کو دلیل و برہان سے تقویت حاصل نہیں ہوتی۔ لہذا اس سے بچنگی و دوام اور خلوص اتقان کی رُود سے بلند مرتبہ وہ ہے جو دلیل و برہان سے استوار ہو۔ اور اس کے بعد دوسرا درجہ ہے مقام تبلیغ میں تسکین قلب اور تہنیم غیر کے لئے طرق معرفت میں دلیل سے اقدام کرنا، تاکہ کسی کی تشکیک یا گمراہ کن شبہات اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ نہ پیدا کر سکیں۔ لہذا اب مقام ہے دلیل و برہان کا۔ جو علم الیقین اور ایمان راستہ کی اصل ہے۔

پھر تیسرا درجہ ہے مشاہدہ کا۔ جو ایقان قلب اور عین الیقین کا سبب ہے اور چوتھا درجہ ہے معلول و علت دونوں کا مشاہدہ۔ اور یہ اطمینان اور حق الیقین کا زینہ ہے۔ مثال کے طور پر کسی کے کہنے سے آگ کا وجود مان لینا ہے حسن یقین اور دھواں دیکھ کر تسلیم کرنا ہے علم الیقین اور آگ کا مشاہدہ کرنا ہے عین الیقین، اور اس کی گرنی سے متاثر ہو کر اس کا اعتراف کرنا ہے حق الیقین۔

فرد کے سامنے علم الیقین یعنی ایمان کا منظر تھا اور حضرت عزیر عین الیقین اور ایقان کی منزل تک پہنچے اور حضرت ابراہیم حق الیقین اور اطمینان کے درجہ کے طالب تھے جسے پایا۔ اور یہ عرفان کی آخری منزل ہے جس میں کوئی شک و شبہ مؤثر نہیں ہو سکتا۔

بحار الانوار ج ۱۵ باب الیقین والبصر میں بروایت کافی حضرت امام رضا علیہ السلام سے یونس نے ایمان و اسلام کا فرق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ ایمان بھی اسلام کو ہی کہتے ہیں لیکن یہ اس سے ایک درجہ بلند ہے اور تقویٰ ایمان سے ایک درجہ بلند ہے اور یقین تقویٰ سے ایک درجہ بلند ہے اور لوگوں میں یہ درجہ بہت کم تقسیم ہوا ہے یونس کہتا ہے میں نے عرض کی۔ یقین کیا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ اللہ پر توکل اور اس کیلئے تسلیم و رضا۔ الخبر یعنی جب انسان کو اللہ کی وحدانیت، علم، قدرت، حکمت، تقدیر، تدبیر اور رافت و رحمت پر یقین ہوگا تو لامحالہ اپنے تمام امور میں اس پر توکل و بھروسہ کرے گا۔ اسی ذیل میں علامہ مجلسی قدہ فرماتے ہیں کہ علم و ایمان کے مدارج و مراتب ہیں جس قدر علم میں زیادتی ہوگی اسی قدر ایمان میں بلندی ہوگی اور ایمان کا پہلا مرتبہ ہے تصدیق جس میں شکوک و شبہات کی کم و بیش ملاوٹ بھی ہوتی ہے چنانچہ ارشاد ہے وَكَانُوا مِنْ أَكْثَرِ هُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ۔ اور اسی درجہ کو اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے جس طرح فرماتا ہے قَالَتِ الْيَهُودُ آمَنَّا بِاللَّهِ كَمَا آمَنَ آبَاؤُنَا۔ الخ اور اس سے بلند مرتبہ ہے محبت کاملہ کا جس کو احسان سے بھی تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ شَعْرًا تَقْوًا وَآخْشَانًا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ۔ اور یہی یقین کا مرتبہ ہے اور پھر یقین کے تین درجے ہیں۔ علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین، اور حق الیقین اصل کی وہ آخری منزل ہے جس سے آگے بڑھنے کی گنجائش نہیں چنانچہ حضرت امیر المومنین فرماتے ہیں کہ اگر میرے سامنے سے پردے اٹھ جائیں تب بھی یقین میں اضافہ نہ ہوگا۔

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أُنْبَتَتْ سَبْعَ

مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں مثل اس دانے کے ہے جو اگائے سات خوشے کہ ہر خوشہ

سَبْعِينَ سَائِلًا فِي كُلِّ سَائِلَةٍ مِائَةِ حَبَّةٍ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝۲۹۱

میں ایک سو دانہ ہو اور خدا زیادہ کرتا ہے جس کے لئے چاہے اور خدا صاحب وسعت و علم ہے

رکوع نمبر ۴ خدا کی راہ میں خرچ کرنا

مَثَلُ الَّذِينَ - امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ مومن جو بھی نیکی کرے۔ خداوند کریم اس کو ہر نیکی کا بدلہ سات سو گنا جزا کر امت فرمائے گا اور آپ نے اسی آیت مجیدہ سے استشہاد فرمایا۔

منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام گھر سے تشریف لائے۔ جنین شریفین کو بے تاب دیکھا۔ جناب فاطمہؑ نے عرض کی کہ شہزادے بھوک سے ہیں اور تین روز کا اُن کو فاقہ ہے۔ پس آپ گھر سے باہر تشریف لائے اور عبداللہ بن عوف سے ایک دینار قرض طلب فرمایا۔ اس نے ایک تھیلی جس میں سو دینار تھے بطور صدقہ کے پیش کی۔ تو آپ نے فرمایا کہ میں نے جناب رسول خداؐ سے سنا ہے کہ دینے والا ہاتھ لینے والے سے بہتر ہے پس میں کسی کا احسانند نہیں ہونا چاہتا۔ مجھے قرض دے دیجئے کیونکہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ صدقہ کا ثواب ایک کا دس گنا ہے اور قرض کا ثواب اٹھارہ گنا ہے۔ پس ایک دینار قرض لے کر بازار کی طرف روانہ ہوئے۔ دیکھا کہ راستہ میں مقدار بیٹھے ہیں۔ آپ نے فرمایا مقدار! ایسی گری میں کیسے گھر سے نکلنا ہوا۔ مقدار نے عرض کی کہ چار روز سے فاقہ ہے لہذا مجبوراً گھر سے نکلا ہوں کہ شاید کچھ میسر آجائے تو آپ نے وہ دینار مقدار کو دیدیا اور فرمایا کہ تو ہم سے زیادہ مستحق ہے کیونکہ ہمارے گھر تین روز سے فاقہ ہے اور تجھے چوتھا روز ہے پس مسجد میں تشریف لائے تو یہ آیت اتری۔ وَيُؤْتِيكَ مِنْهُ خَيْرٌ مِّمَّا تُكْسِبُ حضرت علیؑ کو ایک تھیلی پیش کی اور غائب ہو گیا۔ حضرت علیؑ اس کو لے کر خدمت سرکار رسالت میں وارد ہوئے اور ماجرا سنایا۔ آپ نے تھیلی کو کھولا تو اس میں سات سو دینار تھے فرمایا۔ اے علیؑ کیا تو نے اس ناقہ سوار کو پہچانا تھا؟ وہ تو حضرت جبریلؑ تھے اور بحکم خدا آئے تھے اور یہ تھیلی اس ایک دینار کا عوض ہے جو آپ نے کل مقدار کے حوالہ کیا تھا اور آخرت میں خدا اس کا بدلہ اس سے بھی زیادہ عطا فرمائے گا۔ پس حضرت علیؑ نے فرمایا کہ بے شک فرمان خدا درست و صحیح ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ اُن کی جزا مثل اس ایک دانے کے ہے جس سے سات سو دانہ پیدا ہو۔ اس کے بعد آپ نے ایک دینار قرض خواہ کو واپس دیا اور باقی اہلبیت اور فستاد پر تقسیم فرمایا۔

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا

وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں پھر اُس کے پیچھے احسان بھی نہیں جتلاتے اور

مَنْ أَوْ لَا أَذَىٰ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا

نہ اذیت دیتے ہیں تو ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور نہ ان پر خوف ہوگا اور نہ وہ

هُمْ يُحْزَنُونَ ۝ قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذَىٰ ط

غمگین ہوں گے نیک بات اور درگزر بہتر ہے اس صدقہ سے جس کے بعد اذیت ہو۔

مَنْ أَوْ لَا أَذَىٰ - مجمع البیان میں جناب رسالتاًؐ سے مروی ہے کہ جو شخص کسی پر احسان کر کے پھر جتلائے تو خدا بردارِ عشر اس کو اپنے کلام و نظر رحمت سے محروم کرے گا اور نہ ہی اس کا عمل پاکیزہ ہوگا (تاکہ قابلِ جزا ہو) اور اس کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ سائل کو اذیت دینے کا مطلب یہ ہے کہ ترش روئی سے اس کے پیش آئے یا جھڑک کر اس کو کچھ دے یا احسان کرنے کے بعد اس سے اپنے کام کاج کروائے تو اس قسم کی چیزیں احسان کی جزاء کو باطل کر دیتی ہیں۔

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ - اگر کوئی سائل کچھ سوال کرے اور اس کو کچھ دینا نہ چاہے تو بجائے سخت کلامی کے اس کو دعاۓ خیر کرے۔ مثلاً کہے کہ خدا تجھے رزق وافر عطا فرمائے۔

وَمَغْفِرَةٌ - اگر سائل سخت لہجہ میں سوال کرے یا خدا و رسول و ائمہ کی قسمیں دینے لگ جائے یا بے وقت اور بجا سوال کرے جس سے دل کو تکلیف پہنچے۔ تو ایسے حالات میں اس سے درگزر کرنا اور اس سے چشم پوشی کرنا بہتر ہے۔ بہر کیف اس کو نیک بات کہہ کر ٹال دینا۔ یا اس کی بے جا ولیچڑ باتوں سے درگزر کرنا اُس دینے سے بہتر ہے جو ترش روئی سے جھڑک کر دیا جائے یا اس کو کوئی اور قولی یا فعلی تکلیف دی جائے۔

تفسیر عمدة السببان میں ہے کہ حضرت امیر علیہ السلام نے ایک دفعہ حضرت سے فرمایا کہ کوئی کلمہ حکمت سنائیے تو حضرت نے کہا۔ غنی اور مالدار لوگوں کی فقراء لوگوں پر شفقت و مہربانی اگر حصولِ ثواب کے لئے ہو تو کیا خوب ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس سے بہتر چیز سنائیے۔ انہوں نے کہا۔ اس سے بہتر اور نہیں ہے تو آپ نے فرمایا کہ اس سے بہتر ہے غنی اور مالدار لوگوں کے سامنے فقراء کی خود داری جو خدا پر توکل کر کے کسی اور کے زیر بار احسان ہونا پسند نہ کریں۔

اس مقام پر صرف صدقہ خیرات کرنے کا ذکر ہے یہ تصریح نہیں کہ واجب ہو یا غیر واجب۔ اور راہِ خدا میں خرچ کرنے کی مدت بھی متحدہ ہیں۔ فقراء و مساکین کی اعانت، تعمیر مساجد، عزا داری حضرت سید الشہداء اور ترویجِ علوم آلِ محمد وغیرہ ان سب پر خرچ کرنا اللہ کی راہ میں خرچ ہے لیکن اس میں سے بعض کو بعض پر فوقیت حاصل ہے اور بطابقِ مضمون احادیث

وَاللّٰهُ غَفِيْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۶۲﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقَتِكُمْ بِالْمَنِّ

اور اللہ غنی اور صاحبِ حوصلہ ہے اے ایمان والو! نہ باطل کر اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور اذیت

وَالْاٰذٰى كَالَّذِيْ يُفْتِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ

دے کر مثل اس کے جو خرچ کرتا ہے مال اپنا لوگوں کے دکھانے کے لئے حالانکہ نہ اللہ پر اس کا ایمان ہے اور نہ قیامت پر

فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهُ وَاَيْلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ۚ لَا

پس اس کی مثال اُس صاف پتھر کی سی ہے جس پر گرد پڑی ہو۔ پس اس پر زرد کی بارش آئے اور اس کو صاف کر دے۔ وہ

يَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ ﴿۱۶۳﴾

لوگ کچھ بھی نہ وصول کریں گے اپنے کئے کا بدلہ اور خدا نہیں ہدایت فرماتا ہے کافر لوگوں کو

تردیح علوم آلِ محمد کے لئے مدارس و مکتبہ پر خرچ کرنا سب سے افضل ہے کیونکہ علم تمام نیکیوں کی اصل ہے اور اسی لئے کہا گیا ہے کہ عالم یا مستظم کی امداد کرنا، خواہ معمولی ہو، تعمیرِ کعبہ کا ثواب رکھتی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جناب رسول خداؐ نے فرمایا کہ جو شخص مومن پر احسان کرے اور پھر اس کو کلام کے ساتھ اذیت دے یا اس پر اپنا احسان جتلائے تو گویا اس نے اپنی خیرات کو باطل کر دیا۔ جیسا کہ آیت مجیدہ میں خداوند کریم ارشاد فرما رہا ہے کہ احسان جتلانے اور اذیت دینے سے اپنے صدقات کو باطل نہ کرو۔ اور اس قسم کا صدقہ اس طرح باطل ہے جس طرح ریاکاری کی خیرات باطل ہے اور پھر مزید وضاحت کے لئے اس کی مثال بیان فرمائی ہے کہ جس طرح پتھر پر پڑی ہوئی گرد بارش پڑنے سے بالکل دہل جاتی ہے اور پتھر بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح صدقہ احسان جتلانے یا اذیت دینے کے بعد بالکل ضائع اور برباد ہو جاتا ہے۔

(بحار ص ۱۵) جناب رسالتِ اکرمؐ نے فرمایا کہ ہر روز عشرِ پہلے پہل تین قسم کے لوگوں کو حاضر کیا جائے گا، قاری قرآن (۱)، مجاہد (۲)، والد (۳)۔ قاری سے سوال ہوگا کہ تو نے علم قرآن حاصل کرنے کے باوجود کیا عمل کیا وہ جواب دیگا کہ میں نے شب روز عبادت کی پس ارشاد ہوگا کہ غلط کہتا ہے بلکہ تو نے صرف لوگوں کے دکھانے کی خاطر ہی سب کچھ کیا تھا۔ والد سے سوال ہوگا کہ تو نے میرے عطا کردہ مال سے کیا عمل کیا تھا وہ جواب دیگا کہ میں نے فلاں صلہ رحمی کی۔ فلاں صدقہ دیا تو جواب ملے گا کہ غلط کہتا ہے بلکہ تو نے تو یہ سب کچھ اس لئے کیا تھا کہ لوگ تجھے سخی کہیں۔ پھر مجاہد سے سوال ہوگا تو وہ کہے گا کہ میں نے تیری راہ میں جہاد کیا تھا۔ پس جواب ملے گا کہ یہ تو نے شہرت حاصل کرنے کے لئے کیا تھا پس ان کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ خداوند کریم جملہ مومنین کو اس مرضی سے بچائے

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيٓتًا

اور مثال ان کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو واسطے حاصل کرنے خوشنودی خدا کے اور ساتھ قوت ایمانی

مِّنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَاتَتْهُ أَكْثَرُ

کے۔ مثل اس باغ کے ہے جو بلندی پر ہو اور اس پر زور کا مینہ پڑے پس وہ اپنی آمدنی دگنی دے

ضِعْفَيْنِ فَإِنْ لَّمْ يُصِْبْهَا وَابِلٌ فَطُلٌّ ۖ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٦٥﴾

پس اگر نہ بھی پڑے اس پر زور کا مینہ تو معمولی بارش (شبنم) اور اللہ تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے

أَيُّوْذُ أَحَدِكُمْ أَنْ تَكُوْنَ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي

کیا تم میں سے کوئی چاہتا ہے کہ ہو اس کا ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا کہ جاری ہوں

مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۖ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ

اس کے نیچے نہریں۔ جس میں اس کے لئے ہر قسم کے پھل ہوں اور اس پر بڑھاپا آجائے

وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضِعْفًا ۖ فَأَصَابَهَا أَعْصَارُ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۖ

اور اس کے بچے (چھوٹے) کمزور ہوں پس اس باغ پر ایک بگڑا ایسا آئے جس میں آگ ہو پس وہ جل جائے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ الْآٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢٦٦﴾

اسی طرح بیان فرماتا ہے خدا تمہارے لئے آیات کو تاکہ تم فکر کرو (سوچو)

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ ۖ أَمْوَالَهُمْ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيٓتًا

اور نہ اذیت دیتے ہیں ان کی مثال اس باغ جیسی ہے جو بلندی پر ہو اور بارش کی وجہ سے اس کی آمدنی دگنی ہو جائے

(یعنی ان کا اجر دوگنا ہو جاتا ہے) اور اگر بارش نہ آئے تو معمولی بوند باندی یا شبنم بھی اس کے لئے فائدہ مند ہو ا کرتی ہے۔ بہر صورت

وہ نقصان میں نہیں رہتے امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ اس سے پہلی آیت بنی امیہ کے حق میں اتری۔ اور

دوسری آیت کے مصداق حضرت امیر المومنین علیہ السلام ہیں۔

أَيُّوْذُ أَحَدِكُمْ ۖ يَرِيْبًا كَارِي سَخِرَ مِنْهُ خَلْقُ النَّاسِ وَتَكُوْنَ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي

جس میں ہر قسم کے میوہ جات کے درخت ہوں اور بڑھاپا بھی ہو اور بچے بھی چھوٹے ہوں اور جب اس کا باغ تیار ہو جائے

تو ایک گرم ہوا اگر اس کے سب بانغ کو جلا دے تو اس وقت جس طرح اس بوڑھے کو حسرت ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کیونکہ عمر گزر چکی ہے جوانی واپس نہیں آتی تاکہ دوبارہ محنت کر کے بچوں کے مستقبل کے لئے کوئی انتظام کر سکے۔ اسی طرح ریاکاری سے خرچ کرنے والا میدانِ محشر میں جبکہ اس کو کمائی اپنی کی بہت زیادہ ضرورت ہوگی۔ کیونکہ اب نہ دنیا میں واپس آسکتا ہے اور نہ عمل صالح کرنے کا موقع مل سکتا ہے اور جو کچھ اس نے کیا تھا اس کو ریاکاری نے اسی طرح جلا کر نیست و نابود کر دیا تھا جس طرح کہ گرم ٹو بانغ کو تباہ کر دیتی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ جو صدقہ و خیرات احسان جتلانے کے لئے یا اذیت کے لئے یا ریاکاری کے طور پر کیا جائے وہ بالکل برباد و رائیگاں جاتا ہے۔

چنانچہ عمدۃ السببان میں حضرت امیر علیہ السلام سے منقول ہے کہ جو امر دی چار چیزوں میں سے ہے۔

(۱) غنی ہوتے ہوئے تواضع کرنا (۲) باوجود قدرت کے انتقام نہ لینا (۳) باوجود دشمنی کے خیر خواہی کرنا (۴) احسان جتلانے بغیر کسی کو کچھ دینا۔

نیز آپ سے منقول ہے: سخی لوگ دنیا و عقبی کے سردار ہیں۔ نیز فرمایا: تعجب ان لوگوں پر ہے جو غلام خرید کر کے آزاد کرتے ہیں۔ بھلا وہ احسان کر کے آزادوں کو اپنا دائمی غلام کیوں نہیں بنا لیتے۔ جناب رسول خدا سے مروی ہے کہ بہشت سخیوں کے لئے ہے۔

پس انسان کو چاہیے کہ خوشنودی خدا کے لئے ہی نفع، مومنین کی اپنے مالِ حلال سے اعانت کرے کیونکہ بعض احادیث میں ان کو اللہ کی عیال سے تعبیر کیا گیا ہے اور صدقہ کرنا بہت سے مصائب کو دفع کرتا ہے اگر سفر میں صدقہ کیا جائے تو وہ سفر کی مصیبتوں سے نجات دلانے کا موجب ہو جایا کرتا ہے اور سفر سے پہلے صدقہ و خیرات کر کے گھر سے روانگی ایام کی نحوست کو برطرف کر دیا کرتی ہے۔

تنبیہ :- انسان نے آخر مر جانا ہے اور اس دنیا کے مال میں سے انسان کا حصہ صرف وہی ہے جو کچھ اس نے کھا یا پیا۔ اور راہِ خدا میں خرچ کیا۔ ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ کے پاس ایک مہمان وارد ہوا۔ تو آپ نے فرمایا کہ میں کچھ مشغول ہوں۔ میرے اونٹوں میں سے ایک اچھا اونٹ تلاش کر لائیے پس وہ ایک کمزور اونٹ لائے حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ تم نے خیانت سے کام لیا ہے یعنی عمدہ اونٹ کیوں نہیں لائے تو جواب دے دیا گیا کہ عمدہ اونٹ موجود تھا۔ لیکن آپ کی اشد ضرورت کے وقت وہ کام آئے گا۔ آپ نے فرمایا کہ میرا سخت ترین وقت قبر سے زیادہ اور کون سا ہوگا اور کون کتنا لائق الیہ السلام کی تلاوت فرمائی اور فرمایا کہ وہ اونٹ میرا محبوب ترین مال ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اُسے اپنے کام میں لاؤں۔ نیز آپ نے فرمایا کہ مال میں تین شریک ہیں (۱) تقدیر جو موت و ہلاکت سے اچھے یا بُرے مال کو لے جائے گی۔ (۲) وارث جو موت کے منتظر ہیں، مالک مر گیا تو وہ لے جائیں گے اور تیسرا خود مالک۔ پس اُسے باقیوں سے سُست

نہیں ہونا چاہیے اور پھر وہی آیت تلاوت فرمائی۔ کُنْ تَسَالُوْا الْبَرَآءِ (مجمع السببان)

تو خوش نصیب ہے وہ مالک مال جو اپنے اختیار سے اپنے مال سے خود فائدہ اٹھائے۔

بعض اوقات جب انسان کے پاس مال ہوتا ہے تو راہِ خدا میں خرچ کرنے سے اس لئے گریز کرتا ہے کہ کہیں فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہو جائے چنانچہ اگلے رکوع میں خدا اسی خیال کی نشان دہی فرما رہا ہے کہ یہ دوسرے انسان کو شیطان کی طرف سے آیا کرتا ہے۔ کیونکہ جب انسان زکوٰۃ یا خمس یا کوئی اور خیرات کرنا چاہے تو چپکے سے شیطان یہ سبق پڑھاتا ہے کہ خبردار! یہ خرچ نہ کر ورنہ تیرا اس قدر مال بے فائدہ ضائع ہو جائے گا۔ تیرے بال بچے بھوکے رہیں گے۔

چنانچہ ارشاد قدرت ہے: الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفُقْرَۃَ۔ یعنی شیطان ہی یہ باتیں دل میں ڈالتا ہے حالانکہ خدا بخشش اور زیادتی مال کا وعدہ کر چکا ہے اور یہ انسان کی کمال بدبختی کی نشانی ہے کہ شیطان دوسرے میں پھنس کر خدا کے وعدہ کو نظر انداز کر دے۔ ہم نے کتنی ایسے انسان دیکھے ہیں جو زکوٰۃ و خمس وغیرہ کے پابند ہیں اور جس قدر راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں خدا ان کو اس سے کہیں زیادہ رزق عطا فرماتا ہے اور بہت سے ایسے بھی دیکھے ہیں جو اپنے مال سے حقوق واجبہ کی ادائیگی نہیں کرتے اور دن بدن بدعالی کی طرف ان کے قدم بڑھتے ہیں

حلال کھانے والے اور حقوق مالیہ کے ادا کرنے والے بالعموم آفاتِ سماویہ و ارضیہ سے اللہ کی امان میں ہوتے ہیں اور حرام کھانے والے اور حقوق کے ادا کرنے سے جی چرلنے والے آفاتِ ارضیہ و سماویہ میں گرفتار ہوتے ہیں۔ ہاں اگر بعض اوقات ایسے لوگوں میں کوئی عذابِ خدا نہ بھی آئے تو اس کو اللہ کی رضامندی پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ خدا اس کے وبال و عذاب کو آخرت پر ملتوی کر دیتا ہے جیسا کہ نمرود و شداد و فرعون و ہامان وغیرہ کی مثالوں سے خدا نے قرآن مجید میں تصریح فرمادی ہے پس انسان پر لازم ہے کہ اپنے مال سے اپنی دنیا و عقبی کی فلاح و مہبود کا انتظام کرے۔

راہِ خدا میں مال حلال کے خرچ کرنے والے کا بھروسہ خدا پر ہوتا ہے لہذا اس کی زندگی اطمینان سے گزرتی ہے لیکن بخل کرنے والا اور اپنے حقوق واجبہ کی ادائیگی سے گریز کرنے والا چونکہ اللہ پر بھروسہ نہیں کرتا لہذا کبھی اس کو چین نصیب نہیں ہوتا۔

نیز سخی عقبی کی فلاح کے علاوہ دنیا میں نیک نام زندگی بسر کرتا ہے اور مرنے کے بعد بھی اپنا ذکرِ خیر چھوڑ جاتا ہے اور بخیل آخرت کا عذاب خریدنے کے علاوہ دنیا میں بھی بدنام ہوتا ہے اور مرنے کے بعد بھی مستحق لعن و طعن رہتا ہے اسی طرح راہِ خدا میں خرچ کرنے کا عادی قناعت کی دولت سے فیض یاب ہو کر اللہ کی عطا کردہ نعمت پر راضی رہتا ہے یکنی بخیل کے حرص میں اضافہ اور اس کی ہائے ہائے میں روز افزوں ترقی ہوتی ہے خواہ خزان کا مالک ہی کیوں نہ ہو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا

اے ایمان والو! (راہِ خدا میں) خرچ کرو اپنے پاکیزہ کسب سے اور اُن چیزوں سے جو پیدا کیں ہم نے

لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ

تمہارے لئے زمین سے اور نہ قصد کرو بُرے مال کا۔ کہ اس سے خرچ کرو حالانکہ تم خود ایسی چیز

بِأَخْذِهِ إِلَّا أَنْ تُغْنُوا فِيهِ ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَسِيدٌ ﴿٢١٤﴾

کا ایسا پسند نہیں کرتے مگر بصورتِ چشم پوشی اور سب ان تحقیق اللہ غنی (اور) لائقِ حمد ہے

الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ ۗ وَاللَّهُ يَعِدُكُمْ

شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے اور حکم دیتا ہے تم کو بُرائی کا اور خدا تم سے وعدہ

مَغْفِرَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢١٥﴾

لا
صلہ

بخشش و زیادتی کرتا ہے اور اللہ واسع و وسعت و علم ہے

رکوع نمبر ۵

طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ مفسرین نے پاکیزہ کسب سے مراد تجارت لیا ہے کیونکہ جناب رسول خدا سے مروی ہے۔

رزق کے دس حصوں میں سے نو حصے تجارت میں ہیں اور ایک حصہ باقی کسبوں میں ہے اور آپ سے پاکیزہ رزق کے متعلق

دریافت کیا گیا تو فرمایا۔ اس سے مراد ہے انسان کا اپنے ہاتھ سے کمانا اور نیکی سے خرید و فروخت کرنا اس مقام پر

اپنی حلال کمائی اور زمین کی پیداوار سے راہِ خدا میں خرچ کرنے کا حکم ہے لیکن فرماتا ہے کہ جو چیز دو اچھی دو۔

وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ کا مقصد یہ ہے کہ اپنے مال سے ردی اور نکستی چیز کو راہِ خدا میں نہ دو۔ چنانچہ متعدد احادیث میں

وارد ہے کہ بعض لوگ جناب رسول خدا کے زمانہ میں بھی جب کھجوروں کی زکوٰۃ (صدقہ) ادا کرتے تھے تو اچھی کھجور رکھ لیتے

تھے اور ردی کھجور صدقہ میں پیش کرتے تھے جس کی گھٹلی موٹی اور اوپر معمولی سا چھلکا ہوا کرتا تھا۔ پس یہ آیت نازل ہوئی کہ ایسا

نہ کیا کریں اور فرماتا ہے کہ ایسی چیزیں راہِ خدا میں نہ دو کہ اگر وہ تم کو لینی پڑ جائیں تو تم ان کو لینے سے گریز کرتے ہو اور

بادلِ خواستہ قبول کرنے پر آمادہ ہوتے ہو۔

تفسیر بہان میں مروی ہے کہ ابراہیم ختم کا اندر ایک عورت سے ہوا کہ اپنے گھر کے دروازہ پر بیٹھ کر صبح سویرے

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ

دیتا ہے حکمت جسے چاہے اور جو بھی حکمت دیا جائے پس اس کو گویا

خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذْكُرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ۝

خیر کثیر دی گئی۔ اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر صاحبانِ عقل و دانش

چرخہ کات رہی تھی اور نام اس کام بکر تھا۔ یہ کہنے لگا۔ اے ام بکر تو تو بڑھی ہے اب بھی چرخہ کاتنے سے باز نہیں آتی۔ وہ کہنے لگی کہ میں اس کام کو کیسے چھوڑ دوں حالانکہ میں امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے اپنے کانوں سن چکی ہوں کہ چرخہ کاتنا پاکیزہ رزق ہے۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ۔ روایات امامیہ میں اہلبیت طاہرین سے حکمت کی تفسیر اطاعتِ خدا، معرفتِ امام اور گناہوں سے اجتناب کی گئی ہے اسی طرح خیر کثیر سے مراد بھی معرفتِ ولایت ائمہ طاہرین علیہم السلام لی گئی ہے (دربار) مجمع البیان میں ابن عباس و ابن مسعود سے مروی ہے کہ حکمت قرآن سے مراد ہے علم قرآن یعنی ناسخ منسوخ حکم، متشابہ، مقدم، مؤخر، حلال، حرام اور امثال وغیرہ کا علم۔ بعض نے کہا ہے کہ حکمت کا مطلب ہے گذار و کردار کی صحت۔ اسی طرح علم دین، نبوت، معرفتِ فہم، خوفِ خدا، اور قرآن و فقہ، مفسرین نے حکمت سے مراد لئے ہیں۔ جناب رسالتاً سے مروی ہے کہ خدا نے مجھے قرآن و حکمت عطا فرمائی ہے اور جس گھر میں حکمت نہیں وہ گھر برباد ہے اللہ سے ڈرو، فقہ حاصل کرو اور علم سیکھو تاکہ جاہل ہو کر نہ مرو۔

اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ حکمت کا معنی ہے معرفت اور عین میں فقہ حاصل کرنا پس جس نے فقہ حاصل کر لی وہ صاحب حکمت ہے اور کسی مومن کی موت ابلیس کو ایک فقیہ کی موت سے محبوب تر نہیں ہے اور جناب رسالتاً سے مروی ہے کہ خدا نے اپنے بندوں پر جو نعمات تقسیم فرمائی ہیں ان میں عقل و علم سے بہتر اور کوئی نعمت نہیں ہے کیونکہ عاقل (عالم) کی نیند جاہل کی شب بیداری سے افضل ہے۔ عاقل (عالم) کا گھر رہنا، جاہل کے سفر سے بہتر ہے، اور خدا نے کسی نبی و رسول کو معجوت نہیں فرمایا۔ جب تک کہ اس کو عقل و علم میں کامل نہیں کیا۔ اور نبی کا عقل و علم تمام امت کے عقل و علوم سے افضل ہوتا ہے اور انبیاء کی پوشیدہ باتیں کو شمش کر نے والوں کی ظاہری کوششوں سے بہتر ہوا کرتی ہے اور کسی انسان کا فریضہ کو ادا کرنا درست نہیں انجام پاتا۔ جب تک اس کو اس کا علم نہ ہو اور تمام عبادت گزار مل کر بھی عبادت کا وہ مرتبہ حاصل نہیں کر سکتے جو ایک عالم کو عطا ہوتا ہے اور انہی کو خدا نے اُولُو الْأَلْبَابِ کہا ہے اور حضرت صادق سے منقول ہے کہ حکمت، معرفت کا نور، تقویٰ کی میراث، سچائی کا پھل ہے اگر میں کہوں کہ نعمتِ خداوندی میں سے کوئی نعمت نعمتِ حکمت سے زیادہ قیمتی اور بلند تر نہیں ہے تو بجا ہوگا۔

وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ

اور جو بھی تم خرچ کر دو کوئی خرچ یا جو بھی تم نذر مانو کوئی نذر۔ پس تحقیق اللہ۔ اس کو جانتا ہے۔

وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنَ الْنَصَارِ ۚ إِنَّ تَبْدُ وَالصَّدَقَاتِ فَنِعْمًا هِيَ ۚ وَ

اور ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا اگر تم ظاہر بظاہر دو صدقے تو خوب ہے اور

إِنْ تَخْفَوْهَا وَتُوْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ

اگر خفیہ طور پر دیدو فقراء کو تو وہ بہتر ہے تمہارے لئے اور وہ کفارہ ہوگا تم سے تمہاری

سَيِّئَاتِكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۚ ۚ لَيْسَ عَلَيْكُمْ هُدًى وَلَكِنْ

برائیوں کا۔ اور اللہ تمہارے اعمال سے آگاہ ہے نہیں ہے تیرے اُپر واجب ان کا راہ ہدایت پر لانا

اللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا نُنْفِسُكُمْ وَمَا تَنْفِقُونَ

اللہ راہ ہدایت پر لاتا ہے جسے چاہے اور جو کچھ تم خرچ کرو کار خیر میں وہ تمہارے اپنے لئے ہی ہے اور تم نہیں خرچ کرتے

إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُؤْتِ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ۚ

مگر واسطے طلبِ رضا کے خدا کے اور جو بھی تم خرچ کرو کار خیر میں (اس کا بدلہ) پورا دیا جائیگا تمہیں اور تم کو کوئی خسارہ نہ دیا جائے گا۔

وَمَا أَنْفَقْتُمْ۔ یعنی انسان جو بھی خیرات کرے خواہ صدقہ واجبہ ہو یا مستحبہ اور جو بھی نذر کرے۔ خدا سب کو جانتا ہے اور اس کے بعد فرماتا ہے کہ ظالمین کا مددگار کوئی نہ ہوگا۔ مقصد یہ ہے۔ اگر صدقہ و نذر میں ظلم کرے گا۔ مثلاً صدقہ ریاکاری کے لئے کرے یا مال حرام سے کرے یا کسی اور غرضِ باطل کے پیشِ نظر کرے اور اسی طرح نذر اور منتِ خدا کی نافرمانی میں کرے اور کسی ناجائز کام کیلئے کرے یا نذر غیر طریقی شرعی سے کرے تو خدا اس کی سزا دے گا اور اس کا کوئی ناصر و مددگار نہ ہوگا پس اگر نیت نیک سے نیک کام کرے تو مستحقِ جزا۔۔۔ ورنہ مستحقِ سزا ہوگا۔

إِنْ تَبْدُ وَالصَّدَقَاتِ۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ ظاہر بظاہر جن صدقات کا دینا بہتر ہے اس سے مراد صدقاتِ مستحبہ ہیں اور اسی مضمون کی امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی متعدد روایات منقول ہیں اور تفسیر مجمع البیان میں خفیہ طور پر اور چھپا کر صدقہ دینے کے متعلق منقول ہے کہ چھپا کر صدقہ دینا اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے اور گناہوں کو اس طرح بجھاتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھاتا ہے اور ستر قسم کی مصیبتوں کو دُور کرتا ہے اور نیز معصوم نے فرمایا کہ سات قسم کے

آدمیوں کو خدا بروز محشر اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے گا جس دن اس کے سوا اور کوئی سایہ کا مقام نہ ہو گا ۱۱، امام عادل ۱۲، جو ان عبادت گزار ۱۳، مساجد سے محبت رکھنے والا ۱۴، وہ دو شخص جو خوشنودٹی خدا کے لئے ایک دوسرے سے محبت کریں اور اسی بنا پر ان کی باہمی نشست و برخاست ہو ۱۵، وہ مرد جس کو حسن و جمال والی عورت بدکاری کی دعوت دے اور وہ خوف خدا کو ملحوظ رکھ کر اس کو ٹھکرا دے ۱۶، وہ شخص جو خفیہ طور پر اور چھپا کر صدقہ دے حتیٰ کہ اس کے بائیں ہاتھ کے فعل کی دائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو (مقصود یہ ہے کہ اس کے قریب ترین رشتہ دار اور دوست بھی مطلع نہ ہو سکیں ۱۷، وہ شخص جو عالم تنہائی میں خدا کو یاد کر کے روئے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلیں۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هَذَا عَهْدٌ - مقصد یہ ہے کہ صدقات کے ادا کرنے کا طریقہ آپ ان کو بیان فرمادیں۔ اس کے بعد وہ عمل کریں یا نہ کریں۔ اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں۔ آپ کا کام ہے صرف راہ دکھا دینا۔ ان کو مجبور کر کے راہ راست پر لانا آپ کا فریضہ نہیں ہے۔

وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا - یعنی اے مومنو! تمہاری تو شان ہی یہی ہے کہ صرف خوشنودٹی خدا کے پیش نظر تم خرچ کرنے والے بنو اور تمہاری شان سے بعید ہے کہ ریاکاری یا احسان جتلانے یا اذیت دینے کے لئے تم خرچ کرو اور ممکن ہے جملہ خبر اور معنی انشاء میں ہو۔

بحار الانوار ج ۱۵ باب السخاء جیل بن وراج نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تمہارے اچھے وہ ہیں جو سخی ہوں اور تمہارے بُرے وہ ہیں جو بخیل ہوں۔ برادران ایمانی سے حسن سلوک اور ان کی حاجت برآری غل صلیح ہے اور شیطان کی ذلت و دوزخ سے ڈری اور بہشت میں داخلے کا وسیلہ ہے پس یہ حدیث اپنے برگزیدہ صحابیوں تک پہنچا دینا جیل نے عرض کی! حضور! پسندیدہ و برگزیدہ صحابی کون ہے؟ تو فرمایا کہ جو برادران ایمانی کے ساتھ تنگی و خوشحالی میں احسان سے پیش آئیں۔ آپ نے فرمایا جو شخص اپنے مال سے حق واجب نکال کر مستحقین تک پہنچا دے وہ سخی ہے اور جو حقوق واجبہ ادا نہ کرے وہ بخیل ہے۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ نیکی کے راستے تین ہیں۔ سخاوت، خوش گفتاری اور صبر جناب رسالتاؐ نے عدی بن حاتم طائی سے فرمایا کہ تیرے باپ کو سخاوت نے عذاب شدید پہنچا لیا ہے نیز آپ نے چند واجب القتل لوگوں کے قتل کا حکم صادر فرمایا اور ان میں سے ایک کو مستثنیٰ قرار دیدیا تو اس شخص نے اپنے قتل نہ کئے جانے کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ مجھے بذریعہ وحی اطلاع ملی ہے کہ تو سخی ہے لہذا تجھ سے قتل کی سزا مرفوع ہے پس فوراً اس نے کلمہ شہادتین جاری کیا اور مسلمان ہو گیا۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ سخاوت نے اس کو جنت تک پہنچا دیا۔

مردی ہے کہ سخی نو جوان جو اپنے گناہوں کا معترف ہو۔ اس سن رسیدہ عابد سے اللہ کو محبوب تر ہے جو بخیل ہو جناب رسالتاؐ نے فرمایا کہ لوگ چار قسموں پر ہیں۔ سخی، کریم، بخیل اور لئیم ۱۸، سخی وہ ہے جو خود بھی کھائے اور دوسروں کو بھی کھلائے ۱۹، کریم وہ ہے جو دوسروں کو اپنے نفس پر ترجیح دے یعنی خود نہ کھائے اور دوسروں کو کھلائے ۲۰، بخیل وہ ہے جو خود

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي

(یہ صدقات) ان فترات کے لئے ہیں جو بند ہو گئے ہوں اللہ کے راستہ میں جو نہ طاقت رکھتے ہوں کسی طرف

الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ

جاننے کی زمین میں۔ جاہل سمجھتے ہوں کہ وہ غنی ہیں۔ بوجہ ترک سوال کے۔ تم ان کو پہچانو گے ان کی علامتوں سے

لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿۲۶۳﴾

وہ نہیں سوال کرتے لوگوں سے گڑگڑاتے ہوئے اور جو بھی خرچ کرو۔ کار خیر میں تحقیق اللہ اس کے جاننے والا ہے۔

کھائے اور دوسروں کو کچھ نہ دے (۲۶۳) لیم وہ ہے جو نہ خود کھائے اور نہ دوسروں کو کھانے دے۔

لِلْفُقَرَاءِ۔ اس سے پہلی آیات میں صدقات کی ترغیب و ثواب اور دینے کا طریقہ وغیرہ بیان فرمایا۔ اس آیت مجیدہ میں صدقہ کے مصرف کا ذکر ہے کہ تمہارے صدقات ایسے فقراء کو ملنے چاہئیں۔ جو راہ خدا میں بند ہوں۔ یعنی عبادت خدا یا تحصیل علوم دینیہ یا اسی قسم کے اور مشاغل شرعیہ میں وہ اس قدر مصروف ہوں کہ نہ تجارت کر سکیں۔ اور نہ کسی دوسرے طریقہ سے کسب معاش کر سکیں اور سوال کرنا بھی پسند نہ کرتے ہوں۔ جاہل لوگ ان کے سوال نہ کرنے سے ان کو غنی سمجھیں حالانکہ ان کے چہروں اور جہانی کمزوری کی علامتوں سے خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ یہ لوگ مستحق ہیں۔

دورِ حاضر میں یہ صفت صرف دینی مدارس کے دینی طلبہ میں ہی پائی جاتی ہے جو موجودہ لادینیّت کی بڑھتی ہوئی رفتار کی زد سے بچ کر اور لامذہبیت کی عام زد سے علیحدہ ہو کر علم دین کی تحصیل میں شب و روز مصروف ہیں۔ نہ تو ان کے پاس خود کمانے کا وقت ہوتا ہے اور نہ دیگر مسلمانوں کے مدارس کے طلبہ کی طرح بھیک مانگ کر غیرت کشی کو پسند کرتے ہیں۔ لہذا ان پر صدقات وغیرہ کا خرچ کرنا سب سے بہتر اور افضل ہے۔

حدیث میں ہے کہ خدا اپنے بندے پر اپنی نعمت کا اثر دیکھنا پسند فرماتا ہے اور بد حالی کے اظہار کو ناپسند فرماتا ہے اور اپنے بندوں سے حلیم خود دار کو محبوب رکھتا ہے اور سائل بے حیا کو مبغوض رکھتا ہے۔ نیز فرمایا کہ خدا تین چیزوں کو ناپسند کرتا ہے (۱) قیل و قال (۲) کثرت سوال (۳) تفسیح مال۔ اور فرمایا ہاتھ تین ہیں۔ اللہ کا ہاتھ بلند ہے اور دینے والے کا ہاتھ اس کے نیچے ہے اور مانگنے والے کا ہاتھ قیامت تک پست ہی رہے گا اور فرمایا کہ کفایت کے باوجود جو سوال کرے بروز محشر اس کا چہرہ بد نما ہو گا اور اس پر خراش کے نشان ہوں گے۔

اسلام اور سرمایہ داری

اسلام نے سرمایہ داری کی بدترین انسانیت سوز لعنت کو ختم کرنے کا جس قدر اہتمام فرمایا ہے شاید کسی دین و ملت میں اس کی نظیر نہ مل سکے۔ لہذا اپنی ضرورت سے فالتو رقم کو ذخیرہ کرنے کی جا بجا مذمت فرمائی اور فتنہ انگیز لوگوں پر خیرات کرنے کی تاکید فرمائی اور لوگوں کو پیسہ خرچ کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے مختلف طریقے استعمال کئے۔ کہیں وجوب کا حکم دیا اور کسی مقام پر استحباب و سنت قرار دیا۔

فحس و زکوٰۃ کے رنگ میں، کفارات کے ضمن میں، فدیے کی صورت میں، صدقات واجبہ و مستحبہ کے طریق پر، اوقات کے ذریعے سے اور وصیت و ہبہ، یا بخشش و ہدیہ وغیرہ کے لباس میں بہر کیف خرچ کے لئے علیحدہ علیحدہ مذاات قرار دے کر متمول طبقہ کو ذخیرہ اندوزی اور سرمایہ داری سے باز رہنے کی دعوت دی ہے تاکہ مال و دولت انسانوں میں دست بدست چلتی پھرتی رہے اور کہیں ایک جگہ رُک نہ جاوے اور تمام بنی آدم اس سے کما حقہ استفادہ کر سکیں اور انسانوں کے پست و ناوار طبقہ کی زندگی کی سطح مالدار طبقہ کی دست گیری کی بدولت بلند ہو کر اہل ثروت کے برابر نہ سہی تو کم از کم ان سے ملتی جلتی ہو جائے اور جہاں ایک طرف صاحبان ثروت کو نادار لوگوں پر اپنے سرمائے سے خرچ کرنے کے احکام جاری فرمائے وہاں اُن کو اسراف و فضول خرچی سے روکتے ہوئے عیش پسندیوں اور رنگ رلیوں میں پیسہ اڑانے، بلکہ ہر قسم کے فاخرانہ اور متکبرانہ انداز سے باز رہنے کی اُن کو تلقین بھی کر دی۔

ایک طرف غرباء کی زندگی کی سطح کو صاحبان ثروت کی امداد سے بلند کرنا اور دوسری طرف مالداروں کو انتہائی بلند اور چوٹی کی زندگی بسر کرنے عیاشیوں میں پیسہ اڑانے اور ناز و نعمت کے مسرفانہ مظاہروں سے روک دینا صرف اس لئے ہے کہ انسانی زندگی ایک متوسط سطح پر ہو اور تمام افراد ایک دوسرے کے قریب قریب رہ کر ملتی جلتی زندگی بسر کر سکیں۔ اور کینہ، بغض، حسد اور اس قسم کی قلبی کدورتوں، دماغی کوفتوں اور ذہنی آفتوں اور ناپاک ارادوں سے نوریع انسانی کی گلو غلامی ہو سکے اور ان کی بجائے یک جہتی، یگانگت اور اتحاد و تعاون کا جذبہ کار فرما ہو جائے تاکہ انسانی تمدن اپنے فطری تقاضوں اور طبعی حدود پر جلوہ گر ہو کر عالم کو امن و آرام اور سکون و اطمینان کا گہوارہ بنا دے کیونکہ اسلام کی نظر صرف اصلاح آخرت پر محصور نہیں بلکہ وہ انسان کے لئے ایک ایسے لائحہ عمل کی تشکیل کرتا ہے جس سے انسانی زندگی کے دنیاوی دُخروں ہر دو شعبوں کی اصلاح ہو سکے۔ لہذا قرآن کریم نے اسلام کا جو نظریہ ہمارے سامنے رکھا ہے اس میں دین و دنیا کی خیر و خوبی اور دار فانی اور عالم جاودانی ہر دو کی مصلحتی و مہربودی کا راز مضمر ہے۔

اسلامی تعلیمات کا مطمح نظر انسان کو صحیح انسانیت سکھانا ہے تاکہ وہ آئے دن کی شورشوں سے محفوظ رہ کر اپنی پاکیزہ زندگی کو اخلاق فاضلہ اور عادات لائقہ سے آراستہ کر سکے اور انسانی عائد شدہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے پر پوری طرح موفق ہو جائے۔ تاکہ زمین اللہ کی مال و متاع سب اللہ کا شمار ہو اور تمام مومن بھائی بھائی ہو کر اس میں بسر اوقات کریں۔ اور سیرت نبویہ نے اسی نوعیت کی زندگی کا رواج قائم کیا جو آپ کے حین حیات تک ہی قائم رہ سکا۔ اور آپ کی رحلت کے بعد شہوات و جذبات کے ناخدا ترس ہاتھوں نے فوراً ہی اس کا گلا دبا دیا۔ جس کے متعلق حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے درد مند دل کے تاثرات کا تاسف و تحیر کے لہجہ میں یوں اظہار فرمایا ہے۔

”تمہیں وہ زمانہ نصیب ہوا ہے کہ نیکی میں ادبار اور برائی میں اقبال روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ شیطان لوگوں کی تباہی کی تاک میں ہے اور اس زمانہ میں وہ طاقت پکڑ چکا ہے، اس کی مکاری مقبول عام اور اس کے شکار کا پھندا ہم گیر ہو رہا ہے تم لوگ جس طرف نظر اٹھا کے دیکھو تو کسی فقیہ پر نظر پڑے گی جو فقر و فاقہ کی سختیوں میں مبتلا ہوگا، یا مالدار دیکھو گے جو کفران نعمت میں گرفتار ہوگا۔ کہیں بخل اپنے بخل کو تو انگری اور زیادتی مال و دولت کا ذریعہ بنا رہا ہے اور کسی جگہ متمدن و سرکش و عطف و نصیحت سے کالوں کو بند کئے ہوئے ہے۔ (منہج البلاغہ)

قرآن کا تمام انسانوں کو متوسط سطح پر لانے کا ہمہ گیر نظریہ حقیقت اور صداقت کے ایسے پائیدار اصولوں پر مبنی تھا جن کو کسی دور میں غلط نہیں ثابت کیا جاسکتا اور اس کی مصلحتیں اس کے احکام کی پائیدار اور ٹھوس بنیادیں ہیں۔ جو تاقیامت اپنی استواری کی بناء پر امنہ نام پذیر نہیں ہو سکتیں۔ انسانوں کے نچلے طبقہ کو اوپر لانے اور اوپر کے طبقہ کو اسراف سے روک کر سرنگوں رہنے کا پروگرام امریت و ملوکیت اور اشتراکیت و شیوعیت کے بین بین ایک ایسا ہموار اور آسان راستہ تھا جس پر چل کر تمدن انسانی کبھی ٹھوکر نہیں کھاتا اور مقصداً انسانیت کبھی پامال نہ ہوتا۔ مغربی تہذیب کا جب سے افق مشرق پر طلوع ہوا ہے، حیوانی شہوات، مہمی خواہشات اور نفسی لذات میں افراط و انہماک نے انسانیت کو زندہ درگور کر کے رکھ دیا ہے، انسانی دماغ متاع انسانیت انہی لذات کو قرار دے چکا ہے اور ہر ممکن انہی کی تحصیل پر خرچ کرنا زندگی کی کامیابی سمجھتا ہے۔ جس کے نتیجے میں صاحبان دولت و ثروت کے دروازہ پر ہر قسم کے لذائذ نے ڈیرہ جمالیا ہے اور نچلا طبقہ اپنے حرام کے دامن میں منہ ڈال کر آہ حسرت و چشم عبرت سے گریہ کنان و نالائ ہے لیکن اوپر کا طبقہ بھی مطمئن نہیں بلکہ ہوس و حرص کے شکنجے میں ایسا بڑی طرح پھنسا ہے کہ ایک دوسرے کو کھانے پر تلا ہوا ہے اور مادی، دنیادی آرام و نیک بختی کی زندگی پورے ہفت اقلیم میں چند افراد کے قبضہ میں آگئی ہے اور اکثریت صرف انہی چند لوگوں کے رحم و کرم پر زندگی کے سانس پورے کر رہی ہے۔ ان حالات کے پیش نظر اخلاق شریفانہ اور عادات کریمانہ کا جنازہ نکل چکا ہے اور نعمات زندگی کی چاہت میں ہر فرد اس قدر سرگرداں ہے کہ اس کی تحصیل میں اعتدال کا نام و نشان تک نہیں رہا۔ اوپر کے طبقہ کو اپنی ظالمانہ روش ماتحتوں کے طغیان سے مطمئن نہیں ہونے دیتی اور نچلا طبقہ ہر وقت استبدادی

علیہ کیونرم علیہ سوشلزم

شکبجے سے جی چھڑانے کی فکر میں ہے۔ پس دونوں طبقے مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کوسوں دُور ہو گئے ہیں اور اندرونی طور پر ایک دوسرے کے سخت ترین دشمن بن چکے ہیں۔ اور بسا اوقات غنی و فقیر کا یہ تضادم، امیر و غریب میں یہ تفاوت، اور صاحب ثروت اور فاقہ مست میں یہ تنافر بڑے سے بڑے فساد کا پیش خیمہ بن جایا کرتا ہے اور مالدار اور غنی طبقہ کی بے راہ روی ہی سچے طبقے میں اشتراکیت و شیوعیت کے انسانیت سوز اور شرمناک نظریے کو جنم دے دیتی ہے اور دُور حاضر میں کمیونزم کا یہ ہمہ گیر طوفان اور شیوعیت و اشتراکیت کا جاذب طبع بحران و طغیان اسی نا جائز سرمایہ داری اور غلط ذخیرہ اندوزی کا شاخسانہ ہے ورنہ اگر قرآنی اصولوں پر عمل کیا جاتا اور سچے طبقہ کو بھی کسی حد تک جینے کے حقوق دیئے جاتے تاکہ وہ بھی چند روزہ زندگی میں اطمینان کا سانس لے سکیں تو یقیناً کمیونزم کو اس قدر پر وبال پھیلانے کا موقع نہ مل سکتا اور شیوعیت کا سیلاب اپنے منبع سے اس حیرت انگیز رفتار کے ساتھ نہ بڑھتا۔

اسلام نے انبیاء کے مال میں فتناء کے حقوق مقرر کر کے اور سود خواری کی لعنت کو ختم کر کے دونوں طبقوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی ہے تاکہ ان میں باہمی انس و تعاون کا جذبہ پیدا ہو اور انسان کی تمدنی زندگی ہر قسم کے آشوب سے بالاتر ہو کر پُر امن و پُر سکون بن جائے۔

اسی نکتہ کے پیش نظر خداوند کریم نے سود خواری کو حرام قرار دیا اور انبیاء کو بلا سود و قرض دینے کی ہدایت فرمائی۔ لیکن حرص و ہوس نے قلوبِ انسانی سے اسلامی اصولوں کو نہت جلد ہی مٹا کر رکھ دیا جس کی بدولت زندگی اور بہیمیت متاعِ انسانیت کو لوٹنے میں کامیاب ہو گئی اور دنیاوی زندگی امن و سلامتی کی بجائے ظلم و استبداد اور خوف و ہراس کا مرقع بن گئی۔

سود خواری، ذخیرہ اندوزی اور سرمایہ داری کا بدترین زہیہ ہے اور عالمی جنگ اسی کے خوفناک نتائج ہوا کرتے ہیں کیونکہ غریب اور پست طبقہ خواہشات و جذبات کو ضبط کرتے کرتے جب تنگ آجاتا ہے تو وہ چار و ناچار اُوپر کے طبقہ سے ٹکّر لینے کے متعلق سوچتا ہے اور بالآخر باہمی تضادم کی آگ بھڑک اٹھتی ہے جس سے انسانی سکون و اطمینان کا خرمن جل کر خاکستر کا ڈھیر ہو جاتا ہے۔ لہذا قرآن مجید نے اسلام کے فروعی احکام میں سے اس قدر کسی حکم کو اہمیت سے بیان نہیں فرمایا۔ جس قدر اس نے سرمایہ داری اور ذخیرہ اندوزی کی لعنت کو ختم کرنے کے لئے اہتمام فرمایا ہے۔

بہر کیف قرآن مجید ملکیت کو ختم نہیں کرتا، بلکہ ملکیت کو برقرار رکھتے ہوئے غیر مالکوں کے حقوق کی پاسداری کی تلقین فرماتا ہے۔ تاکہ مالک و غیر مالک ہر دو حقوقِ زندگی سے برابر حصہ لے سکیں اور ایک دوسرے سے قریب تر رہ کر اتحاد و تعاون سے تمدنی و اجتماعی پوزیشن کی اصلاح کر سکیں۔ لہذا یہ کہنا کہ اسلام کمیونزم کی تعلیم دیتا ہے۔ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے بلکہ قرآن و اسلام پر بہتان و افتراء عظیم ہے۔ قرآن حق ملکیت کسی سے سلب نہیں کرتا اور نہ کسی کو

کسی کی ملکیت پر دست درازی کی اجازت دیتا ہے۔ ہاں ملکیت والوں کو غیر مالکوں اور ناداروں کی رعایت کی تعلیم دیتا ہے جو انسانی حق ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسانوں میں حیوانیت کی جذباتی و شہوانی طاقتیں منظم ہو کر ایک امتیازی حیثیت کی حامل بن جائیں جس طرح طاقتور حیوان کمزور حیوان سے حق زندگی سلب کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ اور اس میں رفق و ملاحظت کا مادہ نہیں ہوتا کہ کمزور پر رحم و کرم کی نظر کر سکے اور اس کے لئے بھی جینے کا حق تجویز کرے اسی طرح اگر انسان بھی اپنی طاقت و ملکیت کے بل بوتہ پر کمزور و ناتواں طبقہ سے حق زندگی سلب کرنے کے درپے ہو اور اپنے لطف و کرم اور سخاوت و ایشارے سے امتیازی شان کا مظاہرہ نہ کر سکے تو انسان و حیوان میں پھر فرق ہی کیا باقی رہتا ہے؟

اگر خدا چاہتا تو سب کو برابر دیکھاں امیر و غریب پیدا کرتا۔ لیکن اس نے اپنی مشیت و مرضی سے تفاوت اور اختلاف پیدا کر کے انسان کو آزمائش کے مقام پر کھڑا کیا ہے تاکہ اپنے اختیارات سے نیکی و بدی کے راستوں کے درمیان امتیاز کر کے اگے بڑھے۔

حضرت ابوذرؓ پر کمینہ زم کے شیعہ اپنی یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ اشتراکیت کے حامی تھے۔ حالانکہ یہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ حضرت ابوذرؓ جناب رسالتؐ کے وہ مقتدر و معزز صحابی تھے کہ آپؐ نے ان کے حق میں فرمایا تھا کہ زمین و آسمان کے مابین حضرت ابوذرؓ سے زیادہ کوئی صادق اللسان نہیں ہے آپؐ حق ملکیت کے قائل تھے لیکن وہ مالک اور صاحبان ثروت و دولت جو اپنے اموال میں سے فقراء کے حقوق ادا نہ کرتے تھے۔ حضرت ابوذرؓ ان کو کبھی معاف نہیں کرتے تھے اور علی الاعلان ان کو حکم خدا سناتے ہیں جھجک محسوس نہ فرماتے تھے اور بر ملا اور بر سر اجلاس اغنیاء کو حکم زکوٰۃ و خمس و جملہ حقوق مالیہ کی ادائیگی کی تلقین کرتے تھے اور ان کے یہی بے لوث کلمات اور مبنی بر خلوص مواعظ ان کی جلا وطنی کے موجب ہوئے لیکن تا دمِ نزیت انہوں نے اپنے منظرِ یہ حق کو تبدیل نہ کیا اور حکومت وقت کے تہدیدی پینامات اور خلافت وقت کے استبدادی اقدامات باوجودیکہ ان کے لئے وبال زندگی بن گئے لیکن ان کو اپنے اصلاحی موقف اور غلط اقدامات کے خلاف احتجاجی پالیسی سے ذرہ بھر ہٹا سکے۔

میں شیعانِ اہلِ محمدؐ سے گزارش کروں گا کہ اپنے میں حضرت ابوذرؓ کی سی سیرت پیدا کریں اور خصوصاً اغنیاء و مالدار طبقہ کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ ایسے پاکیزہ صحابی رسولؐ کی سیرت سے درس عمل حاصل کر کے حقوق مالیہ کی بجا آوری میں کوتاہی نہ کریں اور دین و دنیا کی فلاح کو ہاتھ سے نہ دیں۔ اس مسئلہ کی مزید وضاحت ہماری تو تصنیف کتاب اسلامی سیاست میں ملاحظہ فرمائیں

الَّذِينَ يَنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِالْإِيلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ

وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال - رات اور دن کو خفیہ اور ظاہر (راہِ خدا میں) پس ان کا

أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۴۷﴾

اجر ان کے رب کے پاس ہے۔ نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ محزون ہوں گے

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا أَلَّا يَقُومُوا إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ زندگی نہیں بسر کرتے مگر مثل زندگی بسر کرنے اس شخص کے جس کو بدحواس کر دے

الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ

شیطان بوجہ مس کرنے کے۔ یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی تو مثل سود کے ہے۔ حالانکہ حلال کیا ہے خدا نے

اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَى فَلَهُ

بیع کو اور حرام کیا سود کو۔ پس جس کے پاس آجائے نصیحت اپنے رب سے۔ پس وہ رک جائے تو اس کے لئے (معاف) ہے جو ہو چکا اور

مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۴۸﴾

اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جو پھر ایسا کرے تو وہ دوزخی ہوں گے۔ اور اس میں سہیشہ رہیں گے

رکوع نمبر ۶ سود کھانے کا گناہ اور چن مسائل

الَّذِينَ يَنْفِقُونَ - تفسیر برہان میں کتب فریقین سے منقول ہے کہ یہ ائمہ مجیدہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے
شان میں اتری۔ آپ کے پاس چار درہم تھے اور ان کو راہِ خدا میں صدقہ دیا۔ ایک رات میں ایک دن میں "ایک پوشیدہ طور پر
اور ایک اعلانیہ طور پر تب یہ آیت اتری۔ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا - منقول ہے کہ سود خوار بروز قیامت جب کھڑے ہوں
گے تو ان کی حالت بادے اور دیوانے انسان کی سی ہوگی جس سے تمام اہل محشر ان کو پہچان لیں گے اور جو لوگ سود کو
حلال جانتے ہیں وہ سود کو خرید و فروخت (تجارت) پر قیاس کرتے ہیں اور کہتے ہیں تجارت میں بھی نفع لیا جاتا ہے اور وہ
حلال ہے اور سود میں بھی وہی نفع ہے لہذا یہ بھی حلال ہونا چاہیے تو خداوند کریم اس آیت میں ان کے قول کی تردید فرماتا

کہ سود صرف وزن اور پیمانہ کی چیزوں میں ہے اور بس۔

مسئلہ :- مذکور اجناس (جو ناپ یا وزن کے تحت میں ہوں) ان میں سے ہر جنس دوسری جنس سے اگر فروخت کی جائے مثلاً گندم نخود کے بدلہ میں، یا کھجور انکھور کے بدلے تو کمی یا بیشی میں کوئی ہرج منہیں۔ لیکن ایک جنس کا سود اسی جنس سے ہو مثلاً گندم گندم کے بدلے، یا کھجور کھجور کے بدلے و علیٰ ہذا القیاس تو اس صورت میں برابر برابر لینا اور دینا واجب ہے خواہ دونوں اعلیٰ جنسیں ہوں یا دونوں ادنیٰ ہوں یا ایک اعلیٰ ہو اور دوسری ادنیٰ۔ اگر عمدہ گندم کے بدلہ میں ردی گندم زیادہ لے یا اعلیٰ کھجور کے بدلہ میں ادنیٰ کھجور زیادہ وصول کرے تو یہ سود ہے اور حرام ہے۔

مسئلہ :- مسئلہ تجارت میں گندم اور جو کو ایک جنس قرار دیا گیا ہے لہذا گندم اور جو کی آپس میں خرید و فروخت ہو۔ تو برابر برابر لینا دینا واجب ہے اور گندم کم دے کر جو زیادہ لینا یا جو کم دے کر گندم زیادہ لینا سود ہے۔

مسئلہ :- ایک جنس سے حاصل شدہ چیز اسی جنس کے حکم میں ہے لہذا باہمی سود میں کمی و بیشی ناجائز ہے۔ مثلاً گندم کا آگندم کے بدلہ میں برابر برابر لے دے سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک جنس کا دودھ اور اسی جنس کے دودھ سے حاصل شدہ چیزیں مکھن، گھی وغیرہ ایک ہی جنس کے حکم میں ہیں، خرید و فروخت میں ان کا تبادلہ برابر برابر ہوگا۔ زیادتی سود ہوگی۔ و علیٰ ہذا القیاس

مسئلہ :- سونے کا سونے سے تبادلہ، اسی طرح چاندی، چاندی کے بدلہ میں برابر برابر لینا واجب ہے۔ خواہ ایک سونا بیش قیمت اور دوسرا کم قیمت ہی ہو۔ اور اسی طرح چاندی بھی، خواہ ایک عمدہ اور دوسری غیر عمدہ ہو۔ کم دے کر زیادہ لینا سود ہے۔

مسئلہ :- یہ چیزیں جن پر سود صادق ہے۔ اس میں فرق نہیں کہ سود نقد ہو یا ادھار ہر دو صورت میں زیادتی سود شمار ہوگی۔

مسئلہ :- احادیث میں وارد ہے کہ جو شخص تجارت کرنا چاہے اس کو چاہیے کہ تجارت کے مسائل معلوم کرے ورنہ بعید نہیں کہ وہ سود میں مبتلا ہو جائے۔

سود کھانے والے کا عذاب

(۱) سود کھانے والا میدانِ محشر میں نہایت بدترین حالت میں پیش بارگاہ رب العزت ہوگا۔ جس طرح کہ محبوظ الخواس اور دیوانے ہوتے ہیں اور یہ ان کی سود خوری کی علامت ہوگی جس سے تمام محشر والے جان لیں گے کہ یہ سود خوار تھا بلکہ مردی ہے کہ ہر بدکار کے اوپر اسی کی برائی کی مخصوص نشانی ہوگی جس سے وہ پہچانا جائے گا اور اسی طرح ہر نیکی کرنے والے کے چہرہ

پر مخصوص علامت ہوگی جس سے اس کی اہمیت و عظمت معلوم ہوگی۔

(۲) سود خوار کو خداوند کریم نے کفار اور اٹیم کے سخت لفظوں سے موصوم کیا ہے یعنی سود خوار بڑا کافر اور بڑا گنہگار ہے اور جس کو خدا بڑا کافر یا بڑا گنہگار کہے تو اس کا ٹھکانا ہی کیا ہو سکتا ہے مگر یہ کہ توبہ کر کے اپنے گناہ کی معافی لے۔ چنانچہ اگلی آیت میں اسی کا تذکرہ ہے۔

(۳) سود کھانے والا ایسا ہے جیسا کہ خدا و رسول سے نبرد آزما ہو اور لڑ رہا ہو۔ چنانچہ بعد والی آیت میں صاف طور پر بیان کیا جا رہا ہے۔

(۴) جناب رسالت اکبر سے منقول ہے کہ شب معراج میں جہنمیوں کو دیکھا ان میں کئی ایسے آدمی تھے جن کے پیٹ بہت بڑے تھے اور ان کے اندر سے سانپ نظر آرہے تھے۔ میں نے جبریل سے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں تو اس نے کہا کہ یہ وہ ہیں جو دنیا میں سود کھاتے ہیں۔ (مجمع البیان)

(۵) آپ سے مروی ہے کہ شب معراج میں نے جہنمیوں میں کئی لوگوں کو دیکھا کہ ان کے پیٹ بہت بڑے تھے کہ وہ اٹھ نہ سکتے تھے۔ میں نے پوچھا۔ یہ کون ہیں؟ تو جبریل نے جواب دیا کہ سود خوار ہیں جو میدان محشر میں مضبوط الحواس اٹھیں گے اور یہ لوگ فرعونوں کی طرف صبح و شام جہنم کا مزہ چکھتے ہیں۔ الخیر (مجمع البیان)

(۶) حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ جناب رسالت اکبر نے سود کے معاملہ میں پانچ قسم کے آدمیوں پر لعنت بھیجی ہے۔

(۱) سود کھانے والا (۲) اس کا کھلانے والا (۳) سود لینے اور دینے کے دو گواہ (۴) سود کا تحریر نامہ لکھنے والا۔ (مجمع البیان)

(۷) آپ نے فرمایا کہ جب خدا کسی بستی پر عذاب نازل فرمانا چاہتا ہے۔ تو ان میں سود خوری زیادہ ہو جاتا کرتی ہے۔ (مجمع البیان)

(۸) امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ سود کے گناہ کے ستر درجے ہیں کہ کم از کم درجے کا گناہ ایسا ہے جیسا کہ اپنی ماں سے کعبہ میں زنا کیا جائے (برہان)

(۹) جمیل بن دراج نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ سود کے ایک درہم کا گناہ اللہ کے نزدیک اُن ستر زنا کے گناہ سے زیادہ ہے جو اپنی ماں، بہن، بیوی وغیرہ سے کعبہ کے اندر کیا جائے۔ (برہان)

(۱۰) جناب رسالت اکبر سے منقول ہے کہ میری امت پر ایک درہم کا سود کھانے سے کوئی نہ بچے گا اور اگر کوئی بچے گا تو اس پر بھی سود کی کچھ نہ کچھ گرد تو پڑ ہی جائے گی۔ (مجمع البیان)

يَسْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُزِيهِ الصَّدَقَاتِ وَاللَّهُ لَا يُبِ كُلَّ كَفَّارٍ

مٹاتا ہے خدا سود کو اور بڑھاتا ہے صدقات کو اور اللہ نہیں محبوب رکھتا ہر بڑے کافر

اَتِيْمٌ ۝۱۴۱ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ

گنہگار کو تحقیق وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل بجالائے اور قائم کی نماز

وَاتَوَّالْتَرَكُوْةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

اور زکوٰۃ ادا کی ان کے لئے ان کا اجر ہے نزدیک اپنے رب کے اور نہ ان پر خوف ہوگا

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۱۴۲ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ثِقُوْا بِاللّٰهِ وَذُرُوْا مَا

اور نہ وہ محزون ہوں گے اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو وہ

بَقِيَ مِنَ الرِّبَا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱۴۳

جو باقی ہے سود سے اگر تم (سچے) مومن ہو

يَسْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا - زرارہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت صادق علیہ السلام سے دریافت کیا کہ خدا فرماتا ہے کہ میں سود کو مٹاتا ہوں اور صدقات کو بڑھاتا ہوں۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سود کھانے والوں کا مال کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ اس سے مٹانا اور کیا ہوگا کہ سود کا ایک درہم دین کو مٹا دیتا ہے اور اگر وہ اس سے تو بہ کرے گا تو اس کا مال ختم ہو جائے گا اور وہ تنگ ہو جائے گا (مقصود یہ ہے کہ جب سود خوار تو بہ کرے گا تو اس کو غیر کا حق جو کھا چکا ہے وہ تو داپس مالکوں کو دینا پڑے گا۔ جیسے وقت، تو اس نے مقوڑا مقوڑا لیا تھا اور دیتے ہوئے اس کو اکٹھا دینا پڑے گا۔ لہذا لازمی طور پر اس کے جمع شدہ مال پر اثر پڑے گا اور وہ تنگ ہی رہے گا۔)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جناب رسالت اللہ نے فرمایا کہ ہر چیز پر فرشتے مامور ہیں سوائے صدقہ کے کیونکہ اس کو خدا خود اپنے دست قدرت میں لیتا ہے اور اس کی پرورش فرماتا ہے جس طرح تم اپنی اولاد کی پرورش کرتے ہو اور قیامت کے دن جب تم کو دیا جائے گا یعنی اس کی جزادی جائے گی تو مثل کوہ احد ہوگا۔ (برہان)

نیز جناب رسالت اللہ سے منقول ہے کہ کوئی مال صدقہ دینے سے کم نہیں ہوتا (جیسا کہ آیت مجیدہ میں خداوند عالم خود وعدہ فرما رہا ہے کیونکہ آیت کا ظاہر یہی بتلاتا ہے کہ دنیا میں بھی صدقہ مال کو بڑھانے کا سبب ہے) یٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا - شراہن نزد اس آیت کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ بعض صحابہ آیام جاہلیت میں سود کا معاملہ کیا کرتے

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ

پس اگر ایسا نہ کرو تو تیار رہو اللہ اور رسول سے لڑنے کے لئے اور اگر توبہ کرو تو تمہارے

رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلُمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿۲۴۹﴾ وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ

لئے تمہاری اصل پونجی ہے۔ نہ ظلم کرو اور نہ ظلم کئے جاؤ اور تمہارا مقروض (تنگ دست ہو۔ تو مہلت

إِلَىٰ مِيسْرَةٍ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۵۰﴾ وَاتَّقُوا يَوْمًا

تازمان خوشحالی (ان کو دم) اور تمہارا صدقہ کر دینا زیادہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم جانتے ہو اور ڈرو اس دن سے کہ

تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۲۵۱﴾

پلٹائے جائیں گے اس میں اللہ کی طرف پھر لوپرا دیا جائے گا ہر نفس کو اپنا کمایا ہوا اور نہ خسارہ دیئے جائیں گے

تھے اور ان کی سود کی کافی رقم ان کے مقروضین کے ذمہ تھیں اور اسلام لانے کے بعد انہوں نے اپنی سودی رقم کا مقروضین سے مطالبہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی کہ اس سے پہلے جو کچھ کھا چکے ہو وہ معاف ہے اور جو کچھ تمہارے سود کا بقیہ ان کے ذمہ ہے اس کو چھوڑ دو۔ اور اگر پھر بھی باز نہ آؤ تو پھر تمہاری خدا اور رسول سے جنگ ہے ہاں اگر توبہ کر لو تو صرف اپنے مقروض لوگوں سے اپنی اصل رقم واپس لے لو اور زیادہ کا مطالبہ نہ کرو۔ اس میں ان کو خسارہ دو اور نہ تم پر کوئی خسارہ ہے۔

وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ - اس سے پہلے تو فرمایا کہ قرضہ وصول کرتے وقت صرف اپنی اصل رقم واپس لو اور سود چھوڑ دو، اب فرماتا ہے کہ اگر تمہارے مقروض غریب و تنگ دست ہوں کہ تمہیں فوری طور پر عندالمطالبہ اصل رقم بھی واپس نہ دے سکتے ہوں تو ان کو تنگ نہ کرو۔ بلکہ ان کی میعاد بڑھا دو، جب ان کے پاس پیسہ آجائے اور وہ خوش حال ہو جائیں تب ان سے مطالبہ کرو اور اگر ان کو ان کی تنگدستی کے پیش نظر معاف کر دو، تو تمہارے لئے اور زیادہ بہتر ہے۔

مسئلہ :- امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ سود کھانے والے پر اگر ثابت ہو جائے کہ اس نے سود لیا ہے تو اسے تادیب کی جائے اگر دوبارہ کرے تو دوبارہ تادیب کی جائے اور اگر سہ بارہ کرے تو اسے قتل کر دیا جائے

(مجمع البیان)

مسئلہ :- اگر کوئی شخص سود کھانے کی حرمت کا انکار کرے تو وہ کافر اور واجب القتل ہو جاتا ہے۔

مقروض تنگ دست کو مہلت دینا | اس کے متعلق تفسیر برہان میں کافی روایات درج ہیں۔ چند ایک کا ذکر کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

(۱) جناب رسالتؐ ایک روز منبر پر تشریف لائے حدو ثنا پر در دگار اور درود بر انبیائے اطہار کے بعد فرمایا: ایھا الناس تم میں سے جو حاضر مجلس ہیں ان کو چاہیے کہ غیر موجود لوگوں کے کانوں تک میرا یہ پیغام پہنچا دیں کہ جو شخص کسی تنگ دست مقروض کو مہلت دے گا تو خدا کے نزدیک اس کا وہ روپیہ ہر روز کا صدقہ اور خیرات شمار ہوگا۔

(۲) امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جناب رسالتؐ نے فرمایا: جو شخص ہر روز محشر عرش خدا کے سایہ کا امیدوار ہو کہ جس دن اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ اس کو چاہیے کہ تنگ دست کو مہلت دے اور اس پر سے اپنا حق اٹھالے۔

(۳) امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جناب رسالتؐ نے فرمایا: جو شخص جہنم کے تیز شعلوں سے بچنا چاہے اُسے چاہیے کہ تنگ دست کو مہلت دے۔ الخیر۔

(۴) جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ ہر روز محشر خداوند عالم چند لوگوں کو زیر عرش جگہ کرامت فرمائے گا کہ ان کے چہروں سے نور ساطع ہوگا۔ نورانی لباس سے آراستہ ہو کر نور کی کرسیوں پر وہ جلوہ گرہوں گے پس باقی مخلوق ان کی کرامت و عزت کو دیکھ کر عرض کرے گی کہ کیا یہ لوگ نبی ہیں؟ تو زیر عرش سے منادی ندا کرے گا کہ یہ نبی نہیں ہیں۔ پھر پوچھا جائے گا کہ کیا یہ لوگ شہداء ہیں؟ منادی کی طرف سے جواب ملے گا کہ یہ شہداء بھی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں مومنوں کو غمشال کیا تھا یا تنگ دست مومنوں کو غمش حالی تک کی مہلت دی تھی۔

مسئلہ: تنگ دست انسان کو مہلت دینا واجب ہے اور تنگ دستی کی حد یہ ہے کہ اپنے اور بال بچوں کے درمیان گذر اوقات سے اس کے پاس زائد مال نہ ہو کہ وہ اس کو قرضہ میں ادا کرے اور مقروض پر واجب ہے کہ اگر اس کے پاس مال موجود ہو اور قرضہ کی مبیعہ آجائے تو اولین فرصت میں اپنے قرضہ سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرے اور خواہ مخواہ قرضخواہ کو بار بار کے مطالبہ کی زحمت نہ دے۔

تفسیر مجمع البیان میں ابن عباس سے مروی ہے کہ قرآن مجید کی آیات میں سے سب سے آخر نازل ہونے والی آیات یہی ہیں جن میں سود کا حکم بیان کیا گیا ہے اور تفسیر برہان میں ہے کہ سود کی آیات کے بعد سب قرآن کے آخر میں یہ آیت اتری وَاتَّقُوا يَوْمًا۔ الخ اس آیت مجیدہ کے نزول کے بعد جناب رسالتؐ کل اکیس دن زندہ رہے۔

نقدی کا وجود | چونکہ انسان مدنی الطبع ہے اور امور زندگی میں باہمی تعاون اور لین دین کا محتاج ہے بنا بریں چیزوں کا تبادلہ اس کا جزو زندگی ہے مثلاً ایک شخص کو گندم کی ضرورت ہے لیکن پاس موجود نہیں اور بجائے گندم کے اس کے پاس اپنی ضرورت سے زائد کپڑا موجود ہے اور دوسرے شخص کو لباس کی ضرورت ہے لیکن بجائے کپڑے کے

اس کے پاس گندم فالتو موجود ہے پس دونوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے پاس موجود فالتو چیز کا دوسرے کے پاس موجود زائد شی سے حسب ضرورت تبادلہ کر لیں لیکن مشکل یہ ہے کہ کپڑے کی معین مقدار کے مقابلہ میں کس قدر گندم ہونی چاہیے اور ہر جنس کا دوسری جنس سے بوقت حاجت جب تبادلہ ہوگا یہی مشکل پیدا ہو جائے گی۔ پس اس مشکل کو آسان کرنے کے لئے ایک تیسری چیز کی ایجاد کی گئی جس سے ہر جنس کا اندازہ صحیح ہو سکے اور بوقت تبادلہ اجناس اسی کی طرف رجوع کیا جائے اور وہ ہے نقدی۔ پس اس میں شک نہیں کہ نقدی کا وجود خود مقصود تمدن نہیں بلکہ مقصود بالذات ہے۔ باہمی تعاون اور لین دین میں آسانی اور اس کا ذریعہ ہے نقدی۔

پس عقل و فطرت، انسان کو نقدی کے اپنے پاس رکھنے کی اجازت اس حد تک دیتی ہے جہاں تک اس کی ضرورت زندگی کا تعلق ہے اور وہ نقدی جو انسان کی ضروریات سے وافر ہو تو بجائے بے کار جمع کرنے کے اس پر ضروری ہے کہ محتاج انسانوں کی خبر گیری کرے اور ہر انسان کے کام آنے والی نقدی صرف وہی ہے جس سے وہ خود فائدہ اٹھا سکے لہذا جس حد تک اُسے دنیا میں ضرورت ہے بے شک اس سے دنیاوی مفاد حاصل کرے اور جس قدر اس کے پاس دنیاوی ضروریات سے وافر ہو اس سے دار آخرت کی تعمیر کرے اور وہ اس طرح ہو سکتی ہے کہ فقراء و محتاجین کی دست گیری کرے اور وہ روپیہ جو اس کی دنیا کی ضرورتوں سے بچ گیا اور آخرت کے لئے اس کو خرچ نہ کیا بلکہ خزانہ میں جمع کر کے چلا گیا تو وہ روپیہ بروز محشر اس کے لئے وبال و عذاب کا موجب ہو جائے گا۔ اسی بناء پر خداوند کریم نے قرآن مجید میں فی سبیل اللہ خرچ کرنے کی تاکید فرمائی ہے اور دوسرے سے ناجائز پیسہ بطور سود وصول کرنے سے منع فرمایا ہے تاکہ انسان اپنے فطری و عقلی تقاضوں کے ماتحت نقدی کو صرف جائز طریق پر استعمال کرنے کی عادت اختیار کرے اور ناجائز طور پر تحصیل نہ کرے۔

بعض عارف لوگوں نے نقدی کو خزانہ میں جمع کرنے کی مثال یوں دی ہے کہ جس طرح معین شدہ علاقائی مجسٹریٹ کو نظر بند کر دیا جائے اور پھر اس علاقہ کے لوگوں کو جھگڑا کے فیصلہ کا حکم دیا جائے کہ فلاں تعینات شدہ مجسٹریٹ کی طرف رجوع کر کے فیصلہ حاصل کرو۔ حالانکہ بصورت نظر بندی ان کا اس کی طرف رجوع کرنا اور اُس کا ان کے مابین فیصلہ کرنا محال ہے۔ اسی طرح پیسہ چونکہ لوگوں کی ضروریات کی کفالت کے لئے ہے تو اس کی ذخیرہ اندوزی، مجسٹریٹ کی نظر بندی کی مثل ہے اور بوقت ضرورت لوگوں کو فطرت کی طرف سے رجوع کرنے کا حکم ایسا ہے جیسا کہ مقید مجسٹریٹ کی طرف طلب فیصلہ کے لئے رجوع کرنے کا حکم دیا جائے۔ بنا بریں انسان کا فطری تقاضا یہی ہے کہ پیسہ کو بجائے نظر بند کرنے کے بجائے آزاد رکھا جائے اور تمام انسانوں کو اس کی طرف رجوع کا موقع دیا جائے تاکہ انسانی زندگی کا سفینہ شورشوں کے طوفانی تلاطم و گرداب میں چنسیں کر غرق نہ ہو جائے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدِينٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَالْكُتْبَةُ

اے ایمان والو! جب تم آپس میں دین کو مدت مقررہ تک کے لئے تو اس کو لکھ لو۔

وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا

اور چاہئے کہ لکھے تمہارے درمیان کاتب انصاف کے ساتھ۔ اور نہ انکار کرے کاتب لکھنے سے جس طرح کہ اللہ نے

عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيَكْتُبْ وَبِالَّذِي الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ

اس کو علم دیا ہے پس وہ لکھے اور لکھو آجائے وہ جس پر حق ہے (قرض لینے والا) اور وہ اپنے رب

رَبِّهِ وَلَا يَخْشَ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا

سے ڈرے اور کم نہ کرے اس سے کوئی چیز بس اگر ہو وہ شخص جس پر حق ہے (قرض لینے والا) بیوقوف یا کمزور

أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمِلَّ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ

یا یہ کہ نہ قائل ہو لکھوانے کے خود۔ تو لکھوائے اس کا ولی ساتھ انصاف کے۔

رکوع نمبر قرض کا بیان

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا - تفسیر برہان میں مروی ہے کہ سورہ بقرہ میں پانچ سو حکم مذکور ہیں اور ان میں سے پندرہ حکم صرف اسی ایک آیت مجیدہ میں ہیں۔ تفصیل یہ ہے (۱) جب ایک مدت معینہ کے لئے قرضے کا لین دین کیا جائے تو اسے لکھ لینا چاہیے (۲) کاتب پر واجب ہے کہ عدل وانصاف سے لکھے اپنی تحریر میں قرضہ لینے یا دینے والے کو نقصان نہ دے یعنی کم یا زیادہ نہ لکھے (۳) جب کاتب کو لکھنے کے لئے کہا جائے تو انکار نہ کرے (۴) کتابت کرنا کاتب پر واجب کفائی ہے اور شیخ طوسی فرماتے ہیں کہ کاتب پر اس کی اُہرت لینا حرام ہے

مسئلہ - کاغذ سبایہ وغیرہ کا خرچہ قرض دینے والے پر ہے نہ کہ لینے والے پر اور یہ تحریر بھی قرض خواہ کے پاس محفوظ رہے گی۔ (۵) جو قرضہ لے رہا ہے وہ خود تحریر لکھوائے یعنی کاتب کے سامنے اپنی زبانی اقرار کرتا جائے کہ واقعی میں نے فلاں سے اتنی مدت تک کے لئے اس قدر روپیہ لیا ہے وغیرہ۔

وَأَسْتَشْهِدُ شَهِيدَيْنِ مِنْ رَجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ

اور گواہ قائم کر دو گواہ اپنے مردوں میں سے پس اگر دو مرد نہ مل سکیں تو پس ایک مرد

وَأَمْرًا ثَنِ مَنِ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ

اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے کہ تمہیں ان پر بھروسہ ہو (عادل ہوں) اس لئے کہ ایک عورت بھول جائے

إِحْدَاهُمَا الْآخَرَىٰ وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا وَلَا تَسْمَعُوا

تو اس کو دوسری یاد دلا سکے (لہذا ایک مرد کے مقابلہ میں دو عورتیں ہوں) اور نہ انکار کریں گواہ جب وہ بلائے جائیں اور تنگدلی نہ کرو اس

أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ

کے لکھنے سے خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ اپنے وقت تک کے لئے یہ زیادہ قریب انصاف ہے اللہ کے نزدیک اور زیادہ

(۷) قرضہ لینے والے کو اللہ سے خوف کرنا چاہئے کہ کاتب کو غلط نہ بتائے جس طرح آپس میں معاملہ کیا ہے اسی طرح صحیح صحیح لکھوائے۔ شئی کی مقدار۔ اوصاف۔ مدت وغیرہ میں کوئی کمی یا بیشی کر کے نہ لکھوائے۔

(۸) جس کے لئے قرض لیا گیا ہے اگر وہ کم عقل ہے یعنی دیوانہ مجنون ہے یا بچہ ہے یا یہ کہ لکھوانے سے اور اقرار کرنے سے معذور ہے مثلاً یہ کہ وہ گونگا ہو تو اس کے دلی پر واجب ہے کہ وہ لکھوائے لیکن عدل و انصاف کو ملحوظ رکھتے نہ قرض لینے والے کو خسارہ دے اور نہ دینے والے کا نقصان کرے۔

(۹) قرضہ کی لین دین کے وقت دو عادل مرد گواہ قائم کرنے چاہئیں۔

(۱۰) اگر دو عادل مرد دستیاب نہ ہو سکتے ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ مقرر کریں اور ان میں بھی عدالت شرط ہے اور مَسْنُونُ تَرْضَوْنَ کا مقصد یہ ہے کہ تمہارے نزدیک ان کا دین اور عدالت پسندیدہ ہو یعنی مومن ہوں اور ظاہر کے اعتبار سے نیک ہوں (۱۱) جب گواہوں کو گواہ بننے کے لئے یا حاکم شرع کے سامنے گواہی دینے کے لئے بلایا جائے تو ہر دو صورت میں ان کا انکار کرنا ناجائز ہے۔ (۱۲) چھوٹا معاملہ ہو یا بڑا لکھنے کے حکم میں سب برابر ہیں یعنی اس قسم کا ہر معاملہ لکھ لینا چاہئے کیونکہ اس میں ایک دوسرے پر بدگمانی اور شک و شبہ وغیرہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

(۱۳) اگر تجارت اور نقد بندوق خرید و فروخت کا قصہ ہو تو اس میں لکھنا ضروری نہیں اور اگر لکھ لیا جائے تو بھی حرج نہیں۔ (۱۴) خرید و فروخت پر بھی گواہ قائم کئے جائیں اور یہ امر استحباب کے لئے ہے۔

(۱۵) لَا يَضَارُّ۔ اگر صیغہ معلوم کا ہو۔ تو مطلب یہ ہے کہ کاتب اور گواہ معاملہ کرنے والوں کو ضرر نہ دیں یعنی ان کو ان کی ضرورت ہو تو ان کو پریشان نہ کریں بلکہ کتابت یا گواہی کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیں۔

لِلشَّهَادَةِ وَأَذْنِي الْآثَرِ تَابُوا إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاصِرَةً

پختہ کرنے والی ہے شہادت کو اور زیادہ قریب ہے اس کے کہ تم شک میں نہ پڑو مگر یہ کہ ہو سودا اللہ بقتل۔

تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا وَأَشْهَدُوا

جس کا تم باہمی لین دین کرو تو پس تم پر گناہ نہیں کہ نہ لکھو اس کو اور گواہ قائم کر لیا

إِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ وَإِنْ تَفْعَلُوا

کر دو جب خرید و فروخت کرو اور نہ ضرر دے یا نہ ضرر دیا جائے کاتب اور نہ گواہ اور اگر ایسا کرو

فَإِنَّهُ فَسُوقٌ بِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيَعْلَمَ اللَّهُ ط وَاللَّهُ

تر تمہارے لئے گناہ ہو گا۔ اور اللہ سے ڈرو۔ اور اللہ تم کو سکھاتا ہے اور اللہ

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۲۸۲﴾

ہر چیز کا جاننے والا ہے

اور اگر صیغہ مجہول کا ہو تو معنی یہ ہو گا کہ معاملہ کرنے والے کاتب یا گواہ کو ضرر نہ دیں کہ اگر ان کا وقت فارغ نہ ہو اور ان کو بھی اور بل سکتے ہوں تو خواہ مخواہ ان کو تنگ نہ کریں۔

(۵) کاتب یا گواہ کا معاملہ والوں کو یا معاملہ کرنے والوں کا کاتب یا گواہ کو بلا وجہ ضرر دینا فسق اور گناہ ہے حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام سے مزوی ہے کہ جناب رسالت اکرم نے فرمایا کہ خداوند عالم تین آدمیوں کی دعا کو قبول نہیں کرتا۔ (جس کا خلاصہ یہ ہے) (۱) وہ شخص جس کی عورت بد مزاج ہو اور اس کو اذیت دیتی ہو اور اس کی عیب جوئی کرتی ہو اور یہ اس سے تنگ ہو پس اللہ سے دعا مانگے کہ اے پروردگار! مجھے اس سے نجات دے تو خدا کی طرف سے اس کو جواب ملتا ہے کہ اے جاہل! اس سے نجات حاصل کرنا تیرے اپنے ہاتھ میں ہے۔ کیونکہ میں نے تجھے اس کو طلاق دے کر نجات حاصل کرنے کا اختیار دے دیا ہے (۲) وہ شخص جو کسی شہر میں ہو اور وہ جگہ اس کے ناموافق ہو اور وہاں وہ جو کچھ چاہتا ہو اُسے دستیاب نہ ہو سکتا ہو پس دعا مانگے کہ اے پروردگار! مجھے اس سے نجات دے تو خدا کی جانب سے جواب ملتا ہے کہ تیرے لئے میری طرف سے راستہ کھلا ہے۔ اس شہر کو چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں چلا جا۔

(۳) وہ شخص جس نے کسی ناقابل اعتبار آدمی کو قرض دیا اور اس سے وثیقہ نہ لکھوایا۔ پس اس نے قرض کا انکار

کر دیا یا واپس کم دیا۔ پس یہ شخص اللہ سے دعا مانگے تو جواب ملا ہے کہ اے میرا بندہ تو نے میرے فرمان پر عمل نہیں کیا اور اب مجھ سے دعا مانگتا ہے حالانکہ تو نے اپنا مال خود ضائع کیا ہے اور میری وصیت کو تبدیل کیا ہے پس اس بارہ میں تیری دعا قبول نہیں ہے اور جناب رسالتؐ نے فرمایا کہ اللہ کی وصیت پر عمل کر دے کیونکہ اس میں تمہاری کامیابی ہے اور اس کی خلاف ورزی نہ کرو ورنہ پشیمان ہو گے۔

اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث میں مروی ہے کہ جو شخص بغیر لکھے کے اور بغیر گواہوں کے کسی کو قرضہ دے اور پھر وہ اس کو واپس نہ دے تو اس کی بدعا بھی اس کے بارے میں مقبول نہیں۔

ذَرَّجُلٌ وَامْرَأَتَانِ۔ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے۔ جناب امیر المومنینؑ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ ایک عورت حضرت رسالتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! میں جملہ عورتوں کی طرف سے حاضر خدمت ہوئی ہوں کہ خداوند عالم تمام عورتوں، مردوں کا پروردگار اور خالق و رزاق ہے اور حضرت آدمؑ و نواؑ بھی یکساں طور پر تمام مردوں، عورتوں کے والدین ہیں۔ اور آپ بھی تمام مردوں، عورتوں کی طرف یکساں طور پر رسول ہیں پھر کیا وجہ ہے؟ کہ شہادت اور میراث میں دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے؟ آپ نے فرمایا اے عورت خدا نے عادل و حکیم ظلم و جور نہیں کرتا۔ کیونکہ تمہیں کم دینے سے اس کو نفع نہیں اور زیادہ دینے سے اس کو خسارہ نہیں ہے لیکن وہ معاملات کی تدبیر اپنے علم سے فرماتا ہے۔ اے عورت! وجہ یہ ہے کہ تمہارا دین اور عقل ناقص ہے اس نے وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ تمہارے دین کا نقصان تو اس سے ظاہر ہے کہ تمہیں ہر ماہ میں نماز پڑھنے سے معذوری لاحق ہو کرتی ہے (اور عقل کے نقصان کی یہ علامت ہے) کہ تم لعن و طعن زیادہ کرتی ہو اور کفران نعمت تمہارا شیوہ ہے مثلاً ایک عورت اگر دس برس ایک مرد کے پاس رہے اور وہ اس کی ہر قسم کی ناز برداری کرتا رہے۔ لیکن پھر ایک دن اگر مرد پر تنگی آجائے یا مرد عورت کو اس کے خلاف مزاج کوئی بات کہہ دے تو وہ (اس کی وہ سالہ خدمات و احسانات کو نظر انداز کرتے ہوئے) فوراً کہتی ہے کہ میں جب سے تیرے گھر آئی ہوں تجھ سے کوئی بھلائی نہیں دیکھی۔ ہاں اگر کوئی عورت اس سے بلند کردار اور اس قسم کی بد عادتوں سے کنارہ کش ہو تو اس کے لئے یہ (میراث و شہادت میں) کمی اس کا امتحان ہے تاکہ صبر کرے اور اس سے اس کے درجات بلند ہوں۔ پس تجھے خوشخبری ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: ردی مردوں اور ردی عورتوں میں سے عورت ردی ترین ہوتی ہے اور صالح مردوں اور صالح عورتوں میں سے مرد صالح ترین ہوتا ہے اور خداوند کریم نے (معاملہ شہادت میں) کسی عورت کو مرد کے برابر نہیں قرار دیا۔ مگر جناب فاطمہ الزہراءؑ کو کہ وہ اس معاملہ میں حضرت علیؑ کے برابر تھیں۔

(برہان)

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْنَ مَقْبُوضَةً ط

اور اگر تم سفر میں ہو اور تم کو کوئی لکھنے والا نہ مل سکے تو پس کوئی چیز گروی قبض کرنا (اچھا ہے)

فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا فُلْيُوا الَّذِي أُوْتِيتُمْ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ

پس اگر امین سمجھے تم میں سے ایک دوسرے کو تو پس ادا کرے وہ جس کو امین سمجھا گیا ہے اپنی امانت کو اور ڈرے

اللَّهُ رَبَّهُ ط وَلَا تَكُونُوا الشَّاهِدَةَ ط وَمَنْ يَكْتُفْهَا فَإِنَّهُ

اللہ سے جو اس کا پروردگار ہے اور نہ چھپاؤ گواہی کو اور جو اسے چھپائے گا پس اس کا

اِثْمٌ قَلْبُهُ ط وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿۱۸۳﴾ ع

دل گنہگار ہے اور خدا تمہارے اعمال کو جاننے والا ہے

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْنَ مَقْبُوضَةً ط اس سے پہلی آیت میں ادھار دینے وقت تحریر اور شہادت ہر دو کا تاکید حکم دیا گیا تھا اور اس مقام پر فرماتا ہے اگر سفر میں بامر مجبوری کسی کو ادھار دو اور کاتب دستیاب نہ ہو سکے تو اس سے اس کے بدلے میں کوئی چیز رہن کے طور پر رکھ لو اور یہی چیز تحریر و شہادت وغیرہ کے قائم مقام ہو جائے گی۔

فَإِنْ أَمِنَ۔ اگر کسی کو امین اور قابل اعتبار قرار دے کر نہ اس سے تحریر لی گئی ہے اور نہ رہن رکھوایا گیا ہے تو اس پر واجب ہے کہ اپنا حق امانت ادا کرے۔

وَلَا تَكُونُوا الشَّاهِدَةَ ط۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ جناب رسالت اکرم نے فرمایا۔ اگر کوئی شخص شہادت کو چھپائے، یا ایسی شہادت دے جس سے ایک مسلمان کا خون رائیگاں ہو جائے یا کسی مسلمان کا خون تلف ہو تو بروز محشر اس کا منہ سیاہ ہوگا اور نگاہ چشم تک اس کے سامنے سیاہی ہوگی۔ جس سے تمام اہل محشر اس کو پہچان لیں گے اور اگر کوئی حق کی شہادت دے تاکہ مسلمان کا حق زندہ ہو تو بروز قیامت اس کا چہرہ نورانی ہوگا اور تاج نگاہ اس کی روشنی ہوگی کہ تمام مخلوق اس کو پہچان لے گی۔

اور جناب رسالت اکرم سے مروی ہے کہ جھوٹی شہادت دینے والا ابھی تک شہادت سے فارغ نہیں ہوتا۔ کہ جہنم میں اس کی جگہ ریزہ ہو جاتی ہے۔

مسئلہ:- اس شہادت سے مراد ہے کہ حاکم شرع اگر شہادت طلب کرے تو انکار نہ کرنا چاہیے اور نہ غلط بیانی کرنی چاہیے حاکم جوہر کے سامنے مقدمہ لے جانا بھی حرام ہے اور اس کے سامنے شہادت دینا بھی گناہ ہے مگر یہ کہ بامر مجبوری ایسا کرنے پر آمادہ ہو جائے تو خدا غفور رحیم ہے۔

بَلِّغْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنْ تُبَدَّلُوْا اَمَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ

اللہ کے لئے ہے جو کچھ بھی آسمانوں اور زمینوں میں ہے اور خواہ تم ظاہر کرو وہ جو تمہارے دل میں ہے یا

تُخَفُّوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهٖ ۗ اَللّٰهُ ۙ فَيَغْفِرْ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبْ مَنْ يَّشَآءُ ۗ

اس کو چھپاؤ اس کا حساب تم سے لے گا پھر وہ بخشے جسے چاہے اور عذاب دے جسے چاہے

وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۲﴾ اَمِّنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهٖ

اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ایمان لایا رسول ساتھ اس کے جو نازل کیا گیا اس پر

مِنْ رَّبِّهٖ ۚ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ كُلٌّ اَمِّنٌ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۚ

اپنے رب سے اور مومنین (میں) سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتے اور کتابوں اور رسولوں پر

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۚ وَقَالُوْا سُبْحٰنَا وَاَطَعْنَا غُفْرٰنَكَ رَبَّنَا ۚ

(اور وہ کہتے ہیں) کہ فرق نہیں کرتے ہم (بلحاظ ایمان) درمیان کسی ایک کے اس پیغمبر میں سے اور انہوں نے کہا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی تیری بخشش چاہتے ہیں ہمارے پروردگار کو

شب معراج کی باتیں

بَلِّغْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ ۗ اَللّٰہ۔ اس آیت کے ماقبل کے ساتھ ربط کی وجوہات میں سے یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ چونکہ خدا نے اس

سورۃ مجیدہ میں فروعی احکام بیان فرمائے ہیں تو اب سورہ کو ذکر توحید اور وعظ و نصیحت اور اقراء جزا و سزا پر ختم فرما رہا ہے۔

جس طرح کہ ابتدا بھی ان ہی چیزوں سے ہوئی تھی۔

نیز یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ احکام شرعیہ بیان کرنے کے بعد یہ نیز یہ مقصود ہے کہ بیان کردہ احکام کی مہلانی تمہارے

لئے ہی ہے اور ان پر عمل کرنے کا فائدہ تمہیں ہی ہوگا ورنہ اللہ کو ان چیزوں کی احتیاج نہیں وہ آسمانوں اور زمینوں اور کلی

موجودات کا مالک ہے۔

مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ۔ دل کی باتوں کا حساب لینے کا مقصد یہ ہے کہ غلط عقیدہ کی خدا باز پرس کرے گا۔ چنانچہ تفسیر برہان میں

عیاشی سے اسی آیت کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جس شخص کے دل میں ان دو شخصوں

کی رائی کے دانہ کے برابر بھی محبت ہوگی تو خدا اس کو ہرگز ہرگز بہشت میں داخل نہ کرے گا۔

إِلَيْكَ الْمَصِيرُ ﴿٢٨٥﴾ لَا يَكْفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعًا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ

تیری طرف ہی بازگشت ہے۔ نہیں تکلیف دیتا خدا کسی نفس کو مگر اس کی طاقت کے مطابق اس کے کمائے ہوئے کا نفع

وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تَأْخُذْنَا إِن تَنِينَا ۖ أَوْ اخطأْنَا رَبَّنَا

اسی کے لئے ہے اور اس کا وبال بھی اسی کے اُدپر ہے۔ اسے پروردگار ہمارا ہمارا ہیں گرفت نہ کرنا اگر مجبور جائیں یا غلطی کو نہیں

وَلَا تَحِبُّ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا

اے رب نہ رکھ ہم پر بوجھ جس طرح رکھا تو نے ان پر جو ہم سے پہلے گزرے اے رب اور نہ

تُحِبِّلَنَا مَا لَاطَاقَةٌ لَّنَا بِهِ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۚ وَقِفْنَا وَقِفْنَا ۚ وَارْحَمْنَا ۚ

اٹھوا ہم سے وہ جس کی ہمیں طاقت نہ ہو اور معاف کر ہم کو اور بخشش ہیں اور رحم فرما ہم پر

أَنْتَ مُؤَلِّنَا فَالْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٨٦﴾

تو ہمارا مولا ہے پس ہماری مدد فرما کافر لوگوں پر

اَمَّنَ الشَّيْءُ - تفسیر برہان میں ایک حدیث طویل میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ - پوری آیت شب معراج جناب رسالت اکبر پر پیش کی گئی اور آپ نے اس کو قبول فرمایا۔ پس ارشاد قدرت ہوا۔ اَمَّنَ الشَّيْءُ سُوْلٌ یَّمَا اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَبِّہِ - یعنی رسول ایمان لایا ساتھ اس چیز کے جو اس پر اس کے رب کی طرف سے نازل ہوئی۔ تو جواب میں جناب رسالت اکبر نے اپنی اور اپنی امت کی طرف سے عرض کی۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلُّ اَمِّنَ بِاللّٰہِ - یعنی مومنین بھی ایمان لائے اور سب اللہ و فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ اور بلحاظ ایمان و تصدیق ان رسولوں میں فرق نہیں کرتے کہ بعض کو مانیں اور بعض کا انکار کریں اور سب نے خدائی فرمائشات کو سنا اور اطاعت قبول کی۔ پس جانب خدا سے آواز آئی کہ جنت اور مغفرت ان ہی کے لئے ہے پھر حضرت رسالت اکبر نے عرض کی غُفْرَانْکَ اَلْہِ اے پروردگار تیری بخشش چاہیے اور تیری طرف ہی بازگشت ہے۔ اس کے بعد ارشاد قدرت ہوا۔

لَا یُکْفُ اللّٰہُ اَلْہِ - یعنی خدا کسی نفس پر اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں رکھتا پس جو عمل خیر کریں گے تو وہ ان کی جزا پائیں گے اور جو عمل بد کریں گے وہ ان کی سزا جھیلیں گے۔ تو جناب رسالت اکبر نے عرض کی۔ اے پروردگار! ہمیں اس سے کچھ زیادہ مرحمت فرما۔ ارشاد ہوا کہ طلب کرو۔ جو چاہتے ہو پس عرض کی۔ رَبَّنَا لَا تَأْخُذْنَا إِن تَنِینَا ۖ أَوْ اخطأْنَا -

اے پالنے والے ہمیں نسیان یعنی بھول چوک اور خطا کا مواخذہ نہ کرنا تو ارشاد ہوا کہ گزشتہ امتیں جب یاد دلائے جانے کے بعد بھول جاتی تھیں تو ان پر میں عذاب کے دروازے کھول دیتا تھا اور تیری امت سے میں نے معاف کر دیا اور گزشتہ امتوں سے جب غلطی سرزد ہوتی تھی تو ان کو سزا دی جاتی تھی۔ اب تیری امت کی وجہ سے تیری امت پر سے میں نے یہ سزا اٹھا دی ہے پھر حضورؐ نے عرض کی کہ کچھ اور بھی دے۔ ارشاد ہوا کہ طلب کر دو کرنا ہے۔ پس عرض کی دُتُکَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا اَلَمْ یَعْنِ اِنَّ اللہَ ہِم پر وہ بار نہ رکھ جو گزشتہ امتوں پر رکھے گئے تھے پس خدا نے قبول فرمایا اور ارشاد ہوا کہ میں نے گزشتہ امتوں کے بوجھ تمہاری امت سے اٹھا لئے۔ مثلاً ان کی نمازیں سوائے مخصوص مقامات کے اور کہیں بھی قابل قبول نہیں ہوا کرتی تھیں خواہ وہ مقامات ان سے دُور بھی ہوتے تھے ان کو ضروری طور پر نماز کی ادائیگی کے لئے وہاں جانا پڑتا تھا۔ لیکن تمہاری امت سے یہ بوجھ میں نے اٹھالیا ہے وَ قَدْ جَعَلْتُ الْاَرْضَ حَنَکًا لَّامْتَنَکَ مَسْجِدًا وَ مَوَاطِئًا طَلُوعًا۔ اور تحقیق میں نے تمام زمین کو تیری امت کے لئے جائے سجدہ قرار دے دیا ہے جہاں وقت نماز ہو جائے وہاں پڑھ لیں اور اس کی مٹی کو میں نے باعث طہارت کر دیا ہے (اگر پانی دستیاب نہ ہو سکے تو تنیم کر کے نماز کو ادا کریں۔) گزشتہ امتوں کے لئے یہ تھا کہ جہاں بدن میں ان کو نجاست لگتی تھی اس جگہ کے کاٹے بغیر ان کا بدن پاک نہ ہوتا تھا اور آپ کی امت کیلئے پانی کو مطہر بنایا ہے کہ دھو دینے سے وہ مقام پاک ہو جائیگا جہاں نجاست لگی ہو پس یہ بوجھ بھی آپ کی امت سے اٹھالیا گیا ہے۔ (۳) گزشتہ امتیں اپنی قربانیاں گردلوں پر اٹھا کر بیت المقدس میں لاتی تھیں اور ان کی مقبولیت کی نشانی یہ تھی کہ میں ایک آگ کو بھیجتا تھا تو مقبول قربانی کو اٹھا لیتی تھی۔ پس ان کے لئے وہ خوشی کا باعث ہوتی اور جس کی قربانی کو آگ نہ کھاتی تھی۔ وہ ناکام ہو کر واپس آجایا کرتے تھے۔ لیکن تیری امت کی قربانیوں کی مقبولیت کا معیار تیری امت کے فقرا و مساکین کے پیٹ ہیں۔ پس جو قربانی ان تک پہنچ جائے اگر وہ مقبول ہوگی تو ہر روز قیامت اس کا بدلہ چند در چند دنگا اور اگر مقبول نہ بھی ہوگی تو ان سے دنیا کے عذاب کو تو برطرف کر ہی دوں گا۔

(۴) گزشتہ امتوں پر رات کی تاریکی اور دن کے وسط میں نمازیں واجب تھیں جو مشقت کا باعث تھیں اور تیری امت پر فرحت و نشاط کے وقتوں میں نمازیں واجب کی گئیں۔

(۵) گزشتہ امتوں پر پچاس نمازیں دن رات کے پچاس وقتوں میں واجب تھیں اور تیری امت پر صرف پانچ نمازیں واجب ہیں اور وہ کل اکاون رکعتیں ہیں اور ان کو ان پانچ نمازوں کا ثواب ان کی پچاس نمازوں کے برابر عطا کروں گا۔ (۶) گزشتہ امتوں میں یہ تھا کہ اگر وہ نیکی کی نیت کرتے تھے تو اس کا ثواب نہ تھا اور اگر نیکی کر لیتے تھے تو اس کا ثواب صرف ایک کے بدلے ایک تھا اور آپ کی امت اگر نیکی کا صرف ارادہ کرے تو اس کو ایک نیکی کا ثواب اور اگر نیکی کا عمل بھی کرے تو ایک کے بدلے دس گنا ثواب دوں گا۔

(۷) گزشتہ امتوں میں یہ تھا کہ اگر وہ وہ برائی کا ارادہ کرتے اور پھر اس پر عمل نہ کرتے تو اس کا بدلہ کچھ نہ تھا اور تیری امت

اے محمد! اگر میرے بندوں میں سے کوئی بندہ میری عبادت کرتے کرتے نڈھال اور بوسیدہ ہو جائے لیکن تمہاری ولایت کا اقرار نہ کرتا ہو تو اس کو نہ بخشوں گا جب تک کہ تمہاری ولایت کا اقرار نہ کرے گا۔ اے محمد! کیا تو ان کو دیکھتا چاہتا ہے؟ (یعنی باقی تیرہ معصومین کو) تو میں نے عرض کی! ہاں۔ پس مجھے خطاب ہوا کہ عرش کی دائیں جانب نگاہ کیجئے۔ پس میں نے دیکھا۔ تو علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ، علی بن الحسینؑ، محمد بن علیؑ، جعفر بن محمدؑ، موسیٰ بن جعفرؑ، علی بن موسیٰؑ، محمد بن علیؑ، علی بن محمدؑ

حسن بن علی اور حضرت مہدی ایک فضاے نور میں کھڑے ہو کر مصروف عبادت تھے اور حضرت مہدی ایک درخشاں ستارہ کی طرح ان سب کے وسط میں جلوہ افروز تھے۔ پس ارشاد باری ہوا۔ اے محمد! یہ سب میری طرف سے حجت ہوں گے اور وہ تیری (مظلوم) عزت کا بدلہ لینے والا ہوگا۔ مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم کہ وہ میرے دوستوں کے لئے حجت و اجبہ اور میرے دشمنوں سے انتقام لینے والا ہوگا تفسیر مذکور میں ہے کہ اس روایت کو بعض مخالفین نے بھی نقل کیا ہے۔ (باختصار)

اسی تفسیر میں مروی ہے کہ ایک یہودی نے حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے دریافت کیا کہ شب معراج تمہارے نبی سے پہلی کلام کون سی ہوئی؟ تو آپ نے فرمایا کہ یہ آیت **اَمَّا الْيَوْمَ يَكُنِ الْمَسْئِلُ لَكَ** فرمایا کہ یہ آیت **اَمَّا الْيَوْمَ يَكُنِ الْمَسْئِلُ لَكَ** آپ نے فرمایا کہ اس کے بعد یہ آیت جو کہ قول رسول تھا **وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلَكًا مِّنْهُ** اللہ یہودی نے کہا میری مراد یہی نہیں آپ نے فرمایا کہ پوشیدہ باتوں کو رہنے دو۔ تو یہودی نے کہا کہ اگر آپ نہیں بتا سکتے تو آپ وہ نہیں؟ آپ نے فرمایا اگر تجھے خواہ مخواہ پوچھنا ہے تو سن۔ جب جناب رسالتؐ والیس تشریف لارہے تھے تو ابھی حجابوں کی منازل میں تھے اور مقام جبریل تک نہ پہنچے تھے کہ پیچھے سے ایک ملک نے صدایا **يَا اَحْمَدُ** آپ نے کہا۔ لبیک۔ فرشتہ نے عرض کی کہ اللہ سلام کے بعد فرماتا ہے کہ سید دلی کو سلام کہنا۔ آپ نے پوچھا سید دلی کون ہے؟ تو ملک نے کہا کہ وہ علی بن ابی طالب ہی تو ہے۔ یہ سن کر یہودی بولا بے شک۔ خدا کی قسم۔ میں نے اپنے والد کی کتاب میں ایسا ہی پڑھا ہے اور وہ یہودی حضرت داؤد کی اولاد سے تھا (باختصار)

شب معراج نو چیزیں جناب رسالتؐ کی امت سے اٹھائی گئیں ہیں انکو ان چیزوں پر گرفت نہ ہوگی۔ چنانچہ جناب رسالتؐ نے فرمایا **رَفَعْنَا عَنْ أُمَّتِي تِسْعَةَ أَشْيَاءَ**۔ میری امت سے نو چیزیں اٹھائی گئی ہیں اور وہ یہ ہیں (۱) انبیاء (۲) خطباء (۳) لاعلمی (۴) بے طاقی (۵) جو کام ظالم کے ظلم و جبر کے ڈر سے کیا ہو (۶) جو کام حالت اضطراب میں ہو جائے (۷) خال نیک یا بد لینا (۸) توحید کے بارے میں دوسرے بشر طے کہ ان کو کواہت کی نگاہ سے دیکھے (۹) حد بشرطیکہ اس کا استعمال نہ کرے۔ جناب رسول خدا سے مروی ہے کہ جو شخص سورہ بقرہ کی پہلی چار آیتیں اور آیتہ الکرسی تا **فِيهَا خُلُودٌ**۔ اور آخری تین آیتیں **بَلِّغْهُ مَا فِي الشُّمُوسِ** سے تا آخر پڑھے گا تو وہ اپنی جان و مال میں کوئی ناپسندیدہ بات نہ دیکھے گا اور اس کے قریب شیطان نہ آئے گا اور اس کو قرآن فراموش نہ ہوگا۔

نُكْرًا۔ سورہ بقرہ کی آخری آیتیں پوری سورت کا تمہ یا نتیجہ ہیں کیونکہ سورہ مذکورہ میں متعدد احکام قصص و واقعات اور مختلف خبریں ذکر ہوئی ہیں آخر میں بطور تمہ کے یہ اعلان نہایت موزوں تھا کہ رسول اور ایمان والوں کو اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی کسی شئی پر ذرہ بھر بھی نکرہ یا شبہ نہیں بلکہ وہ ہر نازل شدہ شئی پر دل و جان سے ایمان رکھتے ہیں نیز ابتداء سورہ میں خود خدا رکھنے والے اور اللہ کی جانب سے نازل شدہ تمام چیزوں پر ایمان لانے والے متقی کے مقدس لقب سے یاد کئے گئے تھے اور اس کے بعد خدا نے کفار اور منافقین کے اسرہ طابع اور عادات و کردار کا تذکرہ کر دیا تھا اور بنی اسرائیل پر اپنی نعمات کا نازل اور ان کا انکار اور پھر ان پر عذاب کی سختی وغیرہ کا تذکرہ فرمایا تھا اب اختتام سورہ پر ایک دفعہ پھر بطور تخلص و تذکرہ کے ارشاد فرما رہا ہے کہ رسول اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے اپنے موقف ایمانی پر ثابت قدم ہیں اور اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی ہر چیز پر وہ ایمان رکھتے ہیں اور اپنی جگہ ضروریات اللہ سے مانگتے ہیں اور مشکلات کا حل بھی اسی سے چاہتے ہیں

اللہ فذلکہ المعنی ہے نتیجہ (منہ)

تفسیر سورہ آل عمران

یہ سورہ مدینہ ہے اور اس کی کل آیات دو سو ہیں۔
اور بسم اللہ کو شامل کر کے کل تعداد دو سو ایک ہوگی۔

فضائل و خواص: یہ دل امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جو شخص سورہ بقرہ اور سورہ

آل عمران کو پڑھے گا تو بددشتریہ دونوں سورتیں اس کے سر پر مثل بادل کے سایہ نکلن ہوں گی۔
(۲) جناب رسالت اکبر سے منقول ہے کہ جو شخص سورہ آل عمران کو صبح کے دن پڑھے گا تو غروب شمس تک اس پر
اللہ کی رحمت برستی رہے گی اور ملائکہ اس کے لئے استغفار کرتے رہیں گے۔

(۳) نیز آپ سے مروی ہے کہ جس عورت کو حمل نہ ہوتا ہو اس سورہ مبارکہ کو زعفران سے لکھ کر اس
کے گلے میں ڈالا جائے تو اسے حمل ہوگا اور اگر کسی کج رویہ درخت پر جو پھسل گرا دیتا ہو یا اس کے پتے
گر جاتے ہوں اگر لکھ کر یہ سورہ لٹکائے تو اس کے پھسل پتے گرنے سے ٹک جائیں گے۔
(بازن حنبلہ)

(۴) نیز حضرت صادق علیہ السلام سے مروی ہے اگر تنگدست آدمی اس کو لکھ باندھے تو اس کی روزی
سراخ ہوگی اور خداوند کریم اس کو رزق وسیع عطا فرمائے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اس کے نام سے جو رحمن درحیم ہے (شروع کرتا ہوں)

الْم ۱ اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ

اللہ کہ اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں جو حئی و قیوم ہے اتاری اس نے آپ پر کتاب

بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرَةَ وَالْاِنْجِيلَ ۝ ۳ مِنْ

برحق جو تصدیق کرنے والی ہے (ان کتابوں) کی جو اس سے پہلے ہی اور آمارا تورات و انجیل کو اس سے پہلے لوگوں کی

قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِآيٰتِ

ہدایت کے لئے اور آمارا فرقان کہ تحقیق جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ کی آیات

اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۝ وَاَللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُوْا نِقَامٍ ۝ ۴ اِنَّ اللّٰهَ

سے اُن کے لئے عذاب ہے سخت اور اللہ غالب اور بدلہ لینے والا ہے تحقیق اللہ پر

ثَ الْاٰخِ الْقَيُّوْمُ ۝ (تفسیر مجمع البیان) ابن عباس سے مروی ہے کہ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ اسم اعظم ہے حضرت اصف بن برخیا نے

اسی کے ذریعہ سے دعا مانگ کر بقیس کا تخت ملک سبا سے چشم زدن میں حضرت سلیمان کے لئے حاضر کیا تھا۔

وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۝ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ قرآن ساری کتاب ہے اور فرقان سے مراد وہ آیات ہیں جو حکم اور واجب العمل ہیں۔

اسم اعظم شیخ عباس قمی قدہ نے مفاتیح الجنان میں ذکر کیا ہے جس کی اصل عبارت کا ترجمہ یہ ہے۔ سید اجل علی خان

شیرازی نے کلم طیب میں نقل کیا ہے کہ خدا کا اسم اعظم وہ ہے جس کی ابتداء لفظ اللہ اور انتہا لفظ ھو ہے

اور اُن کے حروف پر نقطے نہیں اور اس کا معنی نہیں بدلتا۔ خواہ اعراب دیا جائے یا نہ دیا جائے اور یہ قرآن مجید کی پانچ آیتوں میں ہے

جو پانچ سورتوں میں ہے بقرہ آل عمران نساء طہ اور تغابن شیخ مغربی نے کہا ہے کہ جو شخص ان پانچ آیات مبارکہ کو ہر روز گیارہ مرتبہ

اپنا درد ہلائے تو اس کی ہر کلی و جزئی مشکل جلدی سے آسان ہوگی۔ انشاء اللہ اور وہ پانچ آیتیں یہ ہیں۔

۱) اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ

التَّوْرَةَ وَالْاِنْجِيلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لِيُجَبِّعَنَّكُمْ اِلٰی

يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا سَآئِبَ فِيْهِ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنْ اللّٰهِ حَدِيْثًا ۝ ۲) اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی

لَا يَخْفَى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۝ هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ

کوئی چیز پوشیدہ نہیں نہ زمیں میں اور نہ آسمان میں اور یہ وہی ہے جو تمہاری صورتیں

فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

رحم مادر میں جیسی چاہتا ہے بناتا ہے کوئی لائق عبادت نہیں مگر وہی جو غالب حکمت والا ہے

(۵) اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَعَلَىٰ اَللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ۔

شان نزول

تفسیر مجمع البیان میں منقول ہے کہ سورہ آل عمران کی ابتدائی اسٹی سے کچھ زائد آیات اہل بخران کے وفد کے متعلق نازل ہوئیں جو کہ سامعہ سوار تھے اور جناب رسالتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے ان کے سرگرمہ تین آدمی تھے ایک عبدالمسیح جو ان کا امیر اور صاحب رائے تھا۔ دوسرا ایہم جو ان کا بزرگ تھا اور تیسرا ابو حارثہ بن علقمہ جو ان کا پادری اور مذہبی پیشوا تھا اور بہت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ روم کی حکومت میں اس کے علم و اجتہاد کے پیش نظر اس کا بہت کافی وقار قائم تھا۔ یہ لوگ بصورت وفد داخل مدینہ ہوئے اور جب مسجد نبویؐ میں پہنچے تو اس وقت حضورؐ نماز عصر سے فارغ ہو چکے تھے یہ لوگ نہایت فاخرہ اور قیمتی لباس میں ملبوس تھے صحابہؓ میں سے جن لوگوں نے ان کو دیکھا ہے کہتے ہیں کہ ان جیسا وفد ہم نے آج سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ جب ان کی نماز کا وقت آیا تو ناقوس بجانے لگے اور پھر اٹھ کر مسجد نبویؐ میں انہوں نے نماز کا ارادہ کیا۔ صحابہ کرام کو مسجد نبویؐ میں ان کا یہ فعل ناگوار گذرا چنانچہ بارگاہ رسالتؐ میں انہوں نے اپنے احساسات جملائے تو آپؐ نے فرمایا۔ کہ انہیں اپنی حالت پر چھوڑ دیجئے۔ پس انہوں نے نماز مشرق کی طرف منہ کر کے پڑھی۔

اس کے بعد عاقب جس کا نام عبدالمسیح تھا اور اسید جس کا نام ایہم تھا۔ دونوں نے جناب رسالتؐ سے گفتگو کی۔ انہوں نے دونوں کو اسلام کی دعوت دی انہوں نے کہا کہ ہم پہلے سے مسلمان ہیں آپؐ نے فرمایا تم جھوٹے ہو کیونکہ تم اللہ کے لئے اولاد کے قائل ہو۔ صلیب کی عبادت کرتے ہو اور سور کھاتے ہو۔ حالانکہ اسلام ان باتوں سے منع کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر اللہ کے لئے بیٹا نہیں ہے تو فرمائیے کہ حضرت عیسیٰ کا باپ کون ہے؟ اور اس بات پر وہ سب کے سب بول اٹھے آپؐ نے چند عقلی دلیلیں پیش کیں جن میں سے وہ ایک کا بھی جواب نہ دے سکے۔ اور تسلیم کرتے گئے چنانچہ آپؐ نے فرمایا:-

(۱) کیا تم مانتے ہو کہ بیٹا ہمیشہ باپ کے مشابہ ہوا کرتا ہے؟ کہنے لگے کہ ہاں؛ فرمایا کیا تم یہ بھی مانتے ہو کہ خدا تعالیٰ یعنی زندہ ہے اور اس کے لئے موت نہیں ہے۔ حالانکہ عیسے پر فنا آئے گی؟ کہنے لگے کہ ہاں!

(۲) پھر فرمایا کہ کیا تمہیں معلوم ہے؟ کہ خدا قیوم یعنی ہر شے کا مدبر و محافظ و رزاق ہے۔ کہنے لگے۔ ہاں بے شک ایسا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا عیسے بھی ان چیزوں میں سے کسی چیز کا مالک ہے۔ کہنے لگے کہ نہیں۔

(۳) آپ نے فرمایا کہ کیا تم کو معلوم ہے کہ خدا پر آسمانوں اور زمینوں کی چیزوں میں سے کوئی چیز مخفی نہیں؟ کہنے لگے ہاں ایسا ہی ہے۔ فرمایا کیا عیسے کو بھی ان سب چیزوں کا علم ہے سوائے ان چیزوں کے جو اللہ نے ہی بتلائی ہوں کہنے لگے کہ نہیں۔
(۴) پھر فرمایا۔ کیا تم قائل ہو کہ حضرت عیسے کی صورت رحم مادر میں خدا نے جس طرح چاہی بنائی۔ حالانکہ خدا خود کھانے پینے اور حدود سے پاک ہے؟ کہنے لگے۔ ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔

(۵) آپ نے فرمایا کہ کیا تمہیں علم ہے کہ عیسے کی والدہ باقی عورتوں کی طرح حاملہ ہوئیں اور پھر عام عورتوں کی طرح اس کا وضع حمل ہوا۔ اور عام بچوں کی طرح ان کی تربیت ہوئی وہ کھاتے پیتے تھے حالات ضروریہ ان کو لاحق تھے۔ وہ کہنے لگے کہ ہاں درست ہے تو آپ نے فرمایا کہ تمہارا دعویٰ پھر کہاں گیا۔ بالآخر وہ سب لاجواب ہو کر خاموش ہو گئے پس خداوند کریم نے آل عمران کی اسٹی سے کچھ زائد آیتیں انہی کے بارے میں نازل فرمائیں۔

۱۱۔ یہ چھ آیتیں سورہ مبارکہ آل عمران کے مضامین کے تفصیلی بیانات کا اجمال ہیں مثلاً توحید، ذکر انوار علیہ السلام اور تورات و انجیل کے نزول کا ذکر۔ یہود و نصاریٰ کے ایرادات کا ملخص جواب ہے کفار کے لئے عذاب کی پیش کش اور انتقام کا ذکر۔ جنگ اُحد کے تفصیلی بیان کا خلاصہ کہا جاسکتا ہے اور ارحام میں بچوں کی تصویر کشی کا ذکر تولد مریم۔ پیدائش حضرت یحییٰ اور ولادت حضرت عیسے علیہم السلام کے تفصیلی قصوں کا ملخص ہے۔

(۱۲) تنزیل۔ کسی شے کو تدریجاً اتارنا اور انزال ایک دفعہ نازل کرنا۔ اسی وجہ سے قرآن کے لئے تنزیل کا لفظ استعمال فرمایا۔ اور تورات و انجیل کے لئے انزال کا لفظ استعمال کیا۔ لیکن بعض پیغمبر جن میں تدریج اور مجموعیت دونوں کا لحاظ رکھا جاسکتا ہے۔ ان پر دونوں لفظیں استعمال ہو سکتی ہیں۔ مثلاً بارش کو اگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس پر انزال استعمال ہوگا اور اگر اس کی تدریج کا لحاظ کیا جائے تو تنزیل کا استعمال بھی جائز ہے اور اسی کے پیش نظر قرآن میں اس کے لئے دونوں لفظیں استعمال کی گئی ہیں۔

(۱۳) تورات عبرانی زبان کا لفظ ہے اور اس کا معنی ہے شریعت اور انجیل کے متعلق بعض کہتے ہیں یونانی ہے اور بعض نے اسے فارسی کلمہ کہا ہے اور اس کا معنی ہے بشارت (خوشخبری)

(۱۴) انجیلیں نصاریٰ کے پاس کافی ہیں اور نزول قرآن کے وقت بھی چار مشہور انجیلیں، یوہود تھیں جو بولیس۔ بطرس۔ متی اور یوحنا کی طرف منسوب تھیں۔ پس انجیل صیغہ جمع کی بجائے لفظ مفرد انجیل کا استعمال ۱۲ امر پر دلالت کے لئے ہے کہ انہوں نے کلام خدا میں تحریف سے کام لیا ورنہ دراصل انجیل ایک تھی اور تحریف کے ہاتھ نے اسے بڑھا کر چار یا زیادہ تک پہنچا دیا۔

(۱۵) خداوند کریم نے شکم مادر میں بچے کی تصویر کشی اپنی طبعاً منسوب فرمائی حالانکہ اسباب ظاہریہ کو بچے کی تصویر میں دخل ہے جیسا کہ علم الابدان میں اس کی تصریح موجود ہے اور خداوند کریم نے دنیا کے جملہ امور کو اسباب و علل سے وابستہ کر رکھا ہے اور اس کے خلاف ہونے کا نام ہی تو معجزہ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بچے کی تصویر کشی شکم مادر میں اگرچہ اسباب مادیہ اور علل ظاہریہ کی طرف سے ہے

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ

وہ وہی ہے جس نے نازل فرمائی آپ پر کتاب۔ اس میں کچھ آیتیں محکم ہیں جو اصل

الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ

کتاب ہیں اور کچھ متشابہ ہیں لیکن جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے تو وہ پیچھے پڑتے

فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا

ہیں ان کے جو اس میں سے متشابہ ہیں بغرض فتنہ اور بغرض (من مافی) تاویل کے حالانکہ کوئی

يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ

نہیں جانتا اس کی صحیح تاویل مگر اللہ اور وہ لوگ جو راسخ ہیں علم میں۔ حالانکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ سب

مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ⑤

(محکم ہوں یا متشابہ) ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور نہیں نصیحت لیتے مگر صاحبان عقل

لیکن علل و اسباب میں اس قسم کی انقلابی کیفیات اور فعلی و انفعالی تحریکات اسی فیاض مطلق کی طرف سے عنایت شدہ ہیں پس خدا سب حقیقی ہے اور یہ اسباب ظاہر یہ ہیں اور یہ دونو ایک دوسرے کے طول میں واقع ہیں لہذا دونوں کی طرف نسبت صحیح ہے۔ ہاں اگر یہ ایک دوسرے کے عرض میں اور مقابلہ میں واقع ہوتے تو تضاد لازم آتا۔

محکمات و متشابہات کا بیان

مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ الْخ۔ محکم و متشابہ کے متعلق چند اقوال ہیں (۱) محکم وہ ہے جس کا معنی و مطلب بالکل ظاہر اور صاف ہے نہ اس میں کوئی اجمال ہو اور نہ کوئی گنجلک ہو اور متشابہ وہ ہے جس کی مراد ظاہر نہ ہو اور مطلب واضح نہ ہو بلکہ اس کے سمجھنے کے لئے کافی غور و غوض کی ضرورت ہو۔

(۲) محکم سے مراد ناسخ اور متشابہ سے مراد منسوخ ہے اور امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی ایک روایت میں وارد ہے کہ منسوخ آیتیں متشابہات سے ہیں (۳) محکم وہ ہے جس کی تاویل کا صرف ایک ہی رخ ہو اور اس سے صرف ایک ہی مطلب نکل سکتا ہو اور متشابہ وہ ہے جس میں دو یا اس سے زیادہ معانی کا احتمال ہو (۴) محکم وہ ہے جس کی تاویل معین کی جاسکتی ہو اور متشابہ وہ

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ

اے ہمارے پروردگار! نہ پھیر ہمارے دلوں کو بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت فرمائی اور غایت فرما ہمیں

رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۵﴾ رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ

اپنی رحمت تحقیق تو ہی تو عطا کرنے والا ہے اے رب تحقیق تو اکٹھا کرنے والا ہے لوگوں کو

لَا رَيْبَ فِيهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِعَادَ ﴿۶﴾

اس دن کہ جس میں شک نہیں۔ بے شک اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

ہے جس کی تاویل کا تعین نہ ہو سکتا ہو۔ سوال یہ خداوند کریم نے جب قرآن مجید عام مخلوق کی ہدایت کے لئے نازل فرمایا ہے تو چاہیے تھا کہ سارا قرآن حکم نازل کیا جاتا تاکہ ہر ایک اس کا مطلب آسانی سے سمجھ سکتا۔ لہذا امتشا بہ نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ جواب: آیات متشابہات نازل کرنے کی متعدد وجوہات ہو سکتی ہیں۔ (۱) اگر سب کا سب حکم ہوتا تو لوگوں کی قرآنی علوم سے دلچسپی ختم ہو جاتی صرف نقل پر اکتفا کر لی جاتی۔ اور غور و خوض کی طرف توجہ نہ ہوتی۔

(۲) عام خطوط و مکاتیب میں یہی دستور ہے کہ اگر عبارت سلیس اور مطلب واضح ہو تو صرف ایک دفعہ اس کا سرسری مطالعہ کر کے رکھ دیا جاتا ہے اور دوسری مرتبہ اس کو دیکھنے کے لئے جی تک نہیں چاہتا اور اگر اس میں ذرہ گنجشک ہو تو اس کا بار بار غور و خوض اور پورے دھیان سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور قرآن چونکہ صرف ایک وقت یا ایک دور کے لوگوں کے لئے نہ تھا بلکہ تباقیامت تمام آنے والی نسلوں کے لئے بھی باعث ہدایت تھا۔ اگر بالکل سلیس اور عام فہم ہوتا تو اس کی مہجیت و نصارت تھوڑے دنوں تک محدود ہو کر رہ جاتی اور اس کی جاذبیت کے محدود عرصہ کے اندر ناپید ہو جانے سے طبیعتوں میں بار بار شوق تلاوت نہ رہتی۔ اور یہ چیز قرآن مجید کی قیامت تک کی طویل زندگی کی راہ میں سد راہ ہو جاتی۔ پس خدا علیم و حکیم نے اس مقدس کلام میں ایسا رنگ بھر دیا۔ کہ جوں جوں زمانہ طول پکڑتا جائے اس کی طرف طبائع کا رجحان روز افزوں ترقی کرتا جائے۔

(۳) اگر سب آیات حکمت ہوتیں اور اس کا مطلب آسانی سمجھ میں آسکتا تو قرآن فہمی میں طبائع کو سرور حاصل نہ ہو سکتا۔ کیونکہ جو چیز بلا تعب و مشقت حاصل ہو اس کے حصول پر اتنی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ جتنی کہ مشقت و محنت کے بعد حاصل ہونے والی شئی پر خوشی حاصل ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ جس چیز کی توقع ہوتی ہو اور توقع کے مطابق کامیابی حاصل ہو جائے۔ تو وہ کامیابی اتنی موجب سرور نہیں ہوتی۔ جتنی کہ بعض مطالب و مقاصد پر خلافت توقع کامیابی حاصل ہونے سے ہڑا کرتی ہے چنانچہ ابو علی سینا

(۳) شیخ رئیس) کا قول ہے کہ جب مطلب کے سمجھنے کے لئے مجھے شب و روز کی محنت شاقہ برداشت کرنی پڑے جس سے دماغ پر کافی بوجھ ڈال کر اس کو حل کرنا ضروری ہو اور بالآخر اس مقصد میں کامیابی و کامرانی مل جاتی ہے تو جہاں ایک طرف تمام ذہنی کادشوں کا شیریں و خوش مزہ پھل میسر آ جانے سے تمام دماغی کوفتیں ختم ہو جاتی ہیں وہاں دوسری طرف طبیعت میں اس قدر سرور و فرحت حاصل ہوتی ہے کہ شاید زمین و آسمان کے مابین کی حکومت و شاہی طے سے بھی وہ خوشی حاصل نہ ہو سکتی؟

(۴) جو چیز آسانی سے دستیاب ہو جائے اس کی نہ اہمیت ملحوظ رہتی ہے اور نہ اس کی قدر و قیمت ہوتی ہے بخلاف اس کے جو چیز کسی قدر محنت طلب ہو اس کی اہمیت زیادہ اور قدر و منزلت بلند ہوتی ہے۔

(۵) قرآن مجید قیامت تک کے لئے معجزہ ہے اور ہر مفسر اپنی ذہنی منزل کے پیش نظر اس سے مطالب تک رسائی حاصل کرتا ہے ہر بعد میں آنے والا ایسے نکات و رموز پر مطلع ہوتا ہے جن تک گذشتہ مفسرین نہ پہنچ سکے تھے اور یہی وجہ کہ علمائے کرام انتہائی غور و فکر سے مطالب قرآنیہ حاصل کرنے کے بعد یہ دعوے نہیں کر سکتے کہ ہم اس کی کنہ و انتہا تک پہنچ گئے اور مطالب قرآنیہ تک ہمیں کما حقہ دست رس حاصل ہو گئی اور جس قدر رموز قرآنیہ میں خوض کرتے ہیں اسی قدر طبیعت میں آگے بڑھنے کا جذبہ تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے اگر سارا قرآن حکم آیات پر مشتمل ہوتا تو قرآن مجید میں تدبر و تفکر کی راہیں مسدود ہو جاتیں۔ پس یہ بھی قرآن کا ایک معجزہ ہے کہ تیرہ سو سال سے ہر دور میں علمائے اعلام نے اپنی توجہات خاصہ کو قرآنی مطالب کے استنراج پر وقت رکھا اور اس بحر ذخار سے نایاب موتیوں کی دولت حاصل کی اور بالآخر ان کو ناپید نہ کر سکے اور یہ سلسلہ قیامت تک باقی رہے گا۔

(۶) قرآن پاک میں محکمات و مشابہات ہر دو قسم کی آیات کو نہایت موزونیت و مناسبت سے خلاق عالم نے ترتیب دیا۔ تاکہ صرف مشابہات کو دیکھ کر معمولی قابلیت کے انسان اس کے مطالب سمجھنے سے مایوسی کا شکار نہ ہو جائیں اور صرف محکمات کو ملحوظ رکھ کر سنجیدہ طبائع اور وقت پسند مزاج اس کو سہل و سلیس قرار دے کر سرے سے نظر انداز کرنے پر آمادہ نہ ہو جائیں پس ہر مزاج و طبع کے انسانوں کی جاذبیت کے لئے ذاتِ علیم و حکیم نے ایک ایسا مکمل و منظم کلام بھیجا جس سے ہر مزاج اور طبیعت کا انسان اپنی حیثیت کے مطابق مطلب تک رسائی حاصل کر سکے اور حسبِ لیاقت اس کی شیرینی سے بہرہ اندوز ہو کر اپنے دامن کو گوہرِ مراد سے چڑ کر سکے۔ تاکہ قرآن مجید ہر دور میں ہر قسم کے مزاج کے انسانوں کے لئے جاذبِ طبع ہو کر مرکزِ التفات رہے۔

(۷) محکم و متشابہ کی تقسیم کو ذاتِ رب العزت نے مسلمانانِ عالم کے لئے ایک امتحان گاہ قرار دیا تاکہ معلوم ہو کہ تسلیم کس کو ہے اور عناد کس میں ہے؟ اور حکم فرمادیا کہ محکمات کی پیروی کریں اور ان کو چھوڑ کر اپنی نظریاتی غلطیوں میں آیاتِ متشابہات کی آڑ لے کر راہِ گمراہی اختیار نہ کریں۔ چنانچہ راسخین فی السلم کی مدح فرمائی کہ یہ لوگ تسلیم دے رہے ہیں اور محکم و متشابہ پر کلیتہً

ایمان رکھتے ہیں اور دوسروں کی مذمت فرمائی کہ جن لوگوں کے دلوں میں کجی اور کھوٹ ہے وہ آیاتِ محکمات کو نظر انداز کر کے خواہ مخواہ فتنہ پردری کے لئے متشابہ آیات سے غلط طور پر مطلب براری کے درپے ہوتے ہیں۔

(۸) بحوالہ احتجاج طب سہی جناب امیر المومنین علیہ السلام سے ایک حدیث میں مروی ہے جس کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ خداوند کریم کو علم تھا کہ لوگ قرآن مجید سے من مانے مطالب نکال کر اس کے احکام میں تغیر پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ لہذا اس نے اپنے کلام کو تین حصوں میں منقسم فرمادیا۔ ایک قسم تو ایسی ہے کہ اس کو عالم و جاہل یکساں طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ دوسری قسم ایسی ہے کہ جن کے ذہن صاف ہیں لطیف اور تمیز صحیح ہے اور خدا نے اس کے سینے میں علم کی خوبیوں کو سمجھنے کے لئے کھول دیئے ہیں۔ پس وہی سمجھتے ہیں۔ اور تیسری قسم وہ ہے جس کو خدا اور اسخوں فی العلم کے علاوہ اور کوئی نہیں سمجھ سکتا اور یہ اس لئے کیا کہ خدا کو معلوم تھا کہ باطل پرست طبقہ میراث رسول پر غاصبانہ تصرف و قبضہ کرے گا۔ پس ان کو اس قسم کے غلط اقدامات کرنے کے باوجود علم قرآن کے دعوئے کی جرأت نہ ہو سکے۔ بلکہ جب بھی ان کے سامنے علم کتاب کے متعلق کوئی سوال پیش آئے تو جو لوگ درحقیقت عالم قرآن اور اللہ کے سچے ولی ہیں۔ ان کو مجبوراً ان کے دروازہ پر جبہ سائی کرنا پڑے (جس سے حقیقی وارث قرآن اور غلط دعوئے دار کے درمیان فرق کرنا آسان ہو)۔ پس خداوند کریم نے قرآن مجید میں آیات متشابہات نازل فرما کر عوام کے سامنے علماء کے فضل کا معیار قائم فرمادیا اور باطل کے مقابلہ میں اس کو صداقت کا مینار معتبر کیا۔ اگر قرآن کی آیات سب محکمات ہوتیں تو ہر مسند رسول کا تابعین عالم قرآن کہلاتا اور سچے و جھوٹے کی تمیز نہ ہو سکتی۔

سوال۔ ایک مقام پر خداوند کریم نے تمام قرآن کو محکم بتایا ہے چنانچہ فرماتا ہے۔ **الْكِتَابُ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ** (یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات محکم ہیں اور دوسرے مقام پر تمام قرآن کو متشابہ بتایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ **اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْإِنْشَادِ كِتَابًا مُتَشَابِهًا**۔ (تو جملہ) اللہ نے نازل فرمائیں سب سے اچھی باتیں وہ کتاب متشابہ ہے) اور اب یہاں ارشاد ہو رہا ہے کہ نہ سب آیات محکمات ہیں اور نہ سب کی سب متشابہ ہیں بلکہ بعض محکم اور بعض متشابہ ہیں۔

جواب۔ جس مقام پر پوری کتاب کو محکم بیان فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کے معانی میں وہ پختگی اور اس کے مطالب میں وہ سنجیدگی ہے جس میں تاقیامت کوئی خلل نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس کے دلائل و براہین اس قدر ٹھوس اور مضبوط ہیں کہ تاقیامت ناقابل تردید ہیں اس کے اوامر و نواہی میں وہ مصالح و مفاسد ملحوظ ہیں جو اوامر خلقہ اور ازمانہ متعادتہ میں اذہان متفرقہ کی عیب جوئی سے بالاتر ہیں اور تاقیامت ناقابل تنسیخ و ترمیم ہیں۔ اس کے قصص و واقعات ایسے حقائق پر مبنی ہیں کہ علما کتب سابقہ اور ماہرین آثار متقدمہ اس کو غلط بیانی سے نسبت نہیں دے سکتے آئندہ کی خبریں اس قدر صحیح اور مبنی برحقیقت ہیں کہ حرف بہ حرف ان کے مطابق واقع ہونے کی کسی کو مجال انکار نہیں۔ گویا ہر لحاظ اور ہر حیثیت سے ہر دور ہر زمانہ اور ہر طبقہ کے انسانوں کے لئے اس کی پختگی و مضبوطی ناقابل انکار حقیقت ہے اس لئے فرمایا کہ اس کتاب مقدس کی آیات محکم ہیں۔

اور جس مقام پر فرمایا کہ یہ کتاب متشابہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آخر تک حسن و صداقت، درستی و صحت

پختگی مضبوطی اور بے عیب ولا ریب ہونے میں اس کتاب کی تمام آیات ایک دوسری سے ملتی جلتی ہے اور ایک ہی جیسی ہیں جس طرح کہ ایک مقام پر ارشاد فرماتا ہے کہ اگر یہ قرآن غیر اللہ کا کلام ہوتا تو اس میں کافی اختلاف پایا جاتا۔ یعنی بعض پختہ بعض غیر پختہ۔ کچھ حصہ مطابق واقع کچھ خلاف واقع اور کہیں فصاحت و بلاغت۔ کہیں عامی خطابات۔ غرضیکہ تفاوت اور تنہافت کا ایک مرقع ہوتا۔ لیکن چونکہ خالق کا کلام ہے لہذا اس کی سب آیات ایک جیسی ہیں۔ اس میں کہیں نہ کمزوری ہے نہ غلطی، نہ جائے تردید ہے نہ مقام ترمیم۔ اور یہی اس کے خدائی کلام ہونے کی اہل دلیل ہے۔

پس معلوم ہوا کہ تمام اوصاف حسنہ اور خصالی حمیدہ کی جامعیت میں قرآن کی تمام آیات ایک دوسری کے متشابہ اور ایک جیسی ہیں اور اسی لحاظ سے تمام کا تمام محکم اور مقنع ہے اس میں کوئی رخنہ یا کمزوری نہیں۔ لیکن مطالب کی سہل بیانی اور دقت طلبی میں اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سہل جس کو ہر ایک سمجھ سکے پس وہ اس اعتبار سے محکم ہے اور دوسری وہ جس کو سمجھنے کیلئے بلند ذہن و ذکا اور فہم رسا چاہیے یعنی بعض تک علماء کی رسائی ہو سکتی ہے اور بعض کا حل راسخون فی العلم کی رہبری کا مہر ہون منت ہے۔ تفسیر برہان میں کافی ہے کہ آیات و محکمات کی تاویل حضرت امیر المومنین علیہ السلام اور باقی ائمہ طاہرین اور آیات متشابہات کی تاویل فلاں فلاں اور فلاں فلاں ہیں اور **فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ الْجَنَّةَ** سے مراد ان کے ساتھی اور ان سے دوستی رکھنے والے لوگ ہیں۔

الرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ

روایات اہلبیت علیہم السلام میں تواتر سے ثابت ہے کہ رسول اللہ کے بعد راسخین فی العلم سوائے اہلبیت عصمت کے اور کوئی نہیں ہے چنانچہ بعض کو تبرکاً ذکر کیا جاتا ہے۔

۱، ابوبصیر سے مروی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم راسخین فی العلم ہیں۔ اور ہم ہی اس کی تاویل جانتے ہیں
۲، امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ راسخین فی العلم میں سے افضل فرد حضرت رسالتاً ہیں۔ اور جو کچھ بھی خداوند کریم نے نازل فرمایا۔ اس کی تاویل و تنزیل کا ان کو علم تھا اور کوئی چیز خدا نے ایسی نازل نہیں فرمائی جس کا آنجناب کو علم نہ ہو اور حضور رسالتاً اور ان کے بعد ان کے اوصیاء سب کا علم رکھتے ہیں۔ نیز آپ نے فرمایا کہ قرآن میں خاص بھی ہے عام بھی۔ محکم بھی اور متشابہ بھی اور ناسخ بھی اور منسوخ بھی، لیکن راسخین فی العلم ان تمام کو جانتے ہیں۔

۳، ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ قرآن ناجر بھی ہے اور آمر بھی۔ جنت کا آمر کرتا ہے اور دوزخ سے زجر کرتا ہے اس میں محکم بھی ہیں اور متشابہ بھی۔ پس محکمات کا تعلق ایمان و عمل ہر دو سے ہے اور متشابہات کا تعلق ایمان سے ہے ان پر عمل نہیں کیا جاتا۔ اس کے بعد آپ نے آیت مجیدہ کی تلاوت فرمائی۔ اور آخر میں فرمایا۔ کہ اہل محکم ہی راسخین فی العلم ہیں۔

ہم نے تفسیر کی جلد اول یعنی مقدمہ تفسیر میں بھی اس پر کسی حد تک روشنی ڈالی ہے اور اس مطلب کو متعدد عنادین کے تحت بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ احادیث کے علاوہ صحابہ کرام کی تصریحات بھی نقل کی ہیں جس سے روز روشن کی طرح عیاں ہوتا ہے کہ وقار علمی میں علیؑ کے ہم پلہ صحابہ میں سے کوئی نہ تھا۔ جتنے کہ ابن عباس کا قول ہے کہ میرے اور جناب رسالت کے تمام صحابہ کے علم کو حضرت علیؑ کے علم سے وہ نسبت ہے جو ایک قطرہ آب کو سات سمندروں سے حاصل ہے۔

اس بناء پر آیت مجیدہ میں الرَّاسِخُونَ فی الْعِلْمِ کا عطف لفظ اللہ پر ہے اور مقصد یہ ہے کہ تاویل آیات قرآنیہ کے علم کا حصر ہے۔ اللہ میں اور راسخون فی العلم میں۔ اور ان کے سوا اس کو کوئی جانتا ہی نہیں اور اس کے بعد لِقَوْلُونَ اَلَمْ یَخْلُ مِنْصُوبٌ اور حال ہے۔ راسخون فی العلم سے پس لفظ اللہ پر وقف درست نہیں۔ اور معنی آیت وہی ہے جو تحت اللفظ موجود ہے۔

اور اس آیت کی دوسری ترکیب اس طرح ہے کہ لفظ اللہ پر وقف اور جملہ کو تام مانا جائے اور اس کے بعد واؤ کو بجائے عطفت کے استیناف پر قرار دیا جائے اور الرَّاسِخُونَ کو مبتدا قرار دے کر لِقَوْلُونَ اس کی خبر ہو، اور آیت مجیدہ کا اس ترکیب کی رو سے مطلب یہ ہوگا کہ متشابہ کی تاویل کو کوئی نہیں جانتا۔ مگر صرف اللہ۔ اور جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ اس چیز کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سب ہمارے پروردگار کی جانب سے ہی ہیں یعنی تاویل کا علم تو صرف اللہ کے پاس ہے اور لوگوں کی اس بارے میں دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہیں جو من مانی تاویلیں کر کے متشابہات کی اتباع کرتے ہیں اور وہ وہی ہیں جن کے دل حق سے پھرے ہوئے ہیں اور جو علم میں رسوخ رکھتے ہیں اور وہ متشابہات کا اللہ کی جانب سے ہونا تسلیم کرتے ہوئے ٹھیک جاتے ہیں اور اپنی جانب سے اس میں رائے زنی نہیں کرتے لیکن اگر صحیح تدبر کرتے ہوئے حقیقت کا جائزہ لیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلی ترکیب اور معنی بالکل صاف و سیدھا اور موزوں و مناسب ہے اور دوسری ترکیب اور معنی میں مخالفت واقع بھی ہے اور مخالفت عمل بھی۔ نیز مخالفت عقل بھی ہے اور مخالفت نقل بھی۔

مخالفت واقع تو اس لئے ہے کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیات قرآنیہ میں تدبر اور تفکر کی دعوت دی ہے تو یقیناً اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ صرف محکمات میں ہی تدبر کریں کیونکہ محکمات کا تو مطلب ہی صاف ہوتا ہے۔ اور ان میں مزید غور و فکر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لہذا اس سے مراد آیات محکمہ کے علاوہ دوسری آیات ہی ہونی چاہئیں۔ کیونکہ اگر ان کا علم صرف اللہ ہی کی ذات میں منحصر ہے تو عام لوگوں کو ان میں تدبر و تفکر کی دعوت دینا عبث ہے اور لطف یہ ہے کہ خداوند کریم نے ان لوگوں کی جا بجا مذمت فرمائی ہے۔ جو آیات میں تدبر نہیں کرتے پس معلوم ہوا کہ ان آیات کا علم خدا نے اپنی ذات میں منحصر نہیں فرمایا بلکہ راسخون فی العلم کو بھی ان کا علم دیا ہے۔ اور لوگوں کو ان میں تدبر کی دعوت بھی دی گئی ہے۔

سوال :- اگر تدبر فی القرآن اور تفکر کی دعوت عام ہے تو پھر اس مقام پر ان کی مذمت کیوں ہے؟ کہ فرماتا ہے جن لوگوں کے دلوں میں کجی اور کھوٹ ہے وہی متشابہات کی پیروی کرتے ہیں۔

جواب :- مذمت اس لئے نہیں کہ وہ تدبر کیوں کرتے ہیں بلکہ اس لئے ہے کہ فتنہ جوئی اور فساد کی خاطر وہ متشابہات

کو اپنے مطلب فاسد اور مقصد کا سد پر فٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں گویا ان کا متشابہات کے درپے ہونا حق طلبی کے لئے نہیں ہوتا۔ بلکہ فتنہ پروری کے لئے ہی ہوتا ہے۔

سوال :- اگر راسخون فی العلم متشابہات کی تاویل صحیح طور پر جان سکتے ہیں۔ اور ان کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا۔ کیونکہ متشابہات کی تاویل کا علم اللہ اور راسخون فی العلم میں بند ہے تو پھر وہی اعتراض تو واقع ہوگا کہ خدا نے باقی مخلوق کو قرآن میں تدبیر کرنے اور تفکر کرنے کی دعوت کیوں دی جب کہ ان کا علم سوائے اللہ اور راسخین کے کوئی حاصل ہی نہیں کر سکتا۔ اور راسخین سے مراد صرف اہل محضر ہیں جس طرح کہ احادیث اکثہ میں تو اتر سے یہ مطلب منقول ہے تو گویا تدبیر کا حکم بھی صرف انہی کے لئے ہی ہے اور ان کے علاوہ باقی لوگ اگر تدبیر کریں تو وہ تفسیر بالرائی کے مرتکب ہوں گے۔

جواب :- قرآن مجید چونکہ خالق کا کلام ہے اور اس میں ہر وہ خوبی موجود ہے جو کسی کلام میں ہو سکتی ہے لہذا اس کے جملہ پہلوؤں پر پوری طرح اطلاع صرف اسی کی ذات کو ہی ہو سکتی ہے جس نے اس کو نازل فرمایا اور اس کے تمام رموز و نکات پر عبور کامل بھی اسی کی ذات کے لئے ہے جس نے اس کو خلق فرمایا ہے۔

اور ظاہری اعتبار سے اگرچہ ایک کلام میں احتمالات متعدد پیدا ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ ہر پیدا ہونے والا احتمال جو قواعد عربیہ یا محاورات اہل لسان کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔ وہ خواہ مخواہ مراد مستحکم بھی ہو چنانچہ ہر معمولی قابلیت کا انسان اس حقیقت کا معترف ہے بلکہ یہ چیز فطرت سلیمہ کے مسلمات میں سے ہے۔ پس خداوند کریم نے اپنے مقدس کلام کو جس پاک وجود پر نازل فرمایا۔ اس کو قرآن کا علم بھی ساتھ ساتھ عطا فرمایا۔ کیونکہ اگر قرآن لانے والے کو قرآنی علوم پر عبور تمام حاصل نہ ہو۔ تو اس کا قرآن لانا سوائے مضحکہ کے اور کچھ نہیں۔ اور اسی طرح جن کو تاقیام قیامت قرآنی تبلیغات پر مامور فرمایا اور جناب رسالتؐ انہی کے بھروسے جمع میں اپنے بعد کے لئے ان کی خلافت کا اعلان فرمایا اور دیگر فرامین میں متعدد مقامات پر ان کا قرآن کے ساتھ ہونا اور قرآن کا ان کے ساتھ ہونا ذکر فرمایا۔ جس طرح کہ حدیث ثقلین جو تو اتر سے رفیقین کی کتب میں منقول ہے۔ ان لوگوں کو بھی قرآنی علوم کا ساتھ عطا فرمائے۔ پس جس طرح کہ جناب رسالتؐ عالم قرآن تھے اسی طرح وہ بھی عالم قرآن ہیں اور اگر قرآن کا علم صرف اللہ نے اپنی ذات تک محدود رکھا ہوتا۔ اور مبلغین کو اس سے بہرہ ور نہ فرمایا ہوتا تو صرف کتاب کا کسی کو عطا کر کے بھیجنا فضول ہوتا اور اس کی حیثیت ایسی ہوتی۔ جس طرح ایک چمٹی رساں ایک خط کسی مکتوب الیہ کی طرف پہنچائے۔ جس کو نہ وہ خود پڑھ سمجھ سکے اور نہ مکتوب الیہ کو اس سے کچھ حاصل ہو۔ اور اس صورت حال پر مطلع ہونے والا سنجیدہ طبقہ چمٹی رساں، یا مکتوب الیہ کو قابل ملامت ہرگز نہ سمجھے گا۔ بلکہ خط بھیجنے والے کی عقل و دانش کا ماتم کرے گا اور خداوند علیم و حکیم اس قسم کے نقائص سے بلند بالا اور اجل و اعلىٰ ہے پس اس نے اپنی کتاب کا علم مبلغین کتاب کو کماحقہ عطا فرمایا۔ اور انہی کو راسخین فی العلم کے مقدس لقب سے سرفراز فرمایا اور لوگوں کو ان کے علم حاصل کرنے اور اس میں تدبیر کرنے کی دعوت دی تاکہ وہ راسخین فی العلم کے دروازہ پر جبہ سائی کر کے ان سے فیوض معرفت حاصل کریں اور مطالب حقہ قرآنیہ تک دسترس حاصل کر کے اپنے قلوب

کو انوارِ علوم قرآنیہ کی روشنی قندیلوں سے منور کریں۔

اسی بناء پر ان لوگوں کی مذمت فرمائی جو اپنی عقل فاسد اور ذہن کا سد سے قرآنی مطالب کا استنتاج کرنے کے درپے ہوتے ہیں اور قرآن والوں سے مطالب صحیحہ تک رسائی کا درس حاصل نہیں کرتے اور اسی چیز کو احادیث نبویہ میں تفسیر بالرائے سے تعبیر کیا گیا ہے اور ایسے لوگوں کی پر زور مذمت کی گئی ہے جو قرآن کی تفسیر اپنی آرائے فاسدہ سے کرتے ہیں اور جہاں تدبر و تفکر کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہے اور ان کی محنتوں اور ذہنی کاوشوں کو سراہا گیا ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو احادیث نبویہ اور فرامینِ عمرتِ طاہرہ کی روشنی میں قرآنی مطالب میں غور و خوض کرتے ہیں۔

پس قرآنی جملہ علوم اور محکات و مشابہات کی تمام تر معلومات کا راسخین فی العلم میں بند کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کا شیرازہ منتشر نہ ہو اور ان کے علوم دینیہ کا مرکز ایک ہو جو ان کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تشتت و افتراق کی دہائی روحانی امراض سے بچائے رکھے کیونکہ مرکزِ علم کی وحدت سے بڑھ کر کسی قوم کی وحدت کو برقرار رکھنے کیلئے اور کوئی علاج کارگر ہے ہی نہیں جس طرح کہ اقوامِ عالم کی تاریخ کا سچا مطالعہ اس کا شاہد ہے۔

پس خداوندِ کریم نے ایک طرف تدبر اور تفکر کی دعوت عام دے دی۔ اور دوسری طرف مرکزِ علم کو مستحکم اور مضبوط کر کے اختلافی مسائل حل کرنے کے لئے ان کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دی تاکہ نہ ان میں قرآنِ فہمی کی شوق کم ہو اور نہ اپنی آراء و قیاسات میں پڑ کر راہِ حق سے دُور نکلنے پائیں یا یوں سمجھئے کہ علوم قرآنیہ کی طرف شوق و شغف کا اضافہ بھی ہوتا رہے اور راسخین کی ہدایات کے ماتحت حدود و متعینہ سے باہر جانے کی نوبت بھی نہ آئے۔

پس قرآن کے علوم کا راسخین فی العلم میں منحصر ہونا عوام الناس کے تدبر فی القرآن کی دعوت سے کوئی منافات نہیں رکھتا ہاں اگر مشابہات کا علم صرف ذاتِ خدا میں منحصر قرار دیا جائے تو پھر تدبر و تفکر کی دعوت قطعاً بے محل ہے کیونکہ نہ تو انسان خود اپنی ذہنی صلاحیتوں سے مطالب واقعہ تک دسترس حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی صحیح تاویل صرف اللہ کے پاس ہی ہے اور نہ اس میں کسی سے رہبری حاصل کر سکتا ہے پس تدبر و تفکر کا نتیجہ اس صورت میں صرف تفسیر بالرائے ہے جس سے پر زور منع کیا گیا ہے لہذا صحیح مطلب اسی صورت میں نکلے گا کہ اللہ سبحونہ فی العلم کا عطف اللہ پر ہو اور ساتھ ساتھ یہ تسلیم کیا جائے کہ خدا نے ان کو قرآن کے محکات و مشابہات کا کامل علم عطا فرمایا ہے اس سے تدبر و تفکر کا حکم بھی صحیح ہے کیونکہ مقامِ خطا پر راسخین کی طرف رجوع کر کے مطالب صحیحہ تک رسائی ممکن ہے اور اس میں تفسیر بالرائے کا خطرہ بھی نہیں رہتا۔

مخالفتِ عمل صدرِ اول سے لے کر آج تک علمائے مفسرین نے قرآن مجید کی تمام آیات کی تفاسیر اور حلِ مطالب میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ اور کسی مشکل سے مشکل ترین آیت کی تفسیر کو اس لئے ترک نہیں کیا کہ یہ مشابہ اور اس کا علم صرف ذاتِ احدیت تک ہی محدود ہے اس میں فرق نہیں کہ علمائے مفسرین شیعہ ہوں یا سنی تمام کا یہی رویہ رہا ہے پس یہ عمل صاف بتلاتا ہے کہ واللہ سبحونہ کا عطف اللہ پر ہے اور بعد میں یوالا جملہ متانفہ نہیں بلکہ راسخین سے حال ہے۔

مخالفت عقل۔ قرآن میں آیات متشابہات نازل فرما کر اس کا علم کسی کو نہ دینا قرآن مجید کے تاقیامت ہادی ہونے کو باطل کرتا ہے کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ خدا مبلغین کو تبلیغ امور قرآنیہ پر مامور فرمائے اور ان کو قرآن کے اکثر مطالب کا واقعی علم نہ عطا کرے۔ جس طرح کہ گذشتہ بیان میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے پس معلوم ہوا کہ جس طرح قرآن تاقیامت ہادی ہے اس کے ساتھ ساتھ مبلغین قرآن کا سلسلہ بھی تاقیامت جاری ہے جو تمام قرآنی رموز و نکات کا واقعی علم رکھتے ہیں ان کو حکم و متشابہ عام و خاص۔ ناسخ و منسوخ، مطلق و مقید، تاویل و تنزیل اور ظاہر و باطن وغیرہ کا کما حقہ علم حاصل ہے اور وہ صرف محمد و آل محمد ہی ہو سکتے ہیں۔ اس کی مزید تفصیل تفسیر کی جلد اول میں ملاحظہ فرمائیں۔

اور **مخالفت نقل** اس لئے ہے کہ کتب فریقین میں یہ چیز مسلم حدیث رکھتی ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے عالم قرآن ہونے پر تقریباً تمام صحابہ متفق تھے اور جناب رسالت کا فرمان اس مطلب پر نص قاطع ہے اور تاریخ صاف صاف بتلاتی ہے کہ صحابہ کرام قرآن کے مشکل مسائل کا حل حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے ہی طلب کرتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت عمر کے یہ الفاظ تو اتر سے منقول ہیں۔ **لَوْلَا عَلِيٌّ لَهْلَكَ عُمَرُ** (اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا)۔ چنانچہ مقدمہ تفسیر کے صفحہ ۸۷، ۸۸ پر بہ حوالہ جات کتب اس مطلب کو بیان کیا جا چکا ہے۔

احادیث ائمہ اس بارہ میں تو اتر سے منقول ہیں کہ تمام قرآن کا علم اہلبیت عصمت کے پاس ہے چنانچہ جلد اول صفحہ ۱۳۹ میں بعض احادیث کو میں نے نقل کیا ہے اور تاریخ بتلاتی ہے کہ ہر دور میں جب قرآنی مسائل مشککہ میں علمائے مذاہب لاجواب ہو جاتے تھے تو ائمہ اہلبیت کی طرف رجوع کرنے کے بغیر ان کو کوئی چارہ نہ ہوتا تھا۔ پس ان حقائق پر نظر دوڑنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ **التراسخون فی العلم** کا عطف لفظ اللہ پر ہے اور آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ تاویل آیات متشابہ کو سوائے خدا اور راستخین فی العلم کے اور کوئی نہیں جانتا۔

تاویل قرآن۔ تاویل کا لغوی معنی ہے پلٹانا۔ لیکن یہاں مراد ہے معنی کی بازگشت اور بازگشت سے مراد اس طرح نہیں جس طرح کہا جاتا ہے کہ غلام کی بازگشت آقا اور عدد کی بازگشت واحد ہے بلکہ یہاں بازگشت سے مراد رجوع خاص ہے اور تاویل قرآن سے مراد وہ حقیقی و خارجی واقعہ یا مصلحت جس پر کلام کا اعتماد ہو۔ اور وہ اس کلام کا سچا مصداق ہو۔ چنانچہ قرآن مجید میں تاویل کے متعدد استعمالات پر عبور کرنے سے اس حقیقت کا صحیح انکشاف ہو سکتا ہے۔

(۱) کیل و وزن کی درستی و استقامت کے امر کے بعد فرماتا ہے **ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَخْسَنُ تَأْوِيلًا**۔ یعنی کیل و وزن کی صحت و استقامت کی تاویل بہت خوب ہے اور اس سے مراد تمدنی و اجتماعی خوشحالی ہے۔

(۲) کافروں کے بارے میں فرماتا ہے۔ کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ باتیں افتراء ہیں پھر فرماتا ہے کہ انہوں نے ایسی شے کی تکذیب کی ہے۔ جس کے علم کا ان کو احاطہ نہیں ہے اور نہ اس کی تاویل ان کے پاس پہنچی ہے۔ یعنی قیامت کی خبروں کو انہوں نے جھٹلایا تھا۔ اور رسول پاک کی طرف نسبت افتراء کی دی تھی۔ پس خداوند کریم نے قیامت کے دن میں واقع ہونے والے امور کو جو قرآنی خبروں کے

مصدق ہیں تاویل کا نام دیا ہے۔

(۳) حضرت خضرؑ کے کشتی کو توڑنے اور لڑکے کو قتل کرنے اور دیوار بنانے اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوال کرنے کے بعد اُن کا کہنا ہے کہ میں آپ کو ان چیزوں کی تاویل بتلاتا ہوں تو ان مصالح و واقعیہ کو اُن امور کی تاویل کہا گیا۔ جو حضرت خضرؑ سے صدور پذیر ہوئے تھے۔

(۴) حضرت یوسفؑ کے قصہ میں تعبیر خواب کو متعدد مقامات پر تاویل سے یاد کیا گیا۔

ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تاویل سے مراد وہ حقائق خارجیہ اور مصالح و واقعیہ ہیں جن پر آیات قرآنیہ کے معارف و علوم شرائع و احکام اور جملہ قصص و حکایات کا مدار و اعتماد ہے اور اس کا ماحصل اور خلاصہ یوں سمجھئے کہ قرآن کے معانی اور جملہ مضامین میں جہاں تک عام انسانی عقول کی رسائی ہے یہ قرآن کا جسم ظاہری ہے اور اس کے پس پردہ ایسے حقائق و دقائق اور مصالح و حکم موجود ہیں جو روح قرآن ہیں اور اُسی کو اُم الکتاب کتاب حکیم اور کتاب مکنون کے الفاظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ اور قرآن مجید کے تمام معارف و احکام کی بازگشت اور جائے اعتماد وہی ہیں وہ نہ الفاظ ہیں اور نہ معانی و مضامین ظاہریہ کی قسم سے ہیں اسی لئے اُن تک نہ افہام عامہ کی رسائی ہے اور نہ عقول بشریہ اُن تک پہنچ سکتے ہیں۔ اسی بناء پر فرماتا ہے۔

إِنَّا لَنَقُرُّنَ كَلِمَاتٍ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ لَا يَسْمَعُ إِلَّا الْمَطْهَرُونَ۔ اُس کو مس نہ کر سکنے کا مطلب ہے کہ اُس کے حقائق و واقعیہ اور معارف باطنیہ جو الفاظ مبتنیہ اور مضامین متعینہ کا مال و مرجع ہیں۔ اُن تک سوائے نفوسِ قدسیہ اور ذواتِ مطہرہ کے کسی کی رسائی نہیں اور آیتِ تطہیر اِنَّمَا يُرِثُهَا اللَّهُ الذِّمَّةُ سے اُن ذواتِ مقدسہ کی تعین بھی فرمادی جو پاک اور مطہر ہیں۔ کہ وہ اہلبیت عصمت اور خاندانِ نبوت ہیں پس یہاں ہمیں دو عصر معلوم ہو گئے۔

(۱) آیاتِ الہیہ کی تاویل یعنی مضامین قرآنیہ کے حقیقی مصداقات کو کوئی نہیں جان سکتا مگر اللہ اور راسخون فی العلم۔

(۲) کتاب مکنون کو کوئی نہیں مس کر سکتا مگر وہ جو مطہر ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ تاویل قرآن کا علم اور مس ایک چیز ہے اور راسخین فی العلم اور مطہرین ایک ہی خاندانہ ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ راسخین فی العلم اور مطہرین تاویل کا علم رکھتے ہیں۔ نیز یہ بھی واضح ہو گیا کہ تاویل کا تعلق صرف آیات متشابہ سے نہیں بلکہ آیات حکمت سے بھی ہے اور اسی کو تو قرآن مجید کا باطن کہا جاتا ہے جس کا تعلق تمام آیات قرآنیہ کے ساتھ ہے اور اس کی ظاہری مثال یوں سمجھئے کہ جس طرح انسان نکاح کرتا ہے تو اس کا ظاہری منہم ہے۔ تکمیلِ خواہشات جنسیہ۔ لیکن اس کا اتباع سنتِ رسولؐ ہے اور اس کے باطن میں انسان کی تنظیم اور بے راہ رومی سے اجتناب کرتے ہوئے جنبۂ انسانیت کی تکمیل ہے نیز پھر اسی کے باطن میں انسان کی تمدنی اور اجتماعی زندگی کے فطری تقاضوں کے پورا ہونے کا راز بھی پنہاں ہے پھر اس کے اندر بقا و نوع انسانی کا راز بھی مضمر ہے اور اس کا آخری مقصد ہے نعماتِ جنت کی تحصیل جو کمالِ رُوح کی آخری منزل ہے۔

پس نکاح کا ظاہری اور سرسری معنی ہے خواہشات جنسیہ کا دفاع لیکن اس کا ایک باطن ہے اور باطن در باطن یہاں تک کہ

تدریجاً لکھی بواطن ہیں اور اسی طرح آخری باطن تک سلسلہ پہنچ جاتا ہے۔ پس معمولی دماغ کا آدمی صرف ظاہری معنی سمجھتا ہے اور بلند پایہ لوگ اذہان و افکار کے مدارج کے لحاظ سے اس کے مراتب باطنیہ تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔

اسی طرح قرآن مجید کا ایک ہے ظاہری ترجمہ اور ان مطالب و مضامین اور احکام و فرامین کا سمجھنا جن تک عقولِ انسانیہ اور افکارِ بشریہ اپنی خداداد استعدادات سے رسائی حاصل کر لیتے ہیں اور ایک ہے اس کا باطن جو ان معانی اور مطالب ظاہریہ کے لئے بحیثیت روح کے ہے جس کو عام انسانی عقول و افکار مس تک نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ان کی دسترس سے بلند بالا ہے اور اس کو صرف وہی پا سکتے ہیں جن کے اذہان و قلوب ہر قسم کے رجاس باطنیہ سے پاک و مطہر ہوں جیسے ارشاد ہے لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ۔

پس قرآن مجید کا ظاہری ترجمہ اور اپنے ذہنی استعدادات کے ماتحت اس کے مطالب کا استنتاج اور اس کے احکام و فرامین تک دسترس حاصل کرنے کے لئے غور و خوض اور متعدد معانی میں سے باعتبار قرآن کے بعض کی بعض پر ترجیح وغیرہ یہ سب کچھ تفسیر قرآن ہے جس پر ہر شخص موفق ہو سکتا ہے اور متشابہ آیات کو محکمات کی روشنی میں حل کرنا بھی اسی کے تحت میں ہے اور محکمات کو ام الکتاب کہنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ آیات متشابہ کا حل انہی کی روشنی میں ہوتا ہے لیکن وہ امور خارجیہ اور مصالح و واقعیہ جو قرآن کے معانی و مفاسیم اور مطالب و مضامین ظاہریہ کا مرجع و مآل اور مصداق حقیقی ہیں وہ باطن قرآن اور روح ہیں اور انہیں تاویل سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا علم سوائے خدا اور راہنمائی فی العلم کے اور کسی کو حاصل نہیں ہے پس اس بیان سے تفسیر اور تاویل کے درمیان فرق کی وضاحت ہو گئی اور تفسیر و تاویل کے درمیان مفسرین نے کئی فرق بتائے ہیں۔

- (۱) تفسیر اس لفظ کا معنی بیان کرنا جس میں متعدد احتمالات نہوں اور تاویل سے مراد ہے متعدد احتمالات میں سے ایک کو ترجیح دینا۔
- (۲) تفسیر معنی کی دلیل کو بیان کرنا اور تاویل معنی کی حقیقت کو ظاہر کرنا۔
- (۳) تفسیر معنی ظاہری کو بیان کرنا اور تاویل معنی مشکل کو واضح کرنا۔
- (۴) تفسیر کا تعلق روایت اور تاویل کا تعلق درایت سے ہے۔

لیکن قرآن کی وہ آیات جن میں تاویل کا استعمال ہوا ہے ان کی روشنی میں ان اقوال کی کوئی وقعت و اہمیت نہیں رہتی۔ پس تحقیق وہی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں اور ائمہ ظاہرین علیہم السلام سے بعض آیات کی جو تاویلیں منقول ہیں وہ ہمارے بیان کی تفصیلی و تائید کے لئے کافی ہیں اور اسی تفسیر کے مقدمہ ص ۹ پر بھی تفسیر تاویل پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ

تحقیق جو لوگ کافر ہیں ہرگز نہ فائدہ دیں گے ان کو ان کے مال اور نہ ان کی اولاد

مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ وَقُودُ النَّارِ ۖ كَذَابِ آلِ فِرْعَوْنَ ۝

اللہ سے (بچانے میں) کچھ بھی۔ اور وہی جہنم کا ایندھن ہوں گے جس طرح فرعون کے تابعدار

وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۖ فَآخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ

اور ان سے پہلے کے لوگ جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیات کو پس ان کو گرفتار کر لیا خدا نے اپنے گناہوں

وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۚ قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سَتُغْلَبُونَ وَ

سبب اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے فرمادیجئے کافروں کو کہ تم عنقریب مغلوب ہو گے اور

تُحْشَرُونَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ ۖ وَيُسَّ إِلَيْهَا ۚ

جمع کئے جاؤ گے طرف جہنم کے جو بڑا ٹھکانا ہے

رُكُوع ۱

قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ۖ اس کے شان نزول کے متعلق تفسیر مجمع البیان میں منقول ہے کہ جناب رسالتاً جب جنگ بدر فتح کر کے

والپس مدینہ میں تشریف لائے تو یہودیوں کو بازار بنی قینقار میں جمع کر کے فرمایا۔ اے گروہ یہود۔ وہ عذاب جو قریش پر نازل ہوا ہے تم بھی اللہ سے اس کا خوف کرو۔ اور ان جیسا عذاب اترنے سے پہلے تم اسلام کے حلقہ بگوش ہو جاؤ۔ حالانکہ تم کو علم ہے کہ تمہاری کتابوں کی رو سے میں نبی مرسل ہوں۔ یہودی یہ سن کر کہنے لگے۔ اے محمد! آپ ہرگز دھوکہ میں نہ پڑیں کیونکہ وہ نا تجربہ کار قوم تھی جو قواعد حرب و ضرب سے بالکل بے بہرہ تھی پس موقعہ پا کر آپ نے ان کو شکست دے دی ہے۔ ہمیں ان جیسا نہ سمجھئے خدا کی قسم اگر ہمارے ساتھ لڑائی ہوتی تو پتہ چل جاتا کہ ہم کیسے جواغرد ہیں۔ تب یہ آیت اتری کہ ان کو فرمادیجئے کہ تم مغلوب ہو گے اور قیامت کے دن بھی جہنم تمہارا حشر ہوگا۔ اب موقعہ ہے کہ بدر کی لڑائی اور مسلمانوں کی فتح یابی سے عبرت حاصل کرو کیونکہ مسلمان تھوڑے اور کافر تعداد میں زیادہ تھے لیکن خدا کی نصرت مومنوں کے شامل حال تھی اور باوجود قلیل تعداد کے غالب اور فتیاب رہے۔

کہتے ہیں کہ بعض یہودیوں نے یہ کہا تھا کہ واقعی یہ وہی رسول ہے جس کے متعلق ہم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی تھی اور ہماری کتب میں اس کا تذکرہ ہے اور اس کی صفات بھی اس سے ملتی جلتی ہیں کہ اس کا جھنڈا سرنگوں نہ ہوگا پھر ایک دوسرے کو کہنے لگے

قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِتْنَتَيْنِ الثَّقَاتِ فِتْنَةٌ تَقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَىٰ

تحقیق تمہارے لئے نشانی تھی ان دو گروہوں میں جو ایک دوسرے سے لڑے ایک گروہ تو لڑتا تھا اللہ کی راہ میں اور دوسرا

كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَهُمْ رَأْيِ الْعَيْنِ ط وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصَرِهِ مَن يَشَاءُ ط

کافر تھا۔ کہ ان کو اپنے سے دو گنا سمجھتے تھے آنکھوں کے دیکھنے سے اور اللہ تائید فرماتا ہے اپنی مدد سے جس کی چاہے

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ۝

تحقیق اس میں البتہ عبرت تھی صاحب ان بصیرت کے لئے

کہ فی الحال جلدی کی ضرورت نہیں۔ ایک آدھ تجربہ اور بھی کر لینا چاہیے پس جب اُحد کی جنگ میں مسلمانوں نے بُردی کا مظاہرہ کیا اور بھاگ گئے تو یہودیوں کا پہلا عقیدہ جاتا رہا اور اپنے کفر پر پختہ ہو گئے نیز قوم یہود کا جناب رسالتاً کے ساتھ غیر جانبداری کا عہد تھا لیکن انہوں نے مدت عہد کے اندر اندر عہد شکنی کی جس کی پاداش میں ان کو قتل یا جلا وطن ہونا پڑا جیسا کہ تاریخ میں موجود ہے۔

جنگ بدر کی طرف اشارہ

قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ ۖ اس کے معنی میں دو احتمال ہیں۔ ایک تو یہ کہ خطاب کافروں سے ہو اور جناب رسالتاً کے قول کا اس کو تتمہ قرار دیا جائے اور دوسرا یہ کہ خطاب مومنین سے ہو۔ بہر کیف آیت میں جنگ بدر کی طرف اشارہ ہے اور یہودیوں کے لئے تنبیہ اور درس عبرت ہے۔ یہ مومنین کے لئے ثابت قدمی کی تلقین اور نصیحت ہے

جنگ بدر اسلامی لڑائیوں میں سے سب سے پہلی لڑائی ہے جو مسلمانوں اور کفار قریش میں واقع ہوئی تھی اس میں مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی جن میں ۷۷ مہاجر اور ۲۳۶ انصار تھے مہاجرین کے علمبردار حضرت امیر المومنین علیہ السلام تھے اور انصار کا علم حضرت سعد بن عبادہ انصاری کے ہاتھ میں تھا۔ جناب رسالتاً کی فوج میں ستر اونٹ تھے اور دو گھوڑے ایک مقدار کے پاس اور دوسرا مرشد ابن ابی مرشد کے پاس اور ہتھیار صرف چھ زربیں اور آٹھ تلواریں تھیں۔ اس طرف کفار قریش کے لشکر کی تعداد کافی تھی باختلاف روایات وہ ایک ہزار کے لگ بھگ تھے ان کے پاس ایک سو گھوڑے سوار تھے اور سالار فوج عتبہ بن ربیعہ تھا۔

اس جنگ میں کل ۲۲ مسلمان شہید ہوئے جن میں چودہ مہاجر اور آٹھ انصار تھے اور اس جنگ میں کامیابی کا سہرا حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے سر تھا۔

يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَهُمْ ۖ اس کے معنی میں کئی احتمالات ہیں :- (۱) یَرَوْنَهُمْ کا فاعل ضمیر جو راجع طرف کفار کے ہے قرار دی جائے اور پہلی ضمیر ہُو کا مرجع مسلمان ہوں اور دوسری ضمیر هُو کا مرجع بھی مسلمان ہوں تو معنی یہ ہوگا۔ غداً نے مسلمانوں کا رعب اُن کے

زَيْنَ النَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ

میزین ہے لوگوں کے لئے شہوانی محبت۔ عورتوں سے بچوں سے اور اُن مہکیوں سے جو پُر ہوں سونے اور

مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ

چاندی سے اور علامت دار گھوڑوں اور چوپاؤں سے اور کھیتی سے

ذَلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۗ وَاللَّهُ عِنْدَ حُسْنِ الْمَآبِ ۝ قُلْ

یہ سب سرمایہ میں زندگی دنیا کا اور اللہ کے پاس اچھی بازگشت ہے فرمادیجئے کیا

أَوُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذَلِكَُمُ الَّذِينَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي

میں بتاؤں تمہیں اس سے بہتر چیز (وہ یہ کہ) جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا ان کے لئے اپنے رب کے پاس جنتیں ہیں کہ جاری

مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَأَنْشُرُ أَوْحَاطٌ مُّطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِّن

میں ان کے نیچے نہریں کہ ہمیشہ رہیں گے وہ ان میں اور بیویاں پاکیزہ اور خوشنودی خدا (بھی ان کے لئے

اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ بِصِيرٍ بِالْعِبَادِ ۝

(ہے) اور اللہ نگران ہے بندوں پر

دلوں پر اس قدر جمادیا کہ کافران کو ان کی اصل تعداد سے دگنا خیال کرتے تھے اور ظاہری بھی دکھائی دیتا تھا۔
(۲) باقی ترکیب وہی پہلی صرت آخری ضمیر ھضم کا مرجع کافروں کو قرار دیا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ ہوجہ رعب کے کافر مسلمانوں کو اپنی تعداد سے ظاہری نظروں کے لحاظ سے دگنا خیال کرتے تھے۔

(۳) یزیدوں کا فاعل مسلمان ہوں اور دونوں مقام پر ھضم ضمیر کا مرجع کفار ہوں تو معنی یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی قوت قلب اور تسلی کے لئے خدا نے یہ انتظام فرمایا کہ کافر لوگ ان کو تھوڑے معلوم ہوتے تھے پس مسلمان کافروں کو اپنی تعداد سے صرف دگنا ہی سمجھ رہے تھے۔

حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ مَجِج البیان۔ جناب رسالت اللہ سے مروی ہے کہ میرے بعد مردوں کے لئے عورت سے بڑھ کر اور کوئی نقصان دہ فتنہ نہیں۔ نیز فرمایا کہ یہ شیطان کا جال ہیں حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ عورت مجسمہ شر ہے اور اس میں سب شر ہی شر ہے اور یہ ایک ایسا بچھو ہے جس کا ڈنسا شیریں ہے۔

الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّكَ آتِنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

جو یہ کہتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے۔ پس بخش دے ہمارے گناہ۔ اور بچا ہم کو عذاب جہنم سے

الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْمُتَّقِينَ وَالْمُتَّقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ ۝

صابر اور سچے اور اطاعت شعار اور سخی اور پچھلی رات کو استغفار کرنے والے ہیں

شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَابِئًا بِالْقُسْطِ ۝

شہادت دی اللہ نے کہ سوائے اس کے کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور صاحبان علم نے درحالیہ وہ عدل پر قائم ہیں

لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ غالب حکمت والا ہے

وَالْمُؤْمِنِينَ - ایک حدیث میں جناب رسالت اکبر سے مروی ہے (اولاد) میوہ دل اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور باعث بزدلی۔ بخل اور حزن و غم بھی ہے۔
وَالْقَائِلِينَ - جمع ہے قنطار کی اور ایک قنطار کی مقدار بیل کی کھال جو سونے سے پڑ ہو اور یہ معنی صادقین علیہا السلام سے مروی ہے بعض مفسرین نے دوسرے معانی بھی کئے ہیں۔

الْمُسْتَعْفِرِينَ - مسومہ کو سوسے سے مستحق قرار دیا جائے تو معنی ہوگا چرنے والے اور سیما سے مستحق مانا جائے تو معنی خوبصورت ہوگا۔
وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ - جمع السبائح۔ جناب رسالت اکبر سے مروی ہے کہ اللہ فرماتا ہے جب میں اہل زمین پر عذاب کا ارادہ کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ میرے گھروں کے آباد کرنے والے اور میری خوشنودی کے لئے آپس میں محبت کرنے والے اور سحر کے وقت استغفار کرنے والے موجود ہیں تو اہل زمین سے اپنا عذاب ٹال دیتا ہوں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جو شخص بوقت سحر نماز وتر میں ستر مرتبہ استغفر اللہ کہے اور ایک سال تک پڑھتا رہے تو وہ اس آیت کا مصداق ہے۔

شَهِدَ اللَّهُ - پوری آیت کا معنی اس طرح ہوگا کہ اللہ نے شہادت دی یعنی اس کی قدرت کا ملکہ اور حکمت شاملہ کے مناظر اور مظاہر زمینوں کی وسعتیں پہاڑوں کی بلندیاں دریاؤں کی موجیں باولوں کی تسخیر آسمانوں کی بغیر ستاروں کے قیام اور ان میں ستاروں کی روشن قدیلیں۔ شمس و قمر کا دور اور پھر ان کے اندر مخلوقات عالم کی آبادی اور ہر فرد خلقت میں اس کی صنعت بدیعہ کے بے مثال کرشمے ان سب چیزوں کے کلی و جزوی مصالح و حکم اور عجیب صنعت و حکمت پر اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ سب خلاق عالم کی یکتائی کے اپنے مقام پر شاہد ہیں اور ان کا نظام تم و اکمل۔ اگر یاقادری مطلق، خالق فطرت، خدائے علیم و حکیم کی بولتی ہوئی زبان ہے جو اس کی قدرت اور حکمت کی بانگ دہل آواز ہے اور بذریعہ وحی مزید وضاحت کے لئے اسی شہادت کا غیر مبہم اعلان ہے کہ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ

مقام توحید

قَائِمًا بِالْقِسْطِ - اور پھر جن لوگوں کو خدا نے علم کے زیور سے آراستہ فرمایا۔ وہ لوگ بھی مشاہداتِ حسیہ تاثراتِ فطریہ و موازناتِ عقلیہ اور مکاشفاتِ قدسیہ سے جو آیاتِ آفاقیہ و انفسیہ سے ان کو حاصل ہیں اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ قَائِمًا بِالْقِسْطِ - یعنی کوئی بھی لائقِ عبادت نہیں سوائے اُس ایک ذات کے جس کا فیصلہ حکمت اور نظامِ قدرت بالکل عدل و انصاف پر مبنی ہے اور جو رِواضِ اعلیٰ سے بالکل علیحدہ ہے۔

لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ - کوئی معبود نہیں مگر وہ جو تمام اشیاء پر غالب ہے اور اس کا تمام نظامِ کائنات جو بدرجہ اتم و اکمل موجود ہے وہ سب مبنی بر حکمت ہے۔ قَائِمًا بِالْقِسْطِ - ترکیب میں لفظ اللہ سے حال بھی ہر سکتا ہے اور معنی یہ ہر گاہ کہ اللہ جو قائم بالقسط ہے وہ اپنی توحید کی شہادت دیتا ہے اور ملائکہ اور صاحبانِ علم بھی اس کی توحید کی گواہی دیتے ہیں۔

فضیلتِ اہل علم

وَأُولُوا الْعِلْمِ - اس آیت مجیدہ میں ذاتِ ذوالجلال نے علم و علماء کی فضیلت کو اجاگر فرمایا ہے۔ کیونکہ علماء کا ذکر ملائکہ کے ذکر کے ساتھ اور ان کی شہادت کو ملائکہ کی شہادت کے ساتھ متصل فرمایا ہے اور صرف انہی کا ذکر کر کے باقی مخلوق کا تذکرہ ترک فرمادیا ہے اور وہ علم جس کی بدولت علماء کا ذکر خالق کائنات نے ملائکہ کے ساتھ کیا اور ان کی شہادت کا اہمیت سے تذکرہ فرمایا۔ علم توحید ہے یا جو علم علوم توحید سے وابستہ ہیں یعنی علوم شرعیہ، دینیہ اس جگہ مراد ہیں کیونکہ شہادت اسی مطلب پر ہے یہی وجہ ہے کہ ائمہ معصومین اور خود جناب رسالت نے تحصیلِ علوم دینیہ پر بڑا زور دیا اور علماء کے فضائل بہت زیادہ بیان فرمائے چنانچہ مجمع البیان میں جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ جناب رسالت نے ارشاد فرمایا کہ عالم کا ایک گنہگار اپنے نیک پرکار سے اپنے علم میں غور و فکر کرنا ایک عبادت گزار کی ستر برس کی عبادت سے افضل و برتر ہے اور انس بن مالک سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا لوگو! علم سیکھو کیونکہ اس کا سیکھنا نیک ہے اس کے درس و تدریس میں ثواب تسبیحِ خدا ہے اس کا تکرار و مباحثہ جہاد ہے اس کا ان پڑھ کو پڑھانا صدقہ ہے اور اس کی اپنے اہل کو یاد دہانی کرنا قربت ہے کیونکہ یہ حلال و حرام کا نشان ہے اور رحمت و ناز کے راستوں کا مینار ہے۔ یہ وحشت کا مولس، مسافرت کا ساتھی، تنہائی میں ہمکلام و ہمدم، خوشی و غمی میں رہبر و دشمن کے سامنے ہتھیار اور غریب کے نزدیک موجبِ قرب ہے اسی کے ذریعہ سے خدا قوموں کو سر بلندی عطا فرما کر ان کو امور خیر میں پیشرو بناتا ہے تاکہ ان کی اقتدار کی جائے اور ان کے نقوشِ قدم پر چلا جائے اور ان کے مشوروں کو آخری فیصلہ قرار دیا جائے فرشتوں کو ان کی دوستی محبوب و مرغوب ہے وہ اپنے پردوں کو ان سے مس کرتے ہیں اور اپنی نمازوں میں ان کے لئے بخششِ ثواب کرتے ہیں بلکہ ہر خشک و تر حتیٰ کہ دریاؤں کی مچھلیاں اور دوسرے جانور۔ زمین کے درندے اور چوپائے آسمان اور اس کے ستارے ان کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ آگاہ رہو! علم دلوں کی زندگی، آنکھوں کا نور اور جسموں کی طاقت ہے۔ یہ انسان کو شرفِ فاء کی منازل اور سلاطین کی مجالس تک پہنچاتا ہے اس میں غور و خوض و رد و بدل کے برابر اور اس کی درس و تدریس عبادت کے برابر ہے اور اسی کے ذریعے سے حرام و حلال کی پہچان اور صلہ و رحمی ہوتی ہے علم عمل کا پیش رو اور عمل اس کا مقتدی ہے یہ نیک بختوں کو عطا ہوتا ہے اور بد بخت اس سے محروم رہتے ہیں۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا ہم اولو العلم ہیں اور ہم ہی حلال و حرام کو جانتے ہیں (البرہان)

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوْتُوا الْكِتَابَ إِلَّا

تحقیق دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے اور نہیں اختلاف کیا۔ ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی

مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ

بعد آجانے علم کے باہمی حسد کی وجہ سے اور جو کفر کرے آیاتِ خدا سے تو تحقیق

اللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ

اللہ جلد حساب لینے والا ہے پس اگر وہ آپ سے جھگڑیں تو فرما دیجئے کہ میں نے اللہ کے لئے سر جھکا دیا ہے اور

اتَّبَعِنِ قُلُوبُ الَّذِينَ أُوْتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ ۚ أَسْلَمْتُمْ فَإِنْ أَسْلَمُوا

میرے تابع ہوں ان کے دلوں میں بھی اور ان پر جو لوگوں کو کیا تم نے بھی (اس کے لئے) سر جھکایا ہے (اسلام لائے)

فَقَدْ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلْغُ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ۝

پھر اگر وہ اسلام لائیں تو وہ راہِ راست پر ہوں گے اور اگر منہ پھیر لیں تو آپ کے ذمہ صرف تبلیغ ہے اور خدا نواز نگران ہے بندوں پر

آیت مجیدہ شہد اللہ اَنْتَ اَخْرَجْتَ پڑھنے کے متعلق انس نے جناب رسالت مآب سے روایت کیا ہے کہ سوتے وقت یہ آیت مجیدہ تلاوت کرے تو خداوند کریم ستر ستر مخلوق پیدا فرماتا ہے جو تا قیام قیامت اس کے لئے استغفار کرتے رہیں گے۔ نیز جناب رسالت مآب سے مروی ہے کہ جب اس آیت مجیدہ کی تلاوت کرنے والا بارگاہِ خدا میں پیش ہوگا تو خدا فرمائے گا میرے اس بندے کا مجھ سے عہد ہے اور میں عہد کو پورا کرنے کا سب سے بڑا حقدار ہوں پس میرے اس بندہ کو داخل جنت کر دو۔ سعید بن جبیر سے منقول ہے کہ کعبہ کے پاس ۳۶۰ بت تھے جب یہ آیت اتری تو سب بت سجدہ میں سرنگوں ہو گئے۔

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ۔ تفسیر برہان اور مجمع البیان میں تفسیر قمی سے منقول ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اسلام کی ایسی نسبت بیان کرتا ہوں جو نہ مجھ سے پہلے کسی نے بیان کی اور نہ میرے بعد کوئی بیان کرے گا اور وہ یہ کہ اسلام تسلیم کا نام ہے اور تسلیم یقین کا نام ہے اور یقین تصدیق ہے اور تصدیق کا مطلب اقرار ہے اور اقرار کا معنی ادا کرنا ہے مومن اپنا دین خدا سے لیتا ہے اور اس کا ایمان اس کے عمل سے پہچانا جاتا ہے اور کافر کا کفر اس کے انکار سے معلوم ہوتا ہے۔ اے لوگو! دین کو اختیار کرو۔ کیونکہ اس میں گناہ کرنا بے دینی کی نیکی سے بہتر ہے اس لئے کہ دین کے ہوتے ہوئے گناہ بخشا جاسکتا ہے لیکن بے دینی میں کوئی نیکی قابل قبول ہی نہیں ہے۔ بروایت ابن شہر آشوب امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ اسلام سے مراد حضرت علی ابن ابی طالب کی ولایت کا تسلیم کرنا ہے۔ نیز آپ نے فرمایا کہ ایمان کا درجہ اسلام سے بلند ہے جس طرح کہ کعبہ کا درجہ مسجد الحرام سے بلند ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيَّ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ

تحقیق جو لوگ کفر کرتے ہیں ساتھ آیات خدا کے اور قتل کرتے ہیں۔ نبیوں کو ناحق اور قتل کرتے

الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَيَشْرُهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝۲۱

ہیں ان کو جو امر کرتے ہیں انصاف کا لوگوں میں سے پس شہر درد ان کو عذاب دردناک کی

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۝۲۲

وہ وہی ہیں جن کے ضائع ہو گئے اعمال دنیا اور آخرت میں اور کوئی نہ ہوگا ان کا مددگار

(اقول) پہلی حدیث میں ہے کہ ایمان کی پہچان عمل سے ہے اور دوسری حدیث میں ہے کہ اسلام ولایت علی کو مان لینے کا نام ہے تو معلوم ہوا کہ جو ولایت کے قائل ہیں وہ مسلمان ہیں جو اس پر عمل کرتے ہیں وہ مومن ہیں اور جو ولایت کے قائل نہیں۔ وہ نہ مسلمان ہیں نہ مومن اسی بنا پر فرمایا۔ لَوْ اجْتَمَعَ النَّاسُ عَلَىٰ عُبَيْدِ اللَّهِ لَمْ يَخْلُقِ اللَّهُ الشَّامَ وَقَالَ حُبُّ عَلِيٍّ حَسَنَةٌ لَا يَصْرِفُهَا سَيِّئَةٌ وَبُغْضُ عَلِيٍّ سَيِّئَةٌ لَا يَنْفَعُهَا حَسَنَةٌ (ترجمہ) اگر تمام لوگ علی کی محبت پر جمع ہو جائیں تو خدا جہنم کو پیدا ہی نہ کرے اور فرمایا کہ علی کی محبت وہ نیکی ہے جس کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ نقصان دہ نہیں ہوتا۔ اور علی کے ساتھ عداوت کرنا ایسا گناہ ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی نیکی فائدہ مند نہیں ہوتی۔

اور دوسرے رکوع کے ذیل میں اللہ و رِیِّ الَّذِينَ آمَنُوا کی تفسیر میں بھی اسی مطلب کی بعض حدیثیں مذکور ہو چکی ہیں نیز مقدمہ انوار الجنف ص ۲۴ پر بھی ملاحظہ ہوں یعنی حضرت علی کی ولایت رکھنے والے گناہوں سے توبہ کر لیں تو ان کی توبہ قبول ہوتی ہے اور گناہوں کے نقصان سے بچ جاتے ہیں اور دشمن علی کی نیکی قبول اور نہ گناہ سے توبہ قبول ہوتی ہے۔

رکوع عا

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا - کہتے ہیں کہ یہ آیت یہودیوں کے حق میں اتری۔ ابو عبیدہ بن جراح سے مروی ہے کہ جناب سالتاب سے میں نے دریافت کیا کہ سخت ترین عذاب میں کون لوگ ہوں گے تو آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو کسی نبی کو قتل کریں یا ایسے انسان کو قتل کریں جو نیکی کا امر کرنے والا اور برائی سے روکنے والا ہو۔ پس آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی اور پھر فرمایا۔ اے ابو عبیدہ بنی اسرائیل نے ۴۲ نبی بوقت صبح ایک گھنٹہ کے اندر قتل کئے۔ پس بنی اسرائیل کے عبادت گزار لوگوں کی ایک جماعت جن کی تعداد ایک سو بارہ تھی، نے ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا تو ان کو اسی دن پچھلے پہر قتل کر دیا گیا۔

تنبیہ - اگرچہ اس فعل بد کے مرتکب تو وہ لوگ تھے جو بوقت نزول آیت موجود نہ تھے لیکن چونکہ موجودہ یہود بھی ان کے اس فعل پر راضی تھے لہذا ان کو اس فعل کا مجرم قرار دے کر خطاب کیا گیا۔ پس معلوم ہوا کہ جو لوگ کسی مومن یا معصوم کے قاتل کی پاس کریں۔ اور

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أَوْتُوا نَصِيًّا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَى كِتَابِ اللَّهِ

کیا تم نے نہیں دیکھا اُن کو جنہیں دیا گیا ہے حصہ کتاب سے اُن کو بلایا جاتا ہے طرف کتاب خدا کے تاکہ وہ فیصلہ کرے

لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّى فِرْقٍ مِّنْهُمْ وَهُم مَّعْرُضُونَ ﴿۳۷﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ

ان کے درمیان پھر پیٹھ پھینکتا ہے ایک گروہ ان کا رد گردانی کرتے ہوئے یہ اس لئے کہ انہوں

قَالُوا لَنُتَمَسَّ النَّارَ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ وَغَرَّبُوا فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۳۸﴾

نے کہا ہمیں ہرگز آگ نہ چھوئے گی مگر چند دن گئے چٹنے اور ان کو دھوکا دیا اپنے دین کے معاملہ میں اُن کی من گھڑت باتوں نے

اُن کے اس بذِعل پر راضی ہوں تو وہ بھی قاتل کی طرح مذمت کے مستحق ہیں پس اس آیت کا ظاہر اگرچہ بنی اسرائیل کے حق میں ہے۔
لیکن اس کا باطن تمام ان لوگوں سے متعلق ہے جو ان جیسا فعل کریں۔

بِغَيْرِ حَقٍّ :- یہودیوں کو اس امر پر مذمت کرنا کہ وہ ناحق نبیوں کو قتل کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بعض اوقات ان کا قتل برحق بھی ہوتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ انبیاء کا قتل جو فعل ناحق ہے، کا ارتکاب کرتے ہیں یعنی بغیر حق کا کلمہ تاکید و مبالغہ کے لئے ہے کلمہ احتراز یہ نہیں ہے تاکہ اشکال لازم آئے۔

الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ :- سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب امر بالمعروف کرنے پر قتل کا خطرہ ہو تو کیا ایسی صورت میں بھی امر بالمعروف جائز ہے؟ تو اس مقام پر بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہاں، ایسی صورت میں امر بالمعروف جائز ہے چنانچہ جناب رسالتاً سے ایک حدیث وارد ہے کہ أَنْفَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَبَّارٍ يُقْتَلُ عَلَيْهِ - یعنی بہترین جہاد ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے جس پر وہ قتل کر دیا جائے لیکن ہمارے نزدیک امر بالمعروف کے حق کے لئے شرط یہ ہے کہ اس پر کوئی مفسدہ لازم نہ آتا ہو۔ لہذا یہ آیت مجیدہ یا اس قسم کی روایات کا مطلب یہ ہے کہ امر بالمعروف کرنے والے کو جب یہ ظن ہو کہ میری نصیحت پر غالباً کوئی ضرر مترتب نہ ہوگا تو اس وقت امر بالمعروف جائز اور مستحسن ہے پس اگر اس کو خلافت توقع ضرر پہنچ جائے اور اس نتیجہ میں وہ قتل بھی کر دیا جائے تو پھر کوئی حرج نہیں ہے ورنہ اگر پہلے سے ہی معلوم ہو کہ امر بالمعروف میں بجائے فائدہ کے نقصان ہی ہوگا تو ایسی صورت میں امر بالمعروف ساقط ہے۔

يُدْعَوْنَ إِلَى كِتَابِ اللَّهِ :- ابن عباس سے مروی ہے کہ خیبر کے یہودیوں میں سے ایک مرد و عورت نے زنا کا ارتکاب کیا اور وہ دونوں بڑے خاندان کے فرد تھے ان کی کتاب میں اسکی سزا رجم کرنا تھا لیکن وہ لوگ ان کو بچانا چاہتے تھے۔ پس جناب رسالتاً کی خدمت میں آئے کہ یہاں شاید کچھ گنجائش ہو۔ لیکن آپ نے بھی رجم کا حکم دے دیا۔ تو یہودیوں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ کہ حضور! یہ تو ان پر ظلم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ چلو تورات کا فیصلہ منظور کر لو۔ انہوں نے کہا یہ بالکل درست ہے۔ آپ نے فرمایا۔

فَكَيْفَ إِذَا جُمِعْتُمْ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ وَوَفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ

پھر کیا حال ہوگا جب اُن کو جمع کریں گے اس دن جس میں کوئی شک نہیں اور پورا دیا جائے گا ہر نفس کو اپنی کمائی (کا بدلہ)

وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ قُلِ اللَّهُمَّ مَلِكُ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ

اور ان کو خسارہ نہ دیا جائے گا تم کہو۔ اے اللہ مالک ملک عطا فرماتا ہے ملک تو جسے چاہے

تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَاءُ ۝

اور اُسے سیتا ہے ملک تو جس سے چاہے اور تو عزت دیتا ہے جسے چاہے اور ذلیل کرتا ہے جسے چاہے

بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

تیرے ہاتھ میں محبت ہے۔ تحقیق تو ہر شے پر قادر ہے۔

تم میں سے تورات کا بڑا عالم اس وقت کون ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ وہ مرد اعور ہے یعنی ایک چشم ابن صوری نامی جو فدک کا باشندہ ہے پس اس کو منگوایا گیا۔ آپ نے باطلاع جبریل اس کو خطاب کیا کہ کیا تو ابن صوری ہے؟ کہا۔ ہاں فرمایا تو ان کا بڑا عالم ہے؟ کہنے لگا ایسا ہی لوگ کہتے ہیں۔ پس آپ نے تورات کا وہ حصہ منگوایا جس میں حکم رجم موجود تھا۔ فرمایا کہ پڑھو۔ تو اس نے پڑھنا شروع کیا۔ لیکن جب رجم کی آیت پہنچا تو اس پر اپنا ہاتھ رکھ کر اُگے نکل گیا۔ عبداللہ بن سلام نے عرض کی۔ حضور! یہ تو آیت رجم چھوڑ کر اُگے جارہا ہے اور پھر خود اٹھ کر اس کا ہاتھ ہٹا کر وہ آیت پڑھی جس میں رجم کا حکم تھا کہ محسن مرد اور محسنہ عورت اگر زنا کریں اور گواہوں سے ثابت ہو جائے تو ان کو رجم کرنا واجب ہے لیکن اگر عورت حاملہ ہو تو وضع حمل تک اس کو مہلت دینی چاہیے۔ پس حضور نے حکم نہ دیا کہ ان کو رجم کیا جائے چنانچہ وہ سنگسار کئے گئے اور اس پر یہودی اور زیادہ انحضرت پر غصے ہوئے۔ مجمع البیان اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ۔ اس سے مراد یا تو یہ ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمیں صرف چالیس دن عذاب ہوگا کیونکہ اتنے ہی دن انہوں نے گوسالہ پرستی کی تھی اور یا یہ کہ وہ کہتے تھے ہمیں سات دن عذاب ہوگا۔ يَخْتَرُونَ۔ ان کا افتراء یہ تھا کہ وہ باوجود ان باتوں کے اپنے آپ کو ابناء اللہ کہتے تھے۔ یعنی ہم اللہ کے بیٹے ہیں یا یہ افتراء مقصود ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمیں چند معین ایام میں ہی عذاب ہوگا۔ اور اس کے بعد ہم جنتی ہو جائیں گے۔

قُلِ اللَّهُمَّ مَا لَكَ الْغُلُوكَ۔ تفسیر مجمع البیان میں بطریق البیات حضرت رسالت اکرم سے ایک حدیث میں ہے کہ فرماتا ہے مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم کہ جو بندہ ہر فریضہ نماز کے بعد سورۃ فاتحہ، آیتہ الکرسی، شہد اللہ اور یہ آیت بغیر حساب تک پڑھے تو اس کی خطیقہ القدس میں جگہ ہوگی۔ یا ہر روز ستر مرتبہ اس پر نظر رحمت ہوگی۔ یا ہر دن اسی کی ستر حاجات پوری کی جائیں گی جن

تَوَلَّجَ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتَوَلَّجَ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ

تو داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور نکالتا ہے زندہ کو مردہ

الْبَيْتِ وَتُخْرِجُ الْبَيْتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْسُقُ مِنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۱۴

سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور تو رزق عطا فرماتا ہے جسے چاہے بلا حساب

میں سے کم از کم مغفرت ہے اور یا اس کو ہر دشمن سے محفوظ رکھوں گا اور اس کا ناصر رہوں گا اور اس کے اور جنت کے درمیان صرف موت کا ہی فاصلہ ہوگا۔

معاذ بن جبل کہتا ہے کہ میں ایک دفعہ نماز جمعہ میں شریک نہ ہو سکا جب بارگاہ رسالت میں شرفیاب ہوا تو آپ نے غیر حاضری کی وجہ پوچھی۔ میں نے عرض کیا۔ حضور۔ یوحنا یہودی کا میرے اوپر قرضہ ہے اور وہ میری تار میں تھا اس لئے میں نے گھر سے نکالنا پسند نہ کیا تاکہ مجھے روک نہ لے۔ آپ نے فرمایا۔ اے معاذ۔ کیا تو قرضہ کی ادائیگی چاہتا ہے۔ میں نے عرض کی۔ جی ہاں! آپ نے فرمایا یہ دو آیتیں پڑھا کرو اور اس کے بعد کہو۔ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ وَالْآخِرَةُ وَاسَ حَيْثُمَا تَعْطَى مِنْهُمَا مَا تَشَاءُ وَتَسْتَمِعُ مِنْهُمَا مَا تَشَاءُ رَاقِصٌ عَبْنِي دُنْيَا۔ اگر ایسا کر دے تو پھر اگر روئے زمین کے برابر سونا بھی تیرے اوپر قرضہ ہوگا۔ تو خداوند کریم اس کو ادا کرے گا۔

شان نزول

تفسیر مجمع البیان میں منقول ہے کہ جناب رسالتؐ نے جنگ احزاب کے موقع پر خندق کی کھدائی کے لئے صحابہ کے لئے چالیس ذراع مقرر کئے عہد اور انصار میں ہر جماعت سلمان کو اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتی تھی تو حضورؐ نے فرمایا۔ اَلْسَلَامُ مِمَّا اَهْلُ الْبَيْتِ۔ پس خندق کی کھدائی شروع ہوئی۔ تو نیچے سے ایک پتھر سخت ایسا نکلا کہ اس پر کدال کام نہ کرتی تھی۔ پس سلمان جناب رسالتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ماجرا سنایا۔ تو آنحضرتؐ بنفس نفیس خود تشریف لائے اور پھر سلمان کے ہمراہ خندق میں اترے اور سلمان کے ہاتھ سے لے کر اس کو پتھر پر مارا۔ تو اس کا ایک حصہ توڑ دیا اور اس پتھر سے بجلی کی طرح ایک روشنی نمودار ہوئی۔ پس حضورؐ نے تکبیر کی آواز بلند کی۔ اور صحابہ نے بھی تکبیر پڑھی۔ پھر آپ نے دوبارہ اس کدال کو اس پتھر پر مارا۔ اور پھر اس کا ایک حصہ ٹوٹ گیا اور بجلی کی مانند ایک روشنی ظاہر ہوئی پس حضورؐ نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ اور صحابہ نے بھی تکبیر کہی۔ پھر حضورؐ نے سہ بارہ کدال کو اس پتھر پر مارا۔ کہ وہ پتھر بالکل ٹوٹ گیا اور مثل سابق روشنی نمودار ہوئی۔ پس حضورؐ نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور صحابہ نے بھی تکبیر کہی۔ اس کے بعد حضورؐ سلمان کے ہاتھ کو پکڑ کر خندق سے باہر تشریف لائے۔ تو سلمان نے عرض کی۔ یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ آج میں نے آپ سے نئی بات دیکھی ہے۔ پس حضورؐ متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ جب میں نے پہلی ضرب لگائی اور روشنی پیدا ہوئی تو میں نے اس میں حیرہ اور مدائن کے محل دیکھے اور جبریلؑ نے بتایا کہ آپ کی امت کو اس پر غلبہ ہوگا۔ لہذا میں نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ جب دوبارہ میں نے پتھر پر کدال کی ضرب لگائی۔

اور روشنی ظاہر ہوئی تو میں ملک روم کے محلات دیکھے اور جبریل نے خبر دی کہ آپ کی امت کو ان پر بھی غلبہ ہوگا اور تیسری دفعہ ملک صنعاء کے محل دکھائی دیئے اور جبریل نے ان پر بھی مجھے فتح کی خوشخبری سنائی۔ پس جب جناب رسالت اکرم نے مسلمانوں کو یہ بشارت دی تو سب مسلمان خوش ہوئے۔ اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ یہ سن کر منافقین ہنسنے لگے اور کہنے لگے کہ عجیب بات ہے کہ ادھر ڈر کے مارے خندق کھود رہے ہیں اور کھلے میدان میں لڑائی کی جرات نہیں کرتے لیکن ادھر ایران و روم کی فتح کی دل میں امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ پس یہ آیت نازل ہوئی کہ ان آیات کا رد کیا کر دو۔

(۱) ملک اور ملک دو جدا لفظیں ہیں۔ اور ان کے معانی الگ الگ ہیں۔ صاحب ملک کو ملک کہا جاتا ہے اور صاحب ملک کو ملک کہا جاتا ہے اس آیت میں مالک کو ملک کی طرف مضاف کر کے اس مطلب کو واضح کیا گیا کہ موجودات عالم کی ملک اور ملک ہر دو درحقیقت اللہ کے قبضہ میں ہیں اور تمام مخلوق کی ملک یا ملک اسی کا عطیہ ہے جس کو وہ کسی شئی کا ملک عنایت فرماتا ہے وہ اس چیز کا مالک ہوتا ہے اور جس کو وہ ملک عطا کرتا ہے وہ اس کا ملک اور بادشاہ ہوتا ہے۔

(۲) خیر صفت مشبہ ہے اس کا اصل معنی ہے انتخاب۔ پس اسی شئی کو خیر کہا جاتا ہے جسے اس کے مقابل کی چیزوں سے منتخب کیا جائے بعضوں نے اس کو صیغہ افضل التفصیل قرار دیا ہے اور اس کی اصل اخیر بیان کی ہے حالانکہ بالکل اشتباہ اور بے سود تکلف کیونکہ چند اشیا یا متعدد معانی میں سے جس کو خیر کہا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ نظر انتخاب میں اس کو باقیوں سے سبقت حاصل ہے اور یہ انتخاب صرف اس کے مادہ کی دلالت سے ہے نہ کہ صیغہ کی طرف سے۔ اور چونکہ اس کو افضل کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے مثلاً افضل القوم کی جگہ خیر القوم کہا درست ہے پس اسی بناء پر اس کو افضل التفصیل قرار دے کر اس کی اصل اخیر تجویز کرنے کا تکلف کیا گیا ہے حالانکہ چند چیزوں میں سے افضل اس کو کہا جائے گا جب اس کے مقابل کے چیزوں میں اصل فضیلت موجود ہو اور اس میں بہ نسبت ان کے زیادتی پائی جائے لیکن خیر کے محل استعمال میں یہ چیز ضروری نہیں مثلاً قُلْ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ مِنَ اللَّهِ قَوْلًا (کہو کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ لہو سے بہتر ہے) یہاں انعامات اخرویہ کو لہو سے خیر کہا گیا ہے حالانکہ انعامات خداوندی اور لہو میں کوئی قدر مشترک نہیں تاکہ زیادتی صفت کے لحاظ سے انعامات خداوندی کو برتری حاصل ہو بلکہ یہاں تو صاحبان عقل و دانش کو عقلی نظریہ کے ماتحت تنبیہ کیا گیا ہے کہ تمہاری نظر انتخاب بجائے لہو و لعب کے نعمات اخروی پر ہونی چاہئے اور یہ خیر کی ذاتی دلالت ہے نہ کہ تفصیلی معنی۔

(۳) بِمِثْلِ الْخَيْرِ جار مجرور کو مقدم کرنے میں حصر کو ظاہر کیا گیا ہے اور الخیر پر الف لام اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ جملہ امور خیر کا فیضان صرف اسی ذات کی طرف سے ہی ہے خواہ تکوینیات سے ہوں یا تشریعیات سے ہوں۔ ملک و عزت کا مرجع واحد وہی ہے اور مالکان ملک اور صاحبان عزت اسی ذات کے ممنون احسان ہیں پس یہ خیر تکوینی ہے اور جملہ عبادات و اعمال صالحہ چونکہ اسی کی توفیق سے ہیں اگرچہ عبد کو ان کی بجا آوری میں اختیار حاصل ہے اور یہ خیر تشریعی ہے۔ پس تمام امور خیر کا حصر

اس کی ذات میں صحیح ہے اور موجودات عالم میں صاحبان خیر اسی ذات سے مستفیض ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس کی ذات صرف خیر کا ہی افاضہ ہوتا ہے اور خیر کا عدم چونکہ شر ہے اور عدم فاعل کا فعل نہیں ہوا کرتا بلکہ فعل کا عدم ہوا کرتا ہے پس کسی پر خیر کا افاضہ نہ ہونا شر ہے اور چونکہ خیر کی نسبت اللہ کی طرف حقیقی ہے۔ لہذا اس کے عدم (شر) کو بھی مجازاً اس کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔

(۴) رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرنے کا مطلب ظاہر یہ ہے کہ خط استوا سے میل شمس کی کمی و بیشی کی بدولت شب و روز میں جو تفاوت ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے کبھی رات کا حصہ دن میں اور کبھی دن کا ایک حصہ رات میں داخل ہو جاتا ہے مثلاً اعتدال ربیع کے زمانہ میں یعنی جب سورج بروج حمل میں داخل ہوتا ہے تو اس وقت سورج سیدھا خط استوا پر ہوتا ہے اور دن رات تقریباً برابر ہوتے ہیں اس کے بعد سورج خط استوا کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور رات کا کچھ حصہ روزمرہ دن میں داخل ہو کر رات میں تدریجی طور پر کمی اور دن میں اسی نسبت سے زیادتی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ سورج اپنی میل شمالی میں آخری درجہ تک پہنچ جاتا ہے اس کے بعد تدریجاً میل کم ہونا شروع ہوتی ہے جس سے رفتہ رفتہ دن میں کمی اور رات میں زیادتی پیدا ہوتے ہوتے جب سورج دوبارہ خط استوا پر پلٹ آتا ہے تو رات دن پھر برابر ہو جاتے ہیں اور وہ زمانہ اعتدال خریفی کا ہوتا ہے جبکہ سورج کا داخلہ بروج میزان ہوتا ہے۔ اس کے بعد سورج کی خط استوا سے میل جنوبی شروع ہوتی ہے جس کی وجہ سے دن کا کچھ حصہ روزمرہ تدریجاً رات میں داخل ہوتا جاتا ہے۔ پس رفتہ رفتہ دن گھٹتا جاتا ہے اور رات بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ میل جنوبی اپنے آخری درجہ پر پہنچتی ہے اور اس کے بعد پھر آہستہ آہستہ نقطہ اعتدال ربیع کی طرف رجوع ہوتا ہے پس تقریباً چھ مہینے رات کا کچھ حصہ دن میں داخل ہوتا ہے اور یہ ابتدائے موسم گرما سے لے کر ابتدائے موسم سرما تک ہے اور تقریباً چھ مہینے دن کا کچھ حصہ رات میں داخل رہتا ہے اور یہ ابتدائے موسم سرما سے لے کر ابتدائے موسم گرما تک کا زمانہ ہے اور سال بھر میں صرف دو دن تقریباً رات اور دن اپنی اپنی حدود کے اندر رہتے ہیں اور وہ ایک دن جبکہ سورج اعتدال ربیع میں خط استوا پر آتا ہے اور دوسرا دن جبکہ سورج اعتدال خریفی میں خط استوا پر ہوتا ہے۔

(۵) مردوں کو زندوں سے اور زندوں کو مردوں سے نکالنے کا مطلب یہ ہے کہ مومن سے کافر اور کافر سے مومن پیدا کرتا ہے اور ممکن ہے کہ یہاں تعظیم مراد ہو۔ تاکہ انسان و حیوان کا نطفہ سے اور نباتات کا مٹی سے پیدا ہونا اور پھر خروج رُوح کے بعد ان کا خاکستر ہو کر حالت مَرُوفی سے ہم آغوش ہونا بھی اس میں داخل ہو جائے۔

(۶) دونوں آیتوں میں تقابل کی جو لطیف صنعت پیش کی گئی ہے وہ اسی کلام بلاغت نظام کا ہی حصہ ہے۔ پہلی آیت میں ملک عطا کرنے اور ملک لے لینے کے مقابلہ میں دوسری آیت میں رات کو دن میں داخل کرنا اور دن کو رات میں داخل کرنا مذکور ہے کیونکہ ملک عطا کرنے کا مطلب ہے کہ بعض افراد کو بعض پر حتی تصرف دیا گیا ہے اور اس کی مناسبت رات کو دن میں داخل کرنے کے ساتھ ہے وہاں بھی نور کو ظلمت پر تصرفِ شاہانہ حاصل ہے اور ملک کے زائل ہونے کو دن کے رات میں داخل ہونے

لَا يَتَّخِذُ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ

نہ پکڑیں مومن کافروں کو دوست مومنوں کو پھوڑ کر اور جو ایسا کرے گا

ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً وَ

پس اس کا اللہ سے کوئی واسطہ نہیں مگر اس صورت میں کہ تم کو ان سے ڈر لگتا ہو اور

يُحِذِّرُكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ وَالِلَّهِ الْبَصِيرُ ﴿٢٨﴾

ڈرتا ہے تمہیں خدا اپنی ذات سے اور اللہ کی طرف ہی بازگشت ہے

سے مناسب ہے یعنی دن کا رات پر غالب آنا حکومت سے اور رات کا دن پر چھا جانا زوال حکومت سے موزوں و مناسب ہے۔ اسی طرح پہلی آیت میں عزت و ذلت کا مقابلہ دوسری آیت کے زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے سے کیا گیا ہے کیونکہ ذلت کے بعد عزت، موت کے بعد زندگی سے اور عزت کے بعد ذلت زندگی کے بعد موت سے مشابہ ہے نیز پہلی آیت کے آخر میں عطائے ملک و عزت کو خیر سے تعبیر کیا گیا اور دوسری آیت کے آخر میں اس کو رزق کہا گیا۔ کیونکہ اللہ کی طرف سے جو کچھ عطا ہو وہ خیر بھی ہوتا ہے اور رزق بھی۔

(۴) پہلی آیت میں ملک و عزت کے عطا کرنے کا ذکر تھا لہذا اس کو اپنی قدرت کے محیط ہونے کے ذکر سے ختم کیا اور دوسری آیت میں چونکہ اپنی عطا و بخشش کو رزق سے تعبیر فرمایا۔ لہذا اس کے بعد بغیر حساب فرما دیا جو وسعت رزق پر دلالت کرتا ہے اور یہاں حساب کا معنی عوض ہے نہ کہ اندازہ۔ یعنی خدا کا رزق بلا معاوضہ ہے کیونکہ کائنات کی ہر شے جب اس کی ملکیت اور اسی کا عطا کردہ رزق ہے تو جس چیز کو عوضہ قرار دیا جائے گا وہ بھی بعینہ اس کا رزق ہوگا پھر عوض کیسے بن سکے گا اور یہ کہنا کہ خدا کا رزق بلا اندازہ اور بغیر مقدار کے دیتا ہے دوسری قرآنی آیات کے خلاف ہے۔

إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً ۚ آیت مجیدہ کا مطلب یہ ہے کہ مومن کے لئے ناجائز ہے کہ کافروں سے دین

جواز تقیہ

سے دوستانہ تعلقات رکھے بلکہ مومن کی دوستی صرف مومن سے ہی ہونی چاہیے البتہ صرف اس صورت میں مومن غیر مومن سے رواداری کے طور پر اظہار محبت کر سکتا ہے جبکہ مومنین کمزور ہوں اور وہ طاقتور ہوں اور اگر یہ ان کے ساتھ مراقت اور محبت کا اظہار نہ کریں تو ان سے اپنی عزت و جان و مال وغیرہ کا خطرہ ہو۔ پس ایسی صورت میں مومن کے لئے ان جیسا بن کر وقتی گدار کر لینا جائز ہے اور اسی کو تقیہ کہتے ہیں۔ یہ آیت مجیدہ جواز تقیہ پر نص ہے اور جو لوگ تقیہ کا انکار کرتے ہیں ان کا عملاً اس آیت پر ایمان نہیں۔

بعض اوقات تقیہ واجب ہو جاتا ہے جبکہ جان کا خطرہ ہو اور بعض اوقات مستحب و مباح وغیرہ جس طرح مقام کی مناسبت

قُلْ إِنْ تَخْشَوْنَ مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْذَرُ وَيَعْلَمُهُ اللَّهُ وَيَعْلَمُ مَا

فرما دیجئے کہ خواہ تم پھپھاؤ وہ جو تمہارے دلوں میں ہے یا ظاہر کرو خدا اُسے جانتا ہے اور نیز جانتا ہے جو

فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۶﴾ يَوْمَ تَجِدُ

کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے جس دن پائے گا

كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُحْضَرًا ۖ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ

ہر نفس عمل خیر (کی بڑا) کو حاضر اور عمل بد (کی بڑا کو بھی حاضر) تو جانتا ہوگا کاش! اس گناہ

تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًا وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ

اور میرے درمیان لمبی دوری ہوتی۔ اور ڈراتا ہے خدا تم کو اپنی ذات سے

وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۱۷﴾

اور خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے

ہو۔ بہر کیف تقیہ کے جواز پر علمائے امامیہ کا اتفاق ہے۔ کہتے ہیں مسلمہ کذاب نے دو صحابیوں کو پکڑا۔ اور ان سے اپنی رسالت کا اقرار کروانا چاہا۔ تو ایک نے جان کے خطرہ سے تقیہ کرتے ہوئے اقرار کر لیا۔ اور دوسرے نے جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اُس کی بات کو اُن سنا کر کے ٹال دیا۔ مسلمہ کذاب نے تین دفعہ بار بار پوچھا اور اُس نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ میری قوتِ سماع کم ہے لہذا میں تمہاری بات سننا نہیں ہوں آخر اس نے اس کو قتل کر دیا۔ جب جناب رسالتؐ کو یہ خبر پہنچی تو فرمایا کہ قتل ہونے والا اپنے صدق و ایمان پر قتل ہوا۔ اور درجہ فضیلت پر فائز ہوا۔ پس وہ اس کو مبارک ہو۔ لیکن دوسرا شخص پس اُس نے خدا کی رخصت کو قبول کیا۔ لہذا اس سے بھی اس معاملہ میں کوئی باز پرس نہیں ہے گویا اس روایت سے یہ ظاہر ہوا کہ بصورتِ خوف بھی حتیٰ کا ظاہر کرنا افضل ہے لیکن تقیہ کا کرنا بھی حرام نہیں ہے بلکہ مباح اور جائز ہے لیکن ائمہ اہلبیتؑ سے تقیہ کے جواز پر بلکہ بعض مقامات پر اس کی افضلیت بلکہ وجوب پر بکثرت روایات موجود ہیں۔

یَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ فِي السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۸﴾ اِنَّهَا النَّاسُ! اللہ سے ڈرو اور یقین جانو کہ تمہاری بازگشت اسی کی طرف ہے پس دنیا میں نیکی یا بدی جو بھی کسی نے کی ہوگی۔ وہاں اس کا بدلہ اس کو ملے گا اور برائی کرنے والا اسی وقت پچھتاوے گا اور کہے گا کاش! اس برائی اور میرے درمیان بڑی دوری ہوتی۔ اور خدا خود تمہیں اپنے (قہر و غضب) سے ڈراتا ہے۔ مقامِ افسوس ہے تیرے لئے اے غافل آدمی

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ

فرمادیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تاکہ اللہ تم کو محبوب رکھے اور بخش دے

ذُنُوبِكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ

تمہارے گناہ اور خدا بہت بخشنے والا رحم کرنے والا ہے فرمادیجئے اطاعت کرو اللہ و رسول کی

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ﴿۳۲﴾

پس اگر روگردانی کریں تو تحقیق اللہ نہیں محبوب کافروں کو

کیونکہ تجھ سے تو غفلت نہ برقی جائے گی۔ اے ابن آدم: موت تیری طلب میں بہت تیزی سے تیری طرف متوجہ ہے اور بہت جلد تجھے پائے گی جبکہ تیری اجل پوری ہوگی اور قبضِ روح کے بعد تو قبر میں تنہا جائے گا۔ پس تیری روح کو پلٹایا جائے گا اور منکر و نکیر تجھ سے سوال کرنے اور تیرا امتحان لینے کے لئے تیرے پاس پہنچ جائیں گے۔ پس تجھ سے تیرے رب، تیرے نبی، تیرے دین، تیری کتاب اور تیرے امام کے متعلق دریافت کریں گے پھر پوچھیں گے کہ اپنی عمر کہاں گنوائی اور اپنا مال کہاں سے حاصل کیا اور کہاں پر خرچ کیا۔ پس بچاؤ کی صورت بناؤ اور اپنے نفس کے لئے فائدہ سوچو اور امتحان و آزمائش و سوال و جواب کے لئے تیاری کرو اگر تم مومن یا معرفت اور سچوں کے اطاعت گزار اور اولیاء اللہ کے دلا رکھنے والے ہو گے تو خدا تمہیں جواب سکھا دے گا اور تمہاری زبان پر درست کلمات اور صحیح جواب جاری کر دے گا اور تمہیں رضوانِ خدا اور بہشت کی خوشخبری سنائیں گے اور فرشتے بشارت اور خوش روئی کے ساتھ تمہارا استقبال کریں گے۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو زبانِ رک جائے گی۔ رحمت کمزور ہوگی۔ جواب نہ بن سکے گی جہنم کی بشارت ہوگی اور عذاب کے ملائکہ جہنم پہنچانے کے لئے آجائیں گے۔

اے ابن آدم: اس کے بعد بہت بڑا ہولناک اور روح فرسا منظر قیامت کا دن ہوگا جس دن تمام لوگوں کو جمع کیا جائے گا۔ اور خدا اولین و آخرین کو جمع کرے گا اور پھر آپ نے فرمایا کہ وہاں اغزشوں کی معافی نہ ہوگی۔ فدیہ نہ لیا جائے گا۔ عذر قبول نہ ہوگا اور توبہ کی گنجائش نہ ہوگی بلکہ وہاں تو صرف یا نیکی کا بدلہ اور یا برائی کا بدلہ ہی ہوگا۔

رکوع ۱۲

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ رَیَہ آیت کھلے لفظوں اعلان کر رہی ہے کہ محبت کا دعویٰ صرف زبانی کافی نہیں جب تک عملی طور پر اس محبت کی تصدیق نہ ہو۔ ایک روایت میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے مَنْ سَرَّ أَنْ يَخْلُقَ أَنْ اللَّهَ يَجِبَهُ فَلْيَعْمَلْ بِطَاعَةِ اللَّهِ وَلْيَتَّبِعْنَا الْخَيْرَ۔ (جس کو یہ پسند ہو کہ وہ جان لے کہ اللہ اس سے محبت رکھتا ہے تو اسے اللہ کی

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى

تختِ شہادت پر چن لیا آدم اور نوح اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو تمام

الْعَالِينَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۳۴﴾

جہانوں سے حالانکہ یہ ذریت بعض بعض سے ہے اور اللہ سنے جانے والا ہے

اطاعت اور ہماری پیروی کوئی چاہیے اس مقام پر مولانا مقبول صاحب مرحوم کو ایک اشتباہ ہوا ہے کہ انہوں نے مَنٹ شرطیہ کو مَنٹ حرف جو سمجھا اور سَکَر کو شرط کو سَکَر محذور مَنٹ کا قرار دیا حدیث پاک کے مذکورہ جملہ کا ترجمہ یوں بیان کیا کہ (اسرارِ دین میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بندہ جان لے کہ خدا اُس سے محبت رکھتا ہے پھر وہ خدا کی اطاعت کرے اور ہماری پیروی) حالانکہ یہ ترکیب اور ترجمہ بالکل غلط ہے اور درست دہی ہے جو ہم عرض کر چکے ہیں اس کے بعد آپ نے آیت مجیدہ کی تلاوت فرمائی۔ پھر فرمایا۔ خدا کی قسم کبھی کوئی بندہ اللہ کا اطاعت گزار نہیں ہوتا۔ مگر یہ کہ خدا اپنی اطاعت کے اندر ہماری اتباع اس کے دل میں ڈالتا ہے اور قسم بخدا کہ کوئی بندہ ہماری اتباع نہیں کرتا۔ مگر یہ کہ اس سے اللہ محبت رکھتا ہے اور بخدا کوئی شخص ہماری اتباع کو نہیں چھوڑتا مگر یہ کہ وہ ہمارے ساتھ بغض رکھتا ہے اور بخدا ہمارے ساتھ جو بھی بغض رکھے گا وہ اللہ کا نافرمان ہوگا اور جو بھی اللہ کا نافرمان ہو کر مرے گا اس کو خدا رسوا کرے گا۔ اور اوندھے منہ اس کو جہنم میں ڈالے گا۔ ایک حدیث میں حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ اس امت میں سے جو بھی ہمارے حق کا عارف ہوگا۔ وہ ناجی ہوگا۔ سوائے تین قسم کے لوگوں کے۔ ایک حاکم ظالم کا ساتھی۔ دوسرا خواہش پرست۔ تیسرا اعلانیہ فسق کرنے والا۔ اور نیز آپ سے مروی ہے کہ دین تو صرف محبت ہی کا نام ہے۔ پھر اسی آیت سے استشہاد فرمایا کہ اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے تو اطاعت رسول کرو۔ پس خدا تم سے محبت رکھے گا۔ گویا اصل دین محبت ہے اور اطاعت اس کی فرع ہے۔ اور فرع کا درست نہ ہونا اصل کی کمزوری یا فقدان کی دلیل ہے۔ نیز آپ سے مروی ہے کہ فرمایا۔ اس شخص کی اللہ سے محبت نہیں جو اس کی نافرمانی کرے پھر آپ نے یہ اشعار پڑھے۔

تَعْصِي الْإِلَهِ وَأَنْتَ تَنْظِرُ حُبًّا هَذَا مُحَالٌ فِي الْفِعَالِ سَبْدٌ نِعْ

اللہ کی نافرمانی اور ساتھ اس کی محبت کا دعوے یہ بات قطعاً محال ہے

لَوْ كَانَ حُبُّكَ صَادِقًا لَأَطَعْتَهُ إِنَّ الْمَحِبَّ لَمَنْ يُحِبُّ مُطِيعٌ

اگر تجھے سچی محبت ہوتی تو اس کی اطاعت ضرور کرتا کیونکہ محب اپنے محبوب کا مطیع ہوا کرتا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک روایت میں ہے کہ اگر کوئی پتھر بھی ہماری محبت رکھتا ہوگا تو خدا اس کو بھی ہمارے ساتھ محشور کرے گا۔ کیونکہ دین تو محبت ہی کا نام ہے۔

فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ : خدا و رسول کی اطاعت کے حکم کے بعد یہ فرمانا کہ خدا کفر کرنے والوں کو محبوب نہیں رکھتا اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ خدا و رسول کی اطاعت کرنے یا نہ کرنے میں انسان خود مختار ہے پس اس سے عقیدہ جبر کی تردید ہو گئی کیونکہ اگر انسان اطاعت یا نافرمانی میں مجبور ہوتا تو خدا یہ نہ فرماتا کہ میں ان کو دوست نہیں رکھتا۔

إِنَّ اللَّهَ أَصْطَفَى : قرأت اہلبیت میں آل عمران کے بعد آل محمد کے لفظ ہیں بلکہ تفسیر برہان میں تفسیر ثعلبی سے منقول ہے کہ ابوہریرہ کہتا ہے کہ میں نے ابن مسعود کے مصحف میں آل عمران کے بجائے آل محمد پڑھا ہے اور بعض روایات میں ہے کہ آل ابراہیم سے مراد آل محمد ہے۔ جناب رسالتکتاب سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا۔ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ جب وہ آل ابراہیم اور آل عمران کا ذکر کریں تو خوش ہوتے ہیں اور جب آل محمد کا ذکر ہو تو ان کے دل گھٹتے ہیں اور مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے اگر کوئی شخص برد ز محشر ستر بنیوں کے اعمال کے برابر بھی نیک اعمال پیش کرے گا۔ تو اس کے اعمال مقبول نہ ہوں گے جب تک میری اور علی بن ابی طالب کی دلا کو پیش نہ کرے گا۔

آل عمران : عمران تین گزرے ہیں ایک حضرت موسیٰ اور ہارون کے والد ماجد دوسرے حضرت مریم کے والد، اور تیسرے حضرت ابوطالب کیونکہ ان کا نام دراصل عمران تھا۔ آیت مجیدہ میں بعض لوگوں نے آل عمران سے مراد حضرت موسیٰ و ہارون لئے ہیں اور بعض نے حضرت عیسیٰ مراد لئے ہیں اور تفسیر عمدة السببان میں ہے کہ تفسیر اہلبیت میں آل عمران سے مراد حضرت علی بن ابی طالب ہیں اور بروایت ابن عباس انہوں نے نقل کیا ہے کہ جناب رسالتکتاب نے فرمایا۔ کہ میں آل ابراہیم ہوں اور علی آل عمران ہیں۔

تنبیہ :۔ آل ابراہیم اور آل عمران کی لفظیں گویا عام ہیں لیکن ان سے مراد صرف وہ انسان ہو سکتے ہیں جو ظاہر اور معصوم ہوں کیونکہ اصطفاء غیر معصوم کا نہیں ہو سکتا اور نیز اس آیت سے یہ صاف طور پر معلوم ہوا کہ یہ لوگ ملائکہ سے افضل ہیں۔ کیونکہ ان کو عالمین پر چنا گیا ہے اور فرشتے عالمین میں داخل ہیں۔

وَاللَّهُ مُسْمِعٌ عَصِيَّةٍ : یعنی خدا ان کے اقوال سننے والا اور نیتوں کے جاننے والا ہے اور چونکہ ان کے اقوال و نیات میں کوئی نقص نہیں تھا بلکہ وہ ظاہری و باطنی دونوں قسم کی کثافتوں سے صاف تھے اور ظاہر و معصوم تھے لہذا تمام جہانوں پر ان کو مصطفیٰ بنا دیا۔

اِذْ قَالَتْ امْرَاَتُ عِمْرَانَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا

جب عرض کی زوجہ عمران نے اے رب! میں نے نذر کی ہے تیرے لئے وہ جو میرے شکم میں ہے کہ (وہ عباد کیلئے)

تَقَبَّلْ مِنِّیْ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ

آزاد ہوگا۔ پس تو قبول فرما میری نذر کو تحقیق تو سنتے جانے والا ہے پس جب اس کو جنا تو عرض کی اے رب! میں نے

اِنِّیْ وَضَعْتُهَا اُنْثٰی ۚ وَاَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعْتَ وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی

لڑکی جنی ہے اور خدا بہتر جانتا ہے کہ کیا جنا ہے اور نہیں لڑکا مثل لڑکی کے۔

وَ اِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَ اِنِّیْ اَعِیْذُهَا بِکَ وَ ذُرِّیَّتَهَا

اور میں نے اس کا نام مریم رکھا اور میں تیری پناہ میں دیتی ہوں اس کو اور اس کی اولاد کو

مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۳۶﴾

شیطان رجیم (کے شر) سے

حضرت مریمؑ کی پیدائش و تربیت

اِمْرَاةٌ عِمْرَانَ۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ عمران بن ہاشم حضرت سلیمان بن داؤد کی اولاد سے تھے اور بعض کہتے ہیں یہ عمران بن ناثان تھے۔ جو یہود بن یعقوب کی ستائیسویں پشت میں تھے اور عمران بن یصہر جو حضرت موسیٰ کے والد تھے ان کے اور ان کے درمیان اٹھارہ سو سال کا فاصلہ تھا اور ناثان کی اولاد اس زمانہ میں بنی اسرائیل کی سردار تھی قاقود بن قبیل کی دو لڑکیاں تھیں ایک کا نام حنہ تھا جو عمران کی زوجہ اور مریم کی والدہ تھیں اور دوسری کا ایشاع تھا جو حضرت زکریا کی زوجیت میں تھیں یعنی حضرت مریم اور حضرت یحییٰ ایک دوسرے کے خالہ زاد تھے۔ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ اَلْحَمْدُ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ عمران کو خدا نے وحی کی تھی کہ میں تجھے ایک مبارک فرزند عطا کروں گا جو مادر زاد نابینا اور مبرص کو شفا یاب کرے گا اور میرے اذن سے مردوں کو زندہ کرے گا اور میں اس کو بنی اسرائیل کا نبی بناؤں گا تو عمران نے اپنی زوجہ حنہ سے یہ بات بیان کی۔ پس جب اس کو حمل ہوا تو نذرمان لی کہ اے اللہ! یہ بچہ جو میرے پیٹ میں ہے اس کو خدمت مسجد اور عبادت کیلئے اپنی طرف سے آزاد کر دے گی درباریت بجا لانا اور ابو بصیر سے مروی ہے کہ میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے دریافت کیا کہ کیا عمران نبی تھا تو آپ نے فرمایا۔ ہاں وہ اپنی قوم میں نبی و مرسل تھا المیزان

مُحَسَّرًا :- یعنی آزاد۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اس سے اپنے کام کاج نہ کراؤں گی اور کہتے ہیں کہ جب کوئی لڑکا اس مطلب کے لئے آزاد کیا جاتا تھا تو اُسے عبادت خانہ میں ٹھیرایا جاتا تھا اور اس عبادت خانہ کی جھاڑو برداری، صفائی اور خدمت سنبھالنے تک اس کے ذمہ میں ہوتی تھی اور بلوغ کے بعد اس کو اختیار ہوتا تھا کہ وہاں ٹھیرا رہے یا چلا جائے پس یہاں تحریر کا معنی غلامی سے آزاد ہونا نہیں بلکہ حق ولایت جو اولاد پر ماں باپ کے لئے ثابت ہے اس کا ساقط کرنا یہاں مراد ہے۔

کہتے ہیں کہ حق کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی یہاں تک کہ بڑھ چکی ہو گئی۔ ایک دن ایک درخت کے نیچے بیٹھی تھی کہ دیکھا ایک پرندہ درخت پر اپنے بچہ کو دانہ بھرا رہا ہے یہ کیفیت دیکھتے ہی دل میں اولاد کی محبت بھرا گئی اور اللہ سے طلبِ فرزند کی دعا کی۔ تو خدا نے اس کو قبول فرمایا اور حضرت مریم سے حاملہ ہوئیں اور منت مانی کہ اس کو عبادت خانہ کی خدمت اور عبادت گزاری کے لئے آزاد رکھوں گی۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا - زمانہ حمل میں حق کے شوہر عمران کا انتقال ہو گیا تھا اور حق کو یہی خیال تھا کہ میرے پیٹ میں لڑکا ہی ہوگا اس لئے کہ خدا کی طرف سے بشارت تھی کہ میں اس کو رسول بناؤں گا اور عہدہ رسالت صرف مردوں کے لئے ہی ہوا کرتا ہے۔ لیکن اُن کے خلاف توقع جب لڑکی پیدا ہوئی تو گھبرا گئیں اور شرمساری محسوس کرتے ہوئے سر جھکا کر عرض کی کہ اے پلنے والے یہ تو لڑکی پیدا ہوئی ہے اور لڑکے اور لڑکی میں بڑا فرق ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک حدیث میں فرمایا کہ جب تمہارے بیٹوں یا پوتوں یا پڑپوتوں میں کوئی بات ہونے والی ہو اور ہم کہہ دیں کہ تم میں ایسا ہوگا۔ تو اس بات پر تعجب نہ کرو۔ جیسا کہ عمران کے نواسہ کو خدا نے رسول بنانا تھا۔ لیکن ان کو وحی یہ کہ میں تجھے فرزند دوں گا جو رسول ہوگا۔

مَسْتَبِينَهَا مَرْيَمَ - ان کی زبان میں مریم کا ترجمہ عابدہ ہوتا تھا جناب رسالتاں سے مروی ہے کہ تمام عالم سے خدا نے چار عورتوں کو منتخب فرمایا (۱) مریم بنت عمران (۲) آسیہ بنت مزاحم زوجہ فرعون (۳) خدیجہ بنت خویلد (۴) فاطمہ بنت محمدؐ۔

أَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا - مریم کے حسن قبول اور حسن تربیت کے متعلق کہتے ہیں کہ ان سے پہلے کوئی لڑکی بیت المقدس میں عبادت کے لئے نذر نہ کی جاتی تھی۔ پس یہ پہلی لڑکی تھی جس کو اس مطلب کے لئے خدا نے قبول فرمالیا اور حسن تربیت یہ کہ کبھی دن یا رات میں ایک گھنٹہ بھر کے لئے بھی ان کو بیماری لاحق نہ ہوتی یا یہ کہ حسن قبول کا مطلب ہے کہ سعادت کے راستے پر چلنے کی خدا نے زیادہ توفیق مرحمت فرمائی۔ حتیٰ کہ جب بعد از سال پہنچی تو دن کو متواتر روزہ اور رات بھر عبادت میں بسر کرتیں۔ یہاں تک کہ تمام عابدوں سے سبقت لے گئیں اور حسن تربیت کا مطلب یہ ہے بہت جلد ترقی کرتی تھیں کہ عام بچوں کی سال کی ترقی اور اُن کی ایک دن کی ترقی برابر تھی۔

وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا - کہتے ہیں جب حضرت مریم کی ولادت ہوئی تو اُن کی والدہ حق نے ان کو ایک کپڑا میں لپیٹا۔ اور مسجد میں لا کر اجار بنی اسرائیل سے فرمایا کہ یہ میری لڑکی ہے جس کے متعلق میں نے نذر کی تھی چونکہ بنی مائان بنی اسرائیل کے سردار تھے۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا

تو اس (نذر) کو قبول فرمایا اس کے رب نے اچھا قبول کرنا اور اس کو بڑھایا خوب بڑھانا اور کفالت دی اس کی زکریا کو۔

كَلَّمَادَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْخُرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ

جب بھی داخل ہوتے اس لڑکی پر زکریا خراب (عبادت) میں پاتے اس کے پاس رزق پوچھتے

يُرِيْمُ اَنِّي لَكِ هَذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ

اے مریم کہاں سے تجھے یہ دینے والا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے تحقیق اللہ رزق بھیجتا ہے

مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

جسے چاہے بغیر حساب کے

لہذا اپنے پیشوا اور سردار کی لڑکی سمجھ کر ہر ایک کے دل میں اس کی کفالت اور تربیت کی حوصلہ پیدا ہوئی۔ تو حضرت زکریا نے فرمایا کہ یہ چونکہ میری زوجہ کی بھانجی ہے لہذا میں اس کی تربیت کا سب سے زیادہ حقدار ہوں۔

(صاحب تفسیر صافی فرماتے ہیں کہ ہماری روایات میں حضرت زکریا کی زوجہ حضرت مریم کی بہن تھی نہ کہ خالہ چنانچہ قمی اور عیاشی نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی روایت کی ہے)

تو اجار بنی اسرائیل نے جواب دیا کہ اگر اس کا حق تربیت قرابتداری کی بنا پر ہے تو پھر اس کی ماں کو اس کی تربیت کا زیادہ حق ہے پس اب اس کا فیصلہ یہ ہے کہ قرعہ اندازی کی جائے اور جس کا نام قرعہ سے نکل آئے وہی اس کی تربیت کا حقدار ہوگا تو ۲۹ آدمی بقولے ۲۰ آدمی اس قرعہ اندازی میں شریک ہوئے پس سب کے سب دریا کے کنارے پہنچے اور ہر ایک نے اپنے اپنے قلم پانی میں پھینکے سوائے حضرت زکریا کے سب کے قلم ڈوب گئے اور ان کا قلم پانی کی سطح پر تیرتا رہا اور بعض کہتے ہیں کہ باقی لوگوں کے قلم دریا میں بہہ گئے اور حضرت زکریا کا قلم پانی میں ایک مقام پر ٹھہر گیا۔ پس حضرت زکریا کے سپرد حضرت مریم کی کفالت و تربیت ہوئی۔ اور حضرت زکریا حضرت سلیمان بن داؤد کی اولاد سے تھے اور ان موجودہ احبار کے رئیس بھی تھے اور نبی بھی۔ پس حضرت زکریا نے حضرت مریم کے لئے علیحدہ حجرہ بنایا جس میں وہ رہتی تھیں اور اپنی زوجہ یعنی حضرت یحییٰ کی والدہ کو اس کے رضاع پر مامور فرمایا۔ لیکن بعض کہتے ہیں کہ حضرت مریم نے کسی عورت کا دودھ نہیں پیا۔ بلکہ خداوند کریم نے ابتداء سے اس کے لئے جنت کے رزق کا انتظام فرمادیا تھا۔

القصہ جب جوان ہوئیں تو حضرت زکریا نے مسجد میں ان کے لئے ایک علیحدہ محراب عبادت بنایا تاکہ وہ باپردہ اس میں مشغول عبادت رہیں اور ان پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ لیکن حضرت زکریا جب ان کے پاس تشریف لاتے تھے تو ان کے پاس بے موسم

کے میوہ جات موجود پاتے تھے مثلاً موسم گرما میں موسم سرما کے میوے اور موسم سرما میں موسم گرما کے اور بالکل تروتازہ۔ اور حیرت سے دریافت فرماتے کہ یہ کہاں سے آیا؟ تو وہ جواب میں کہتے کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے اور خدا جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے اور حضرت مریمؑ کی خوبصورتی کا یہ عالم تھا کہ جب محراب عبادت میں مشغول نماز ہوتی تو ان کی جبین مبین سے ایک نور ساطع ہو کر محراب کو منور کر دیتا تھا۔ (سانی)

سبحان اللہ! یہ مریمؑ کی شان تھی۔ مناسبت مقام کے لحاظ سے حضرت مریمؑ کبریٰ صدیقہ طاہرہ جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کی شان کے متعلق بھی صرف ایک روایت عرض کرتا ہوں جو اس مقام پر نہایت موزوں ہے امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جناب فاطمہؑ اور حضرت امیرؑ کے خانگی معاملات کا دستور یہ تھا کہ گھر کے تمام کام کاج بتول معظمہؑ کے ذمہ اور باہر کے امور حضرت امیر علیہ السلام کے ذمہ تھے ایک دن جب امیر المؤمنین علیہ السلام گھر میں تشریف لائے تو دریافت فرمایا۔ اے فاطمہؑ! کوئی چیز کھانے کے لئے ہے؟ تو خاتونِ جنتؑ نے عرض کی کہ آج تیسرے روز سے گھر میں کھانے کی کوئی چیز نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے پہلے اطلاع کیوں نہ دی؟ تو مخدومہ نے عرض کی کہ بابا جان نے فرمایا ہے کہ اپنے ابن عم (شوہر) سے کسی چیز کی فرمائش نہ کیا کرو۔ اگر وہ خود کچھ لائیں تو احسان سمجھو ورنہ کسی شے کے لانے کی فرمائش نہ کرو۔ پس آپ باہر تشریف لائے اور کہیں سے ایک دینار قرض لیا۔ بوقت شام واپس تشریف لائے تھے کہ رستہ میں مقداد بن اسود سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے اس سے بے وقت گھر سے نکلنے کا سبب دریافت فرمایا۔ تو اس نے عرض کی۔ یا امیر المؤمنینؑ بھوک کے مارے گھر سے نکلا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ میری گھر سے نکلنے کی وجہ بھی یہی تھی۔ اور ایک دینار قرض لایا ہوں۔ لیکن تیری ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم سمجھتا ہوں۔ لہذا یہ دینار توڑے لے۔ پس دینار مقداد کو دے کر خالی ہاتھ واپس گھر کی طرف متوجہ ہوئے دیکھا کہ جناب رسالتؐ تشریف فرما ہیں اور خاتون معظمہ مصروف عبادت ہیں اور درمیان میں ایک سرپوش سے دھکی ہوئی چیز موجود ہے۔ بنی پاک جب نماز سے فارغ ہوئیں اور سرپوش آراہ تو دیکھا ایک بڑا برتن ہے جو گوشت و روٹی سے پُر ہے اس مقام پر جناب امیر المؤمنین علیہ السلام نے فرمایا۔ یا فاطمہؑ ائی لکھ ہذا۔ (اے فاطمہؑ آپ کو یہ چیز کہاں سے پہنچی؟ تو جناب سیدہؑ نے عرض کی۔ ہُوَ مِنِّی عِنْدَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَاءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ یہ اللہ کی جانب سے ہے اور خدا جسے چاہے بے حساب رزق عنایت فرماتا ہے۔)

نکات علمیہ (۱) لَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی۔ (جملہ معترضہ) فرمانِ خدا ہے نہ کہ والدہ مریمؑ کا مقولہ ہے کیونکہ اگر ان کا مقولہ ہوتا۔ تو چونکہ لڑکے کی خواہشمند تھیں اور بجائے اس کے لڑکی کی ماں بن بیٹھیں تو مقامِ حسرت میں کہنا چاہیے تھا۔ لَیْسَ الْاُنْثٰی کَالْذَّکَرِ۔ یعنی یہ عطا شدہ لڑکی، لڑکے کی جگہ پر نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ہر وہ مقام جہاں ایک اعلیٰ چیز کے طالب کو ناقص چیز ملے تو اظہار میں ناقص کا نام لے کر کہا جاتا ہے کہ یہ اس کی مانند نہیں ہو سکتی جس کا میں طالب تھا اور اگر یہ جملہ فرمانِ خدا قرار دیا جائے تو مقصد یہ ہو گا کہ والدہ حضرت مریمؑ چونکہ دل میں لڑکے کی متمنی تھیں اور

ان کو خیال بھی یہی تھا کہ میرے ہاں لڑکا پیدا ہوگا اور خداوند کریم کے نزدیک مقدر یہ تھا کہ ان کو حضرت مریم عطا کر کے اس کے شکم اطہر سے لڑکا بغیر باپ کے عطا کر دوں جو رسولِ نبی ہو اور اولوالعزم پیغمبر ہو۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ لڑکا جس کو مادرِ مریم چاہتی تھی وہ اس کی لڑکی جیسا نہیں ہو سکتا تھا۔ جو ان کو بالفعل عطا ہوئی۔ کیونکہ وہ لڑکا یقیناً ان خصوصیات کا حامل نہ ہوتا۔ جو حضرت مریم میں اور ان کے فرزند حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تھیں اور جن مفسرین نے اس جملہ کو مادرِ مریم کا مقولہ قرار دیا ہے اُن کو تصحیح معنی کے لئے تکلفات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

۱۲) مادرِ مریم نے خدا سے دو دعائیں طلب کیں۔ پہلی دعا بچے کی مقبولیت کے لئے کہ میں نے اس کو اپنی ولایت مادری سے آزاد کر کے تیری عبادت گزار اور خدمتِ بیت المقدس کے لئے نذر کی ہے پس تو اسے قبول فرما۔ اور دوسری دعا چونکہ ان کو بذریعہ پیشین گوئی یا الہام یا ذاتی اندازے کے یقین تھا کہ مجھے لڑکا عطا ہوگا تو جب لڑکی عطا ہوئی تو ان کا وہ نظریہ فوراً بدل گیا اور علمِ سابق کے ذریعے سمجھیں کہ وہ معبودِ لڑکا اس لڑکی کے بطن سے ہوگا۔ لہذا اس لڑکی کا نام مریم تجویز کر کے دعا مانگی کہ میرے اللہ اس بچی کو اور اس کی ذریت کو شیطانِ رجیم کے شر سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ پس خداوند کریم نے ان کی دونوں دعائیں قبول فرمائیں پہلی دعا کے جواب میں فرمایا۔ **فَتَقَبَّلَهَا وَابْنَهَا**۔ یعنی ان کی تربیت اور پرورش نہایت صاف و پاکیزہ طریق سے فرمائی۔ دعا کے جواب میں فرمایا۔ **وَآَنَسْتَهَا نَسَبًا حَسَنًا**۔ یعنی ان کی تربیت اور پرورش نہایت صاف و پاکیزہ طریق سے فرمائی۔ یہ شیطانِ رجیم سے حفاظت کا عہد ہے اور جو حضرت مریم کی طہارت کی طرف اشارہ ہے چنانچہ بعد میں **إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهِ** و **طَهَّرَهَا** اسی امر کی تصریح ہے۔

۱۳) **الْمِحْرَابِ**۔ مسجد یا گھر میں ایک مخصوص مقامِ عبادت کو کہتے تھے لیکن آج کل مسجد کی جانب قبلہ کی دیوار کے وسط میں جو جگہ پیش نماز کے لئے مخصوص طور پر بنائی جاتی ہے اسے محراب کہا جاتا ہے اس کی وجہ تسمیہ کے لئے چند قول ہیں۔

۱) چونکہ شیطان اور خواہشاتِ نفسانیہ کے ساتھ یہ جگہ مقامِ حرب ہے اس لئے اس کو محراب کہتے ہیں؛

۲) یہ حرب سے نکلا ہے جس کا معنی ہے لٹا ہوا چونکہ انسان اس مقام پر دنیاوی مشاغل سے تہی دامن اور فارغ القلب ہو کر آتا ہے تو گویا وہ ان چیزوں سے لٹا ہوا ہوتا ہے۔ پس اس مقام کو محراب اسی مناسبت سے کہتے ہیں۔

۳) بعض کہتے ہیں کہ گھر میں صدر مجلس کو محراب البیت کہا جاتا ہے اور بعد میں جب مسجد کی بنا ہوئی تو ان کے صدر مقام کو بھی محراب کا نام دیا گیا ہے ان کے علاوہ اور وجوہ بھی بیان کئے گئے ہیں۔

مہرِ حال اس مقام پر وہ مقامِ مخصوص مراد ہے جو حضرت مریم کی مخصوص عبادت گاہ تھا اور حضرت مریم تنہا اس میں عبادتِ خدا کیا کرتی تھیں۔

هٰذَاكَ دَعَا زَكْرِيَّا رَبَّهُ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً

وہیں (حضرت) زکریا نے اپنے رب سے دعا مانگی کہا۔ اے پروردگار! مجھے عطا فرما اپنی بارگاہ سے پاکیزہ اولاد۔

طَيِّبَةً إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ﴿۲۸﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ

تحقیق تو ہی دعا کے سننے والا ہے پس اُسے نہ رشتوں نے ندادی درحالیکہ وہ کھڑے نماز

يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ إِنَّ اللَّهَ يَبْشُرُكَ بِخَيْرٍ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ

پڑھ رہے تھے محراب میں۔ اے زکریا! تحقیق اللہ تجھے بخیر کی خوشخبری دیتا ہے۔ جو تصدیق کرنے والا ہوگا کلمۃ اللہ

مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴿۲۹﴾

کی اور سید اور پاکباز اور نبی ہوگا صالحین میں سے۔

حضرت زکریا کو حضرت یحییٰ کی بشارت

جب حضرت زکریا نے جناب مریم کے پاس بے موسم کے میوہ جات ملاحظہ فرمائے تو جناب مریم کی عظمت و کرامت دیکھ کر ان کے دل میں اسی جیسی بارگاہت اولاد کی خواہش پیدا ہوئی چنانچہ وہیں طیب اولاد کے لئے دعا مانگی جو منظور ہوئی اور خداوند کریم نے حضرت یحییٰ کو حضرت عیسیٰ کے ساتھ اکثر امور میں مشابہت عطا فرمادی پھر انچہ قرآن مجید میں دونوں کے اوصاف سے اس حقیقت کا صاف پتہ چل سکتا ہے اور یہ حضرت زکریا کی دعا کا اثر تھا اور حضرت یحییٰ کو مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ فرمایا۔ حالانکہ دوسرے مقام پر کلمہ سے مراد حضرت مسیح ہیں تو اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یحییٰ حضرت عیسیٰ کے اتباع و اوصیاء میں سے تھے۔

حُصُورًا۔ عورتوں سے بچنے والا۔ لیکن یہاں مراد ہے خواہشات و لذات نفسانیہ سے پرہیز کرنے والا۔ اٰیٰتُكَ الْهَم۔ بروایت عیاشی حضرت صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب حضرت زکریا کو فرشتے نے ولادت یحییٰ کی بشارت دی تو حضرت زکریا نے اطمینان قلب کے لئے نشانی طلب کی تاکہ یقین ہو جائے کہ وہ آواز و سوسہ نہیں تھا پس وحی ہوئی کہ تیری زبان تین دن بجز ذکر خدا کے عام کلام کرنے سے بند ہوگی۔ پس اس نشانی سے حضرت زکریا مطمئن ہو گئے۔

حضرت یحییٰ کی حضرت عیسیٰ سے مشابہت
حضرت زکریا کی دعا کا مقبولیت کا اثر تھا کہ حضرت یحییٰ کو خدا نے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کے کمالات کا جامع بنا دیا۔

(۱) حضرت یحییٰ کی ولادت، بشارت کے بعد ہوئی جیسا کہ حضرت عیسیٰ کی ولادت بشارت کے بعد ہوئی تھی۔

- (۲) حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ دونوں کے نام جناب رب العزت کی طرف سے تجویز شدہ تھے اور دونوں کا معنی بھی ایک ہے۔
- (۳) حضرت یحییٰ کے متعلق ہے۔ یَا یَحْيٰی خُذِ الْكِتَابَ اور حضرت عیسیٰ کے متعلق ہے۔ اِقْرَأِ الْكِتَابَ۔
- (۴) حضرت یحییٰ کے لئے فرمایا۔ وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا اور حضرت عیسیٰ کے لئے کہہ رہے ہیں۔ وَجَعَلْنِي نَبِيًّا۔
- (۵) حضرت یحییٰ کے لئے ہے حَتَّانَا مِثْلَ لَدُنَّا وَمَرْكُوكًا وَكَانَ تَقِيًّا۔ اور حضرت عیسیٰ کے متعلق ہے۔ وَجَعَلْنِي مُبَارَكًا آمِنًا كُنْتُ وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ۔
- (۶) حضرت یحییٰ کی شان ہے۔ وَبِرَّ آبَوَالِدَيْهِ وَكَمَّ يَسْكُنُ جَبَارًا عَصِيًّا۔ اور حضرت عیسیٰ کی بھی یہی شان ہے وَبِرَّ آبَوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَارًا شَقِيًّا۔
- (۷) حضرت یحییٰ پر تین جگہ سلام ہے۔ وَالسَّلَامُ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا۔ اور حضرت عیسیٰ پر بھی تین سلام ہیں۔ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا۔
- (۸) حضرت یحییٰ کو سید کہا اور حضرت عیسیٰ کو وَجِنِّهَا عِندَهُ کا خطاب دیا۔
- (۹) جس طرح حضرت یحییٰ کو حضور نبی اور صالحین میں سے کہا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ بھی اپنی صفات سے متصف تھے۔
- (۱۰) حضرت زکریا کے پاس جس طرح فرشتہ بشارت لایا تھا حضرت مریم کے پاس بھی فرشتہ آیا تھا۔
- (۱۱) حضرت زکریا نے اپنا بڑھاپا اور اپنی زوجہ کا عقیم ہونا پیش کیا تھا۔ ادھر مریم نے اپنا بئیر شہر کے ہونا ظاہر کیا تھا۔ پس جس لمحہ میں حضرت زکریا کو جواب دیا گیا تھا۔ اسی جیسا جواب حضرت مریم کو بھی دیا گیا۔
- (۱۲) حضرت زکریا کو کہا گیا۔ اَيْتُكَ اَنْ لَا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا سَمْرًا۔ اور حضرت مریم کو تعلیم دی گئی۔ اِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا۔
- (۱۳) بعض لوگوں نے عیسیٰ کا معنی یَعِيشُ کہا ہے پس یحییٰ اور عیسیٰ دونوں لغوی معنی کے لحاظ سے بھی ایک جیسے ہیں۔
- تذکرہ:** کلام وہ ملفوظات ہیں جو باہمی نسبت و ربط پر مشتمل ہو کر مخاطب تک مافی الضمیر کے پہنچانے کا ذریعہ ہوں۔ اور اُسے قول بھی کہا جاتا ہے لیکن عرت عام میں ہر وہ حرکت جو مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ بنے اُسے بھی کلام و قول کہا جاتا ہے خواہ آواز کی قسم ہو یا اشارہ و رمز کے طریقے سے ہو۔ آواز ایک ہو یا متعدد ہوں اور ہر وہ آواز جو پورا فائدہ دے سکے والی ہو خواہ کسی منہ سے نہ نکلے اُسے کلام و قول کہنے میں تو کسی کو مجال توقف ہی نہیں۔ قرآن مجید نے وساوس شیطانی کو بھی کلام و قول شیطان سے متعدد مقامات پر تعبیر فرمایا ہے اگرچہ بعض مقامات پر اسے امر۔ وسوسہ۔ وحی اور وعدہ بھی کہا گیا ہے چنانچہ یا مَرْيُومُ شَوْشُ يُوحٰی۔ اور یَعِدُ کے الفاظ اس امر کے شاہد ہیں پس مجملہ خطرات و وساوس شیطانی کو کلام و قول شیطان کہا جاتا ہے۔
- اس کے مقابلہ میں خدا کی جانب سے انسان کے دل میں جو باتیں تائیدی طور پر پہنچتی ہیں۔ انہیں وعدہ۔ حکمت۔ نور۔ سکینہ

قَالَ رَبِّ اَتَى يَكُونُ لِي عِلَامٌ وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِي عَاقِرٌ

عرض کی اسے پروردگار! میرے ہاں بچہ کیسے ہوگا۔ حالانکہ مجھے بڑھاپا پہنچ چکا ہے۔ اور میری عورت بانجھ ہے

قَالَ كَذَلِكَ اللَّهُ يُفَعِّلُ مَا يَشَاءُ ۝ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً

کہا (فرشتے نے) کہ خدا اسی طرح جو چاہتا ہے کرتا ہے عرض کی اسے رب مقرر کر میرے لئے کوئی نشانی۔

قَالَ اَتَيْتُكَ اَلَا تَكَلِّمُ النَّاسَ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ اَمْرًا وَاذْكُرْ

فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تو نہ بولے گا لوگوں سے تین دن تک مگر اشارے سے۔ اور یاد کر اپنے

رَبِّكَ كَثِيرًا وَسَبِّحْ بِالْعِشِيِّ وَالْاُبْحَارِ ۝

رب کو بہت اور اس کی تسبیح کر صبح و شام

اور شرح صدر وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور انہی خطابات روحانیہ کو کلام و قول ملائکہ بھی کہا گیا ہے۔ چنانچہ آیات قرآنیہ میں سیر کرنے کے بعد آسانی سے اس نتیجہ تک پہنچا جاسکتا ہے پس معلوم ہوا کہ ملائکہ اور شیاطین دل میں معانی و مطالب کے القاء کے طور پر انسان سے کلام کیا کرتے ہیں۔ کلام ملکی اور دوسرے شیطانی میں فرق یہ ہے کہ کلام ملکی میں شرح صدر، مغفرت و فضل خداوندی کا وعدہ ہوتا ہے اور اس میں کتاب و سنت کی پوری موافقت ہوا کرتی ہے لیکن بخلاف اس کے دوسرے شیطانی میں تنگ دلی، بخل، خواہش پرستی، وعدہ فقر اور ارتکاب معصیت کی دعوت ہوتی ہے جس کا ماحصل خدا و رسول کی صریح مخالفت ہوتی ہے۔

انبیاء کے لئے بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ملائکہ مجسم ہو کر ان کے سامنے آئے اور ان سے ہم کلام ہوئے اور بعض اوقات شیطان بھی تجسم کے بعد ان سے گویا ہوا جس طرح کہ قرآن میں انبیاء کے قصص و واقعات میں تصریح سے مذکور ہے۔

حضرت زکریا کو ملائکہ کا ندا دے کر فرزند کی بشارت دینا ظاہر تجسم کی صورت میں نہیں تھا بلکہ القاء قلبی کے طریقہ پر تھا جسے وہ فوراً کلام ملکی سمجھتے ہوئے مطمئن ہو گئے اور مزید سرور اور شرح قلب کے لئے نشانی کے طالب ہوئے اور اسی کلام ملائکہ یا ان کے قول اور ندا کو دوسری آیات میں خداوند کریم نے اپنی طرف بھی منسوب فرمایا ہے اور حضرت زکریا کے تین دن تک کلام نہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تین دن متواتر آپ کی زبان سوائے ذکر خدا کے کسی اور طرف متحرک نہ ہوئی۔

حضرت یحییٰ سب سے پہلے حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے یہ دونوں آپس میں خالہ زاد بھائی تھے اور حضرت شکم مادر میں کلام

یحییٰ چھ ماہ عمر میں حضرت عیسیٰ سے بڑے تھے اور حضرت عیسیٰ کے آسمان پر اٹھائے جانے سے پہلے شہید کر دیئے گئے تھے۔ تفسیر امام علیہ السلام سے تفسیر صفائی میں منقول ہے کہ سوائے حضرت زکریا کے حضرت مریم کے پاس کوئی بھی نہیں جایا کرتا تھا اور آپ جس طرف جاتے تھے حضرت مریم کے حجرہ کو قفل لگا کر جاتے تھے پس جب حضرت مریم کو حضرت عیسیٰ

کا حمل ہوا۔ تو حضرت زکریا نے محسوس فرمایا کہ لوگ اس معاملہ میں مجھے تہمت دیں گے چنانچہ اپنی زوجہ سے یہ ماجرا بیان کیا تو اس نے جواب دیا کہ آپ خوف نہ کریں اور مریمؑ کو میرے پاس لائیں تاکہ میں اس سے حقیقت دریافت کروں۔ پس حضرت زکریا حضرت مریمؑ کو لائے تو چونکہ حضرت زکریا کی زوجہ مریمؑ کی بڑی بہن تھی۔ لہذا تعظیم کے لئے نہ اٹھی تو حضرت یحییٰ نے بقدرت خدا شکم مادر میں آواز دی اے آماں۔ آپ کے پاس جہان کی عورتوں کی سردار آئی ہے جو جہاں کے مردوں کے سردار کی ماں ہے لہذا آپ کو اس کی تعظیم کے لئے اٹھنا چاہیے پس زوجہ زکریا تعظیم مریمؑ کے لئے اٹھیں۔

اہلبیت عصمت کے لئے بھی شکم مادر کے اندر کلام کرنا روایات سے ثابت ہے کہتے ہیں جناب رسالتؐ جب جناب فاطمہ بنت اسد کے پاس تشریف لاتے تھے تو جناب فاطمہ تعظیم کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ بعض بنی ہاشم نے بی بی کو اس تعظیمی قیام سے روکنا چاہا۔ تو شکم سے آواز بلند ہوئی کہ آماں بریہ رسول و سید کا شمار ہیں ان کی تعظیم کے لئے آپ کو اٹھنا چاہیے و کتب معتبرہ سے یہ روایت اگرچہ مجھے نہیں مل سکی لیکن بیان کرنے والے اسی طرح بیان کرتے ہیں البتہ یہ فعل قدرت خدا سے بعید نہیں اور نیز اس کی نظیر بھی پہلے حضرت یحییٰ میں موجود ہے۔ لہذا استعجاب کی کوئی وجہ نہیں، اسی طرح شکم اطہر میں جناب بتول معظمہ خاتون جنت کا اپنی ماں کے لئے مولیٰ تنہائی ہونا اور سید الشہداء روحی اور ارواح المؤمنین لہ الفدا کا شکم مادر میں اپنی والدہ ماجدہ سے ہمکلام ہونا بھی روایات میں موجود ہے جو خدا درخت میں کلام پیدا کر سکتا ہے۔ حیوانات سے کلام کرنا سکتا ہے بلکہ جمادات سے بھی گویائی پیدا کر سکتا ہے چنانچہ جناب رسالتؐ کے ہاتھوں پر سنگریزوں کا بولنا اور آپ کی رسالت کی تصدیق کرنا عام کتب میں مذکور ہے پس کیا عجب ہے کہ وہ بچے کو شکم کے اندر طاقب گویائی دے دے۔ ظاہری اسباب کے لحاظ سے تو بعد از پیدائش بھی بچہ بولنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ جب تک ایک خاص عرصہ اس کی تربیت ظاہری میں صرف نہ ہو جائے پس ہر خلاف عادت چیز کو محال عقلی کہنے والے تو حضرت عیسیٰؑ کے ہمد میں تکلم کرنے یا بچے کے حضرت یوسفؑ کی پاکدامنی کی گواہی دینے کو بھی اوپر ہی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن قدرت خدا کو محیط جانتے والوں کے لئے جس طرح بعد از ولادت اور قبل از وقت بچے کا بولنا ممکنات میں سے ہے اسی طرح قبل از ولادت بھی ممکنات میں سے ہے البتہ عادتاً محال ہے لیکن بہت سے عادی محال بقدرت خدا واقع ہو جایا کرتے ہیں اور خدا ہر شے پر قادر ہے اور یہی چیز خاصان خدا کا دوسری عام مخلوقات سے طرہ امتیاز ہے۔

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلِكَةُ يَمْرُؤُاِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ

اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم تحقیق اللہ نے تجھے چن لیا اور تجھے پاک کیا

وَاصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَاءِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۲﴾ یَمْرُؤَا قَتْلٰی لِرَبِّكِ

اور تجھے برگزیدہ فرمایا عالین کی عورتوں پر اے مریم قوت کر اپنے رب کے لئے

وَاسْجُدِیْ وَاسْکُعِیْ مَعَ الرُّکِیْعِیْنَ ﴿۴۳﴾

اور سجدہ کر اور رکوع کر ساتھ رکوع کرنے والوں کے

انتخابِ مریم

وَإِذْ قَالَتْ : گزشتہ اذ قَالَتْ پر عطف ہے اور آیت بتلاتی ہے کہ حضرت مریم محدثہ تھیں کہ ان سے فرشتے کلام کرتے تھے اور پہلے اصطفا سے مراد قبول کر لینا اور دائرہ محبت میں لے لینا ہے اور دوسرے اصطفا سے مراد منتخب برگزیدہ کرنا دوسروں کے مقابلہ میں اسی لئے پہلا مطلق ہے اور دوسرے عطف کے ساتھ مستعمل ہے نیز ان کی طہارت سے مراد عصمت ہے اور بعضوں نے بتول ہونا مراد لیا ہے یعنی آلالش حیض سے پاک و صاف تھی تاکہ ہر وقت بیت المقدس میں رہ کر عبادت کر سکے اور بعید نہیں کہ دونوں معنی اس مقام پر مراد ہوں اور پہلا معنی زیادہ مناسب ہے اس لئے کہ چونکہ حضرت عیسیٰ کی ولادت کا بعد میں تذکرہ ہے اور وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے پس حضرت مریم کی عصمت کی پہلے شہادت دے دی تاکہ کسی کو اس کے متعلق شک و شبہ کی مجال نہ رہے اور بدگمانی کی طرف کوئی ذہن اقدام نہ کرے۔

سوال :- کیا حضرت مریم کو پورے عالین کی عورتوں پر برگزیدگی کا شرف حاصل ہوا ہے۔

جواب :- آیت مجیدہ کے ظاہری الفاظ تو اسی مطلب کی تائید کرتے ہیں کیونکہ عالین جمع کا صیغہ ہے اور اس پر الف و لام بھی داخل ہے اور قواعد کے لحاظ سے اس کا معنی استغراق ہوتا ہے۔ یعنی حضرت مریم کو تمام جہانوں کی عورتوں پر خدا نے سبقت دے دی۔ اور نیز استثناء کا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو تمام جہانوں کی عورتوں پر ترجیح دی گئی لہذا یہ کہنا کہ اس کو صرف اپنے زمانہ کی عورتوں پر فوقیت عطا کی گئی آیت مجیدہ کا ظاہر اس مطلب کو ہرگز قبول نہیں کرتا۔

سوالی بر عقیدہ شیعہ کی رو سے فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا عالین کی عورتوں کی سردار ہے چنانچہ جناب رسالتاً سے اس بارہ میں متعدد فرامین صادر ہوئے ہیں نیز کتب فریقین میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا :- میری شہزادی فاطمہ جنت کی تمام عورتوں کی سردار ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جنت صرف ایک عالم کی عورتوں کے لئے نہیں بلکہ تمام عالین کی پاک و نیک عورتیں وہاں ہوں گی اور جناب فاطمہؑ بلا استثناء سب کی سردار ہے لیکن آیت مجیدہ میں حضرت مریم کو تمام جہانوں کی عورتوں میں سے برگزیدہ کہا گیا ہے اب ان ہر دو مقاموں پر غور کرنے کے بعد تعارض سامنے آجاتا ہے اور آیت اور حدیث میں تعارض کی صورت میں آیت ہی کو ترجیح دی جایا کرتی ہے۔

جواب :- آیت مجیدہ میں حضرت مریم کو برگزیدگی کا تمغہ عطا کیا گیا ہے اور حدیث پاک میں جناب فاطمہؑ زیرِ کوسیادت کا تاج دیا گیا ہے لیکن ہر دو مقام پر حضر نہیں ہے لہذا مریمؑ کا انتخاب جناب فاطمہؑ کے انتخاب کے سانی نہیں اور حضرت فاطمہؑ کی سیادت جناب مریمؑ کی سیادت سے متقدم نہیں۔ پس ہر کتا ہے کہ یہ دونوں بلکہ ان کے علاوہ کچھ اور خواتین بھی اس کرامت میں ان کے ساتھ شریک ہوں چنانچہ شیعہ و سنی ہر دو کی کتب میں اس کی تائید موجود ہے۔

(۱) درمنثور۔ انس سے مروی ہے کہ جناب رسالتاؐ نے فرمایا کہ تمام جہانوں کی عورتوں میں سے مریم بنت عمران خدیجہ بنت خویلد، جناب فاطمہ بنت محمدؐ اور آسیہ زوجہ فرعون فضیلت و شرف کے لئے کافی ہیں۔

(۲) ابن عباس سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ عالمین کی عورتوں میں سے افضل۔ خدیجہ، فاطمہ، مریم اور آسیہ زوجہ فرعون ہیں۔

(۳) حسن بصری سے مروی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تمام جہانوں کی عورتوں میں سے خدا نے چار کو چن لیا۔
۱، آسیہ بنت مزاحم، ۲، مریم بنت عمران، ۳، خدیجہ بنت خویلد، ۴، فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(۴) خصال میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جناب رسالتاؐ نے چار خط کھینچے اور پھر فرمایا کہ جنت کی عورتوں میں سب سے بہترین۔ مریم دختر عمران۔ خدیجہ دختر خویلد۔ فاطمہ دختر محمدؐ اور آسیہ دختر مزاحم زوجہ فرعون ہیں۔

(۵) امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے منقول ہے کہ جناب رسالتاؐ نے فرمایا۔ تحقیق اللہ سبحانہ نے عورتوں میں سے چار کو منتخب فرمایا۔ یعنی مریم، آسیہ و خدیجہ اور فاطمہ النجریہ۔

(۱) عَنِ الدُّرِّ الْمُنْثَوْرِ عَنْ أَكْثَرِ النَّاسِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ قَالَ حَسِبْتُ مِنْ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ مَرْيَمَ بِنْتَ عِمْرَانَ وَخَدِيجَةَ بِنْتَ خُوَيْلِدٍ وَفَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ وَأَسِيَةَ امْرَأَةِ فِرْعَوْنَ۔

(۲) وَفِيهِ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ۔ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ أَفْضَلُ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ خَدِيجَةُ وَفَاطِمَةُ وَ مَرْيَمُ وَأَسِيَةُ امْرَأَةِ فِرْعَوْنَ۔

(۳) وَفِيهِ عَنِ الْحَسَنِ۔ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ أَرْبَعًا أَسِيَةَ بِنْتَ مَزَاحِمَ وَ مَرْيَمَ بِنْتَ عِمْرَانَ وَ خَدِيجَةَ بِنْتَ خُوَيْلِدٍ وَ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ

(۴) الْخَصَالِ۔ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ خَطَّ رَسُولُ اللَّهِ أَرْبَعَ خُطُوطٍ ثُمَّ قَالَ خَيْرُ نِسَاءِ أَهْلِ الْجَنَّةِ مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَ خَدِيجَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ وَ فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ وَ أَسِيَةُ بِنْتُ مَزَاحِمَ امْرَأَةِ عِمْرَانَ

(۵) وَفِيهِ عَنِ ابْنِ الْحَسَنِ الْأَوَّلِ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ اخْتَارَ مِنَ النِّسَاءِ أَرْبَعًا مَرْيَمَ وَ أَسِيَةَ وَ خَدِيجَةَ وَ فَاطِمَةَ الْخَبَرِ۔

مہر کیف اس مضمون کی احادیث کتب فریقین میں حد تو اتر تک پہنچتی ہیں۔

(۲) جس طرح ایک سکول کی ایک کلاس میں مختلف مضامین کے لحاظ سے چند طلبہ نمبر اول پر فائز ہو جایا کرتے ہیں اگرچہ مجموعی طور پر ان کے مراتب میں کافی فرق ہوتا ہے مثلاً ایک لڑکا ایک مضمون میں فٹ ہے دوسرا دوسرے میں، تیسرا تیسرے میں اور چوتھا چوتھے میں، تو کہا جائے گا کہ چاروں پورے سکول میں فٹ ہیں لیکن مجموعی نمبروں کا تناسب ہوگا تو ان چاروں میں ایک فٹ ہوگا دوسرا سینکڑ و علیٰ ہذا القیاس۔ مہر کیف یہ ضروری نہیں کہ جس طرح وہ اپنے ایک ایک مضمون میں امتیازی شان کے حامل ہیں مجموعی طور پر بھی وہ سب کے سب یکسانیت رکھتے ہوں بلکہ عام عادت کا تقاضا یہی ہے کہ ان میں تفادیت ہوگا اور ان کا یہ باہمی تفادیت ان کے پورے سکول یا جماعت میں فٹ آنے کے منافی نہیں۔

پس اسی طرح درست ہے کہ پورے عالمین میں سے چند خواتین ممتاز ہوں۔ لیکن بعض خصوصیات کے اعتبار سے اور مجموعی طور پر ان سب میں سے صرف ایک ہی ممتاز ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت مریم کس صفت میں امتیازی شان کی حامل ہے۔ اور اس کی مصطفائی و برگزیدگی کا محور و مدار کونسی صفت ہے۔

تو اگر قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے اور حضرت مریم کے متعلق آیات الہیہ کو غور سے دیکھا جائے تو جناب مریم کا کوئی فضیلت کا پہلو ایسا نہیں جس کو قرآن مجید نے بیان نہ کیا ہو۔ چنانچہ حضرت مریم کی خصوصی صفات میں سے جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے یہ ہیں۔

(۱) حضرت مریم حیض اور اس قسم کی آلائشات نسوانی سے پاک و منزہ تھیں۔

(۲) عقیقہ اور پاک دامن تھیں اور دونوں صفتوں کو طہرکت کا لفظ ظاہر کر رہا ہے اور نیز اَخْصَنَتْ فَرْجَهَا کا جملہ بھی حضرت مریم کی عفت پر لٹا ہے۔

(۳) کلمات اللہ کی تصدیق کرنے والی تھی۔

(۴) کتب سماویہ کی تصدیق کرنے والی تھی چنانچہ فرماتا ہے۔ صَدَقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ۔

(۵) قنوت کرنے والی تھی چنانچہ ارشاد ہے۔ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ۔

(۶) فرشتے ان سے کلام کرتے تھے پس محمدؐ تھے۔

اور ظاہر ہے کہ ان صفات کے لحاظ سے حضرت مریم کو کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ ان میں دوسری متعدد خواتین بھی ان کے ساتھ شریک ہیں۔ ہاں مریم کی وصف و ثنا جو قرآن میں خصوصیت کے ساتھ اور متعدد مرتبہ نہایت اہمیت سے بیان ہوئی ہے وہ ہے حضرت عیسیٰؑ کے بغیر باپ کے تولد کا قصہ۔ چنانچہ ابھی بعد کی آیتوں میں بیان ہوگا۔ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يَا مَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ اَنْ اَخْرِجِيْكِ مِنْ مَّقَامٍ مَّكَرًا مَّا هُوَ۔ فَتَخَفْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (سورۃ النبیاء) اسی طرح ایک اور مقام پر ہے وَمَرْيَمَ ابْنَةَ عِمْرَانَ الَّتِيْ اَخْصَنَتْ فَرْجَهَا اَنۡفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا۔ الخ (سورۃ تحریم)

پس قرآن مجید میں حضرت مریم کی جملہ مذکورہ صفات میں سے صرف حضرت مسیح کی والدہ ہونا کسی مرد کے مٹس کے بغیر حضرت عیسیٰ کی ماں بننا ان کا ایک ایسا خصوصی نشان ہے کہ اس میں عالمین کی عورتوں میں سے اس کا کوئی بھی شریک نہیں پس وہ اس صفت اور شان میں امتیاز کلی کی حامل ہیں اور تمام جہانوں کی عورتوں میں سے وہ اس لحاظ سے برگزیدہ اور منتخب ہیں نہ کہ تمام باقی صفات کے اعتبار سے جیسا کہ ظاہر ہے پس جن روایات میں حضرت مریم کو عالمین کی عورتوں میں سے ایک امتیازی حیثیت کی حامل کہا گیا ہے ان میں ان کی صرف اسی خصوصیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے اسی طرح حضرت مریم کے علاوہ جناب خدیجہ اور جناب آسیہ بھی عالمین کی عورتوں میں سے دامن انتخاب خداوندی کے اندر داخل ہیں اور یہ انتخاب ان کی نمایاں اور مخصوص بعض صفات کے تحت ہے جو ان کی عالمین میں امتیازی حیثیت کی حامل ہیں۔ پس باقی تمام عورتوں پر تو ان کی فضیلت ثابت ہو گئی لیکن کیا یہ چاروں پاک بیبیاں مساوی اور یکساں رتبہ پر فائز ہیں؟ حضرت مریم کے متعلق قرآنی تصریح صرف اس کے اپنی مخصوص صفت کے لحاظ سے منتخب اور ممتاز ہونے کا اعلان کر رہی ہے اور الفاظ اہمیت اور ترکیب جملہ قطعاً مریم میں اصطفا کے محصور ہونے پر دلالت نہیں کرتے اور فرمان نبویؐ میں چار بیبیوں کے انتخاب کا اعلان بھی مریم میں انتخاب کے حصر کے منافی ہے جب یہ معلوم ہوا کہ قرآن حضرت مریم کے مجموعی صفات کے نتیجے کے اعلان سے ساکت ہے تو فرمان نبویؐ جناب فاطمہؑ کی عمومی سیادت کے اعلان کے متعلق یقیناً تعارض سے خالی ہے بلکہ بعض روایات میں تو حضرت مریمؑ کی سیادت کی حضرت فاطمہؑ کے مقابلہ میں صاف طور پر نفی موجود ہے جیسا کہ درمشتور سے منقول ہے۔

عن فاطمہ :- قال لی رسول اللہ انت سیدۃ نساء اہل الجنۃ لامرئۃ البتول (یعنی جناب رسالتؐ نے فاطمہؑ سے فرمایا کہ جنت کی عورتوں کی صرف تو ہی سرور ہے نہ کہ مریمؑ بتول۔

احادیث ائمہ علیہم السلام میں اس امر کی تصریح موجود ہے کہ حضرت مریمؑ کا اصطفا صرف عیسیٰ کی ولادت کے لئے تھا چنانچہ

(۱) عن تفسیر القمی قال علیہ السلام اصطفاھا مرتین اما الاولیٰ فاصطفاھا ای اختارھا واما الثانیۃ فانھا حملت من غیر فعل فاصطفاھا بذالک علی نساء العالمین۔

(۲) عن المجمع قال ابو جعفر معنی الآیۃ اصطفاک لذرۃ الانبیاء وطہرک من السفاح واصطفاک لولادۃ عیسیٰ من غیر فعل۔

پس قرآن مجید میں تدبر کرنے اور احادیث میں نظر دوڑانے کے بعد یہ نتیجہ بخوبی سامنے آ جاتا ہے کہ حضرت مریمؑ کا عالمین

کی عورتوں پر اصطفا صرف اسی خصوصی صفت کی بناء پر ہے اور یہی وہ صفت ہے جس سے عالمین کی عورتیں محروم ہیں۔ لیکن جناب خاتونِ جنت کی سیادت کسی ایک وصف کے پیش نظر نہیں بلکہ علی الاطلاق ان کو سیدۃ النساء العالمین کا خطاب دیا گیا ہے پس وہ مریم سے بھی افضل ہیں اور باقی عام عورتوں سے بھی ان کو سبقت حاصل ہے اور یہ ممکن ہے کہ یہ چاروں عصمت مآب بیبیاں بعض اوصاف مخصوصہ میں عالمی امتیاز رکھتی ہوں۔ لیکن جملہ صفاتِ حسنہ کے لحاظ سے ان میں باہمی طور پر تفاوتِ مراتب ہو۔ اور بعض بعض سے افضل ہوں چنانچہ مثالِ سابق سے اس کی وضاحت کی جا چکی ہے۔

اعترافِ برابر یہ سوال کہ حضرت مریم کے اصطفا کا اعلان خداوند کریم نے بذریعہ قرآن مجید کے فرمایا۔ اور خاتونِ جنت کی سیادت کا اعلان حدیث کے ذریعہ ہوا۔ قرآن کی سند قطعی اور حدیث کی سند ظنی ہے کہ قطعی مقابلہ ظنی کو کوئی اہمیت ہی حاصل نہیں۔

جواب ہر سند حدیث بے شک ظنی ہوتی ہے لیکن تواثر کے بعد اسے بھی قطعیت کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے اور حدیث مذکور کا مکتب فریقین میں متواتر ہونا ثابت ہے اور اگر بالفرض تواثر ثابت نہ بھی ہو تب بھی اس سے شک پکڑنے میں خرابی تب لازم آتی کہ آیت اور حدیث میں تعارض ہوتا اور ہم گذشتہ بیان میں ثابت کر چکے ہیں کہ مفہومِ آیت و حدیث میں قطعاً تعارض نہیں۔ کیونکہ اولاً تو آیت مجیدہ اصطفا کا مریم میں صہر نہیں بتلاتی اور ثانیاً جس خصوصیت کا مریم میں صہر ہے اس سے کسی حدیث کا تعارض نہیں بلکہ وہ وصف صرف مریم کی ہی ہے اور قرآن مجید کا ایک امر کے بیان سے سکوت اس کی نفی کی دلیل نہیں بن سکتا۔ بلکہ بہت سے شرعی امور ایسے ہیں جن سے قرآن خاموش ہے لیکن بذریعہ حدیث ان پر ایمان فرض ہے پس من جملہ ایسے امور کے ایک یہ بھی سمجھ لینا چاہیے۔

۳، حضرت مریم کی متذکرہ صفات جناب زہراء سلام اللہ علیہا میں بھی موجود تھیں۔ چنانچہ تفسیر عمدة البیان میں جناب رسالت مآب سے مروی ہے کہ جناب فاطمہ عالم کی عورتوں کی سردار، میری پارہ جگر، نور چشم اور میوہ دل ہے جب وہ عبادتِ خدا کے لئے محراب میں کھڑی ہوتی ہے تو اس کے نور سے ملائکہ اس طرح فیض حاصل کرتے ہیں جس طرح اہل زمین آسمانی ستاروں کی روشنی سے استفادہ کرتے ہیں اور خدا فرشتوں سے خطاب فرماتا ہے کہ میری کنیز خاص فاطمہ کو دیکھو کہ میرے خوف سے محرابِ عبادت میں مشغول گریہ ہے اور اس کا بدن کانپتا ہے وہ تمام عورتوں کی سردار ہے اور میں تم کو گواہ کرتا ہوں کہ میں اس کو اور اس کے شیعوں کو آتشِ جہنم سے بے خوف کروں گا۔ ادھر اگر مریم کے لئے اِصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ کا خطاب ہے تو جناب فاطمہ کے لئے لُطِّفَہَا وَطَهَّرَكِمْ تَطْہِیْرًا کا ارشاد ہے اگر وہ بتل تھیں تو یہ بھی بتل تھیں۔ اگر ان سے ملائکہ کلام کرتے تھے تو ان کے ساتھ بھی ملائکہ کا کلام کرنا ثابت ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جناب فاطمہ کا لقب محدثہ اس واسطے ہے کہ ملائکہ ان سے باتیں کرتے تھے۔ اور جناب مریم کی طرح ان سے بھی خطاب کر کے کہتے تھے۔ یَا فَاطِمَۃُ اِنَّ اللّٰہَ اِصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ یَا فَاطِمَۃُ اُفْتِنِیْ بِرَبِّکِ وَاسْجُدِیْ وَاسْأَلِیْ مَعِ السَّاعِیْنَ۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبِیَاءِ الْغَيْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ۖ وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ

یہ غیب کی خبروں سے ہے۔ کہ ہم وحی کرتے ہیں تیری طرف اور آپ نہ تھے ان کے پاس جب وہ اپنے

اَقْلَامِهِمْ اَیْھُمْ یُکْفِلُ مَرْیَمَ ۖ وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ ﴿۷۲﴾

قلم ڈال رہے تھے کہ کون کفالت کرے گا مریم کی۔ اور آپ نہ تھے اُن کے پاس جب وہ جھگڑ رہے تھے

ترجمہ ہر اسے فاطمہ تحقیق اللہ نے تجھے چُن لیا اور پاک کیا اور عالمین کی عورتوں پر تجھے برگزیدہ فرمایا۔ اسے فاطمہ اپنے وقت کے لئے قنوت اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔ ایک شب جناب فاطمہ نے فرشتوں سے کہا: کیا مریم عالمین کی عورتوں سے افضل تھی؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ صرف اپنے زمانہ کی عورتوں کی سردار تھی اور تو تمام جہانوں کی عورتوں کی سردار ہے۔

اقول بر یعنی مریم اُس ایک خصوصی صفت کے لحاظ سے تو عالمین کی عورتوں سے ممتاز ہے اور مجموعی صفات خستہ کے اعتبار سے فقط اپنے زمانہ کی عورتوں کی سردار ہے اور جناب فاطمہ زہرا مجموعی صفات کے اعتبار سے عالمین کی عورتوں کی سردار ہے حضرت مریم صرف ایک حجت خدا حضرت عیسیٰ کی ماں ہے اور جناب فاطمہ گیارہ اماموں کی اصل ہے جن کے آخری امام حضرت عیسیٰ کے بھی مقتدا ہوں گے اور حضرت مریم کی وہ خصوصی صفت جو عالمین کی عورتوں کے مقابلہ میں اس کا امتیازی نشان ہے یعنی بغیر شوہر کے عیسیٰ کی ماں بننا غالباً اس ضرورت کے ماتحت ہے کہ مریم معصومہ ہے اور اس زمانہ میں اُن کا کفو مردوں میں سے کوئی موجود نہ تھا

کیونکہ زکریا ان کے بہنوئی تھے اور یحییٰ ان کے بھانجے تھے اور ان کے علاوہ مردوں میں سے کوئی ایسا فرد موجود نہ تھا۔ جو مریم کا کفو ہو سکتا۔ لیکن جناب فاطمہ کا کفو حضرت علیؑ موجود تھا اور حضرت مریم کی یہ صفت اگرچہ اُن کی امتیازی حیثیت کی حامل ہے لیکن عوام کی نظروں میں اسے عیب کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ یہاں تک کہ حضرت مریم کے لئے وہ اتہام و بدگمانی کا موجب بن گئی۔

لیکن جناب فاطمہ کی ساحت عصمت اور دامنِ عفت اس بدنامی سے پوری طرح محفوظ و مضمون تھا پس اُن کی ناکندائی نے واقعیت کے لحاظ سے اگرچہ ان کو ممتاز کیا لیکن ظاہری طور پر ان کی بدنامی اور شرمساری کی موجب ہوئی چنانچہ اپنی پاکدامنی و عفت کے اثبات میں اُسے اپنے نوزائیدہ فرزند حضرت عیسیٰ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن اس طرف جناب فاطمہ کی حضرت علیؑ سے شادی جس طرح واقعیت کے لحاظ سے ان کے علو شان کی موجب تھی اسی طرح ظاہری نگاہوں میں بھی اُن کی برتری و سیادت کے لئے غیر متنزہل علامت ہے پس جناب فاطمہ کو اس اعتبار سے بھی حضرت مریم سے وہ فوقیت حاصل ہے جس سے کسی منصف مزاج کو انکار کی مجال نہیں۔

یُلْقُوْنَ اَقْلَامَہُمْ تفسیر قمی منقول ہے کہ جب حضرت مریم کا تولد ہوا تو آلِ عمران نے اس کی کفالت و تربیت میں نزاع کیا اور ہر ایک اس کی کفالت اپنے ذمہ لیتا چاہتا تھا پس جب تمام نے اکٹھے ہو کر قرعہ اندازی کی تو قرعہ حضرت زکریا علیہ السلام کا نکلا۔ لہذا حضرت مریم کی تربیت ان کے سپرد ہوئی۔ لیکن تفسیر عیاشی سے مروی ہے کہ حضرت امام محمد باقر

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ فَتَخِضُّ

جب کہا۔ فرشتوں نے اے مریم۔ تحقیق اللہ تجھے بشارت دیتا ہے اپنے کلمہ کی جس کا

اِسْمُہُ الْمَسِيحُ عِيسٰی ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيہًا فِی الدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ ﴿۸۵﴾

نام مسیح عیسیٰ بن مریم جو مقبول ہوگا دنیا و آخرت میں اور مقرب بندوں سے ہوگا۔

وَيَكَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۸۶﴾

اور کلام کرے گا لوگوں سے مجھوتے میں اور بڑا ہو کر اور نیک بندوں میں سے ہوگا۔

علیہ السلام نے فرمایا۔ جب حضرت مریم کا والد فوت ہو گیا تب انہوں نے اس کی تربیت میں جھگڑا کیا اور قرعہ اندازی کی۔

تنبیہ :- حضرت مریم کی ولادت، تربیت، زکریا کی کفالت اور اس کے بعد حضرت مریم کی برگزیدگی، طہارت اور قنوت رکوع و سجود کے بعد قرعہ اندازی کا ذکر کرنا اس امر کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ قرعہ اندازی ان سب باتوں کے بعد واقع ہوئی تھی چنانچہ بعضوں نے یہ احتمال کیا ہے کہ حضرت مریم کے جوان ہونے اور اس کے اصطفاء و طہارت وغیرہ کے بعد جب حضرت زکریا بڑھاپے کی وجہ سے ان کی دیکھ بھال سے عاجز ہو گئے تب ان لوگوں نے مریم کی تربیت میں جھگڑا کیا اور باہمی قرعہ اندازی کی۔ کیونکہ یہ بات بالکل بے بنیاد ہے بلکہ قرعہ اندازی شروع میں کی گئی تھی۔ البتہ اس کا ذکر تربیت و کفالت و طہارت وغیرہ کے بعد کیا گیا۔ جس کی وجہ یہ تو یہ ہے کہ جمع قرآن میں ترتیب نزول کو ملحوظ نہیں رکھا گیا اور یہ کہ کلام مجید کی اعجازی حیثیت کو واضح کرنے کے لئے قصہ کی بعض خصوصیات کو دہرایا گیا اور وہ یہ کہ آنحضرتؐ اور ان کے صحابہ اس قصہ کے موقع پر موجود نہ تھے اور نہ انہوں نے بنی اسرائیل کی کتب کا مطالعہ کیا تھا نہ ان کے ساتھ کوئی خاص آمد و رفت یا نشست و برخاست تھی تاکہ ان کی زبانی بعض واقعات ان کو معلوم ہو گئے ہوں بایں ہمہ اس قصہ کا مطابق واقع ہونا اور بنی اسرائیل کے علماء کا مان لینا قرآن اور حامل قرآن کی صداقت کی کھلی ہوئی دلیل ہے اسی بناء پر قصہ کو مختصر الفاظ میں ذکر کرتے کے بعد فرمایا کہ آپ تو اس وقت موجود نہ تھے جب ان کی باہمی قرعہ اندازی ہو رہی تھی اور جب مریم کو بشارت دی جا رہی تھی پس یہ غیب کی خبریں ہیں جو بذریعہ وحی کے ہم آپ کو بتا رہے ہیں۔ یہ اس طرح ہے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ تمام ہو چکنے کے بعد ارشاد فرمایا :- **ذٰلِكَ مِنْ اٰثَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اٰخْتَمَعُوْا اٰمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ**۔ (سورہ یوسف) یعنی یہ غیب کی خبریں ہیں جن کی ہم آپ کو وحی کرتے ہیں حالانکہ آپ اس وقت موجود نہیں تھے جب انہوں نے مکر و فریب کا یہ معاملہ آپس میں طے کیا تھا؟

بشارت عیسیٰ :- **اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ**۔ یہ بشارت وہی ہے جس کو سورہ مریم میں تبدیلی الفاظ سے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ فرماتا ہے۔ پس ہم نے اس کی یعنی مریم کی طرف اپنا روح بھیجا پس وہ بشکی بشار اس کے سامنے گیا تو وہ کہنے لگی۔

میں تجھ سے اللہ کی پناہ لیتی ہوں اگر تو خوف خدا رکھتا ہے تو اُس نے جواب دیا کہ میں اللہ کا فرستادہ تجھے پاکیزہ بچے کی خوشخبری دینے آیا ہوں۔ پس میاں ملائکہ کا لفظ ہے اور وہاں اس کی بجائے روح کا لفظ رکھا گیا ہے۔

ملائکہ سے مراد بعض کہتے ہیں جبریل ہے اور جمع کا صیغہ اس کی عظمت و سیادت کے لئے ہے بعض کہتے ہیں واقعاً جبریل کے ساتھ اور ملائکہ بھی تھے اور ملائکہ یا روح کا حضرت مریمؑ کے ساتھ کلام کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ حضرت مریمؑ محترمہ تھیں۔ اور کلام مجید کے ظاہر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ کا اُن کے ساتھ کلام کرنا آواز اور الفاظ کی قسم سے اور رد برد و عتاب کہ خط و قلم سے کلمۃ مَنہ۔ کلمہ جب اللہ کی طرف منسوب ہو۔ تو اس کا معنی ہے وہ چیز جس سے اللہ کی مراد ظاہر ہو جیسے کلمۃ الایجاد اور کلمۃ الوحی اور اس مقام پر اس کی کئی توجہیں کی گئی ہیں۔

(۱) کلمہ سے مراد حضرت مسیحؑ ہیں کیونکہ ان سے پہلے انبیاء بنی اسرائیل بشارت کے طور پر یہ کلمہ کہہ چکے تھے کہ ایک نبی آئے گا جو بنی اسرائیل کو نجات دلانے والا ہوگا۔ پس حضرت مسیحؑ وہی کلمہ تھے جس طرح کہ حضرت موسیٰؑ کی آمد کی بشارت کے بعد ظہور موسیٰؑ کو خدا نے کلمہ کہا چنانچہ فرمایا: وَتَمَّتْ کَلِمَۃُ رَبِّکَ الْحَسَنٰی عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآئِیْلَ۔ (سورۃ اعراف) (۲) کلمہ کا اطلاق چونکہ کلام پر بھی ہوتا ہے اور میاں اس سے مراد ہے ارادۂ خداوندی کا مظہر۔ کیونکہ ملفوظی کلام سے اس کی ذات پاک و منترہ ہے پس جس طرح عالم وجود میں ہر موجود کی مراد وجود خالق کی دلیل اور اس کی توحید کے اثبات کے لئے ناقابل تردید برہان ہے گویا ہر شے زبان بے زبانی سے اس کی تخلیق اور صنعت و حکمت کی ترجمان ہونے کی حیثیت سے اس کا کلمہ و کلام ہے چونکہ بنی اسرائیل نے تورات میں تحریف کر کے اس کے مطالب و مضامین کو بدل ڈالا تھا اور حضرت عیسیٰؑ خدا کی جانب سے اصل مراد خداوندی کے ترجمان تھے چنانچہ اُن کا اپنا ارشاد ہے کہ میں بعض وہ چیزیں بیان کرنے کے لئے آیا ہوں جن میں تمہیں اختلاف ہے۔ پس اسی بناء پر اُن کو کلمہ کہا گیا۔

(۳) کلمہ سے مراد بشارت کا مفہوم ہے یعنی عیسیٰؑ کا حمل اور اس کی ولادت وغیرہ کی پیشین گوئی۔ معنی یہ ہوگا۔ کہ خدا تجھے بشارت دیتا ہے کہ تجھے بغیر شوہر کے حمل ہوگا اور تجھ سے ایک بچہ پیدا ہوگا جس کا نام مسیحؑ بن مریمؑ ہوگا۔

(۴) کلمہ سے مراد کلمۃ الایجاد ہے اور حضرت عیسیٰؑ خود کلمہ الایجاد خداوندی تھے یعنی یہ خود کلمہ مَرُوم کے مصداق تھے۔ اگرچہ تمام افراد انسانی کو بنی طور پر کُن سے عالم وجود میں آئے ہیں لیکن باقی افراد انسان کی پیدائش چونکہ اسباب و علل ظاہریہ کے ماتحت ہاں اور باپ و دلو کے ذریعے سے ہوئی اور حضرت عیسیٰؑ کی تخلیق اسباب عادیہ کی وساطت کے بغیر صرف کلمہ تکوین سے ہوئی۔ گویا وجود عیسیٰؑ بعینہ کلمہ کُن کا مصداق تھا چنانچہ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے وَکَلِمَۃُ الْفَاہِ الْاِیْمٰنِ (سورۃ اعراف) اور یہی توجیہ تمام توجیہات سے بہتر ہے اور پہلی ہر سہ توجیہات پر اعتراض وارد ہو سکتا ہے مثلاً پہلی توجیہ کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ اولاً تو سابق انبیاء کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق پیشین گوئیاں قرآن مجید میں ثابت نہیں اور ثانیاً اگر ثابت ہوں بھی تاہم حضرت عیسیٰؑ کو اسی بناء پر کلمہ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ بعد میں صاف طور پر ہے اِسْمُکَ الْمَسِیْحُ

اور ان کی پیشین گوئی ظہور عیسیٰ ہے نہ کہ خود عیسیٰ یعنی ان کا کلمہ تھا ظہور عیسیٰ کی پیشین گوئی اور خود عیسیٰ ان کا کلمہ نہ تھا۔ تاکہ کہا جائے کہ اس کا نام مسیح ہے الخ اور بعینہ تیسری توجہ یہ پر بھی یہی ایراد وارد کیا جاسکتا ہے کہ کلمہ سے مراد بشارت ہو۔ تو اسْمُ الْمَسِيحِ اس کی تائید نہیں کرتا۔ اور دوسری توجہ یہ تصحیح معنی کے لئے خوب ہے لیکن کوئی دوسرا قرینہ اس کی تائید نہیں کرتا اِسْمُ الْمَسِيحِ :- بروزن فعیل بمعنی مفعول یعنی مسح شدہ اور مسح کا معنی ہے پونچھنا۔ پس حضرت عیسیٰ کو مسیح کہنے کی کئی وجوہ بیان کی گئی ہیں۔

- (۱) ان کو مسیح اس لئے کہا گیا ہے کہ ان کے وجود اطہر پر مین و برکت اور خیر و خوبی کا مسح کیا گیا۔
- (۲) چونکہ ان کے وجود کو گناہوں کی آلائش سے پونچھ اور دھو دیا گیا اس لئے ان کو مسیح کا لقب دیا گیا۔
- (۳) کہتے ہیں کہ انبیاء زرتین کے تیل سے مالش کرتے تھے اور حضرت عیسیٰ کو بھی وہی مالش کی گئی اسی وجہ سے ان کو مسیح کہا گیا۔

- (۴) بوقت ولادت ان کو جبریل نے اپنے پردوں سے مسح کیا تھا۔ تاکہ ان کے لئے باعث تعویذ ہو۔
- (۵) چونکہ وہ یتیموں کے سر پر دست شفقت پھرتے تھے۔ بنا بریں ان کو مسیح کہا گیا۔ لیکن اس صورت میں مسیح بمعنی ماسح صیغہ اسم فاعل ہوگا۔

- (۶) چونکہ نابینا کی آنکھ پر ہاتھ پھیر کر اس کو بینا کر دیتے تھے یا یہ کہ ہر صاحب آفت پر مسح کر کے ان کو تندرست کر دیتے تھے اس لئے ان کو مسیح کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی صیغہ اسم فاعل کا ہوگا۔

- (۷) مسیح کا معرب ہے کہتے ہیں بنی اسرائیل کا طریقہ تھا کہ جب ان کے بادشاہ کا جشن تاجپوشی منعقد ہوا کرتا تھا۔ اور بادشاہ عنان حکومت کو سنبھالتا تھا تو کاہن لوگ کتاب مقدس سے اس کے جسم کو مسح کرتے تھے تاکہ اس کے نظام ملک کے لئے باعث برکت ہو۔ پس وہ اس کو مسیح کہا کرتے تھے جس کا معنی بادشاہ۔ یا مبارک ہوتا تھا۔

- (۸) عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ۔ اس کی اصل لیشوع بتلائی گئی ہے اور اس کا معنی نجات اور بچکارا دلانے والا اور بعض احادیث میں اس کا معنی یعیس ہے اور حضرت یحییٰ کے نام سے مناسبت تو اسی معنی کے لحاظ سے ہوتی ہے اور باوجودیکہ بشارت کا خطاب حضرت مریم سے ہے لیکن کہا جا رہا ہے کہ تیرا بچہ پیدا ہوگا جس کا نام عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔ حالانکہ اس مقام پر ابن مریم کہنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ بات ہی مریم سے ہو رہی ہے۔ پس اس سے مقصد صرف یہی ظاہر کرنا ہے کہ حضرت عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا ہوں گے اسی بنا پر تو ہر دو عالمین کے لئے آیت قرار دیا گیا۔

- (۹) وَهَيْكَلُهُ النَّاسِكُ فِي الْبَيْتِ وَكَهْلًا۔ کہوت جوانی اور بڑھاپے کے درمیان کے زمانہ کو کہا جاتا ہے۔ پس کہل وہ ہوگا۔ جس کے بالوں میں سفیدی داخل ہو رہی ہو اور بعضوں نے اس کی حد چوتیس سال بیان کی ہے۔

سوال :- کہوت کے زمانہ میں ہر شخص بولا کرتا ہے البتہ گوارے میں آرام کرنے والے بچے کا بولنا خلاف عادت ہے پس اس

قَالَتْ رَبِّ اَنْىٰ يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِى بَشْرٌ ۖ قَالَ كَذٰلِكَ

عرض کی اسے میرے پروردگار کیسے (پیدا) ہوگا میرا بچہ۔ حالانکہ مجھے مس تک نہیں کیا کسی انسان نے کہا (فرشتے نے) اسی طرح

اَللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۖ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۲۷﴾

اللہ پیدا کرتا ہے جسے چاہے جب وہ کسی امر کے ہونے کا فیصلہ کرے تو بجز اُسکے نہیں کہ فرماتا ہے اس کو ہو جا پس وہ ہوجاتی ہے

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۲۸﴾

اور اس کو علم دے گا کتاب اور حکمت و تورات اور انجیل کا

بشارت میں گہوارے میں کلام کرنے کے ساتھ کہوت میں کلام کرنے کی صفت کی کیا خصوصیت ہے؟
جواب۔ حضرت مریم کی خوشنودی کا لحاظ رکھا گیا ہے تاکہ وہ آج ہی سے ذہن نشین کرے کہ میرا بن باپ کے پیدا ہونے والا
بچہ پیچھے میں مرنے جائے گا۔ بلکہ طویل عمر پائے گا اور کہوت کا زمانہ بھی اس کو نصیب ہوگا۔

سوال۔ نصرائیوں کی موجودہ انجیلوں سے تو پتہ چلتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ دنیا میں کل تینتیس برس رہے اور اس کے بعد اٹھا
لئے گئے پس انہوں نے کہوت کے زمانہ میں کلام کیسے کیا؟ اور کلام اللہ کی تصدیق کیسے ہوئی؟

جواب۔ انجیلوں پر تحریف کے وقوع کی وجہ سے اعتماد نہیں کیا جاسکتا؛ اور جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے حضرت عیسیٰؑ دنیا
میں تقریباً چونتیس سال رہے ہیں اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ کہوت کے زمانہ میں کلام کرنے سے مراد ہے ان کا حضرت مہدی علیہ السلام
فرج کے زمانہ ظہور میں آسمان سے اتر کر کلام کرنا۔ (تفسیر میزان)

قَالَتْ سَمِعْتُ مِنَ الْغَيْبِ: فرزند کی بشارت کا خطاب اگرچہ فرشتوں سے یا روح سے سنا تھا۔ لیکن مریم کو علم تھا کہ یہ خطاب اللہ کی جانب
سے ہی ہے اور باپ کے بغیر اولاد کا ہونا چونکہ ظاہری طور پر ایک ناشدنی امر تھا اس لئے مقام استعجاب میں کلام کا رخ پروردگار
کی طرف کرتے ہوئے عرض گزار ہوئی۔ کہ میرے ہاں بچہ کیسے ہوگا؟ حالانکہ میری شادی نہیں ہوئی اور نہ مجھے کسی انسان نے

مس کیا ہے؟ تو فوراً جواب ملا۔ كَذٰلِكَ۔ بچہ ایسے ہی پیدا ہوگا۔ یعنی مریم کے ذہن میں اگر شادی کا احتمال ہو تو اس کلمہ
سے رفع کر دیا۔ کہ خدا ایسے ہی بغیر شادی کے اور بغیر مرد کے ہی تجھے بچہ عطا کرے گا۔ اور چونکہ حضرت مریمؑ کے استعجاب
سے ایک صورت انکاری کا شائبہ تھا اور علل و اسباب کی دنیا کا تقاضا بھی یہی ہے کہ بغیر مرد کے عورت کا بچہ پیدا نہیں

ہوتا۔ پس اس انکار کا جواب اس طرح دیا۔ اَللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ۔ خدا جسے چاہے پیدا کر سکتا ہے اور اس کی قدرت اسباب کی محتاج
نہیں بلکہ وہ جب حتمی ارادہ کسی شے کے کرنے کا فرماتا ہے تو وہ شے ہو جاتی ہے۔ نیز لفظ کُن سے ہماری تفہیم کے
لئے ہے ورنہ خدا تخلیق میں کسی لفظ کا محتاج نہیں پس یہاں مراد یہ ہے کہ خدا کے ارادہ اور فعل میں فرقہ بھر بھی زمان کا فاصلہ

منہیں ہوتا بلکہ ادھر اس کا ارادہ ہوتا ہے اُدھر چیز ہو جاتی ہے جس طرح کہنے والا کُنْ کہے اور تھے ہو جائے۔
وَيُكَتِّبُ الْكِتَابَ - کتاب اور حکمت پر جو لام داخل ہے، جنس کا ہے، کتاب سے مراد یہاں مطلق وحی اور حکمت سے مراد مطلق معرفت جو عمل و اعتقاد سے متعلق ہو پس تورات و انجیل کا عطف، عطف خاص بر عام ہے۔

التَّوْرَةِ اِنَّ - اس سے مراد وہ کتاب ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور یہودی خود معترف ہیں کہ بخت نصر کے بعد تورات کی سند محفوظ نہیں رہ سکی۔ لیکن بایں ہمہ تورات تسلیم کرتا ہے کہ یہودیوں کے پاس موجودہ تورات جو زبان رسالت میں تھی۔ اصلی تورات سے بالکل الگ نہیں۔ اگرچہ تحریف سے بھی خالی نہیں۔

وَالْاِنْجِيلَ - اس کا معنی ہے بشارت۔ لفظ کا واحد ہونا بتلاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ پر انجیل صرف ایک اُتری تھی اور زبان رسالت میں موجودہ چار انجیلیں جو متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی طرف منسوب ہیں وہ بعد کی تصنیف شدہ ہیں۔

وَمَنْ سُوِّدَا الْاَنْبِيَاۓ - رسول اور نبی میں فرق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ رسول وہ ہے جو صاحب کتاب و شریعت ہو اور نبی وہ ہے جو تبلیغ احکام خداوندی پر مامور ہو۔ خواہ صاحب کتاب ہو یا نہ ہو۔
نبی اور رسول میں فرق
بنابرین عہدہ رسالت کو نبوت سے خاص و عام مطلق کی نسبت ہے اور صاحب میزان نے یہ بیان کیا ہے کہ نبوت اور رسالت دو جہل جہل منصب ہیں نہ ان کا یکجا ہونا ضروری ہے اور نہ ان کا الگ الگ رہنا لازمی ہے یعنی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص نبی ہو اور رسول نہ ہو اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رسول ہو اور نبی نہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نبی بھی ہو اور رسول بھی۔ پس ان دونوں کے درمیان نسبت عام و خاص من و وجہ کی ہوگی۔

نبوت: احکام الہیہ کی عمومی تبلیغ کا عہدہ ہے اور رسالت ایک خصوصی سفارت کا منصب ہے کہ اس کا رد کرنا ہلاکت کا موجب ہو اور قبول کر لینا نعمت و رحمت کا باعث ہو۔ یعنی نبی وہ انسان ہے جو لوگوں پر دین خدا کی ترجمانی کے لئے مبعوث ہو اور رسول وہ انسان ہے جو بعض ایسے خصوصی احکام کے لئے مبعوث ہو جن کی تردید عذاب الہی کا پیغام اور قبول انعام خداوندی کا مترادف ہو۔ اور قرآن مجید میں انبیاء کے قصص سے رسالت کا مفہوم یہی کچھ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ نوح، ہود، صالح اور شعیب وغیرہ جس قدر رسول بن کر آئے اُن کے واقعات اس معنی کے شاہد ہیں جو ہم بیان کر چکے ہیں۔

پس ضروری نہیں کہ جو شخص ایک قوم کی طرف رسول ہو وہ اس قوم کا نبی بھی ہو۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ایک قوم کے لئے رسول بھی ہو۔ اور نبی بھی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی نبوت عامہ ہو یعنی بہت سی قوموں کے لئے ہو لیکن رسالت اس کی صرف ایک یا بعض اقوام کے لئے محدود ہو۔ جیسے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام یہ دونوں نبی نبوت عامہ کے عہدہ دار تھے لیکن رسالت ان کی صرف بنی اسرائیل تک محدود تھی اور تورات میں اس معنی کی تائیدات کافی موجود ہیں۔

حضرت موسیٰ فرعون کی طرف رسول تھے لیکن جادوگر ایمان لائے اور ان کا ایمان مقبول بھی ہوا۔ حالانکہ بنی اسرائیل

وَسُؤْلًا اِلَىٰ بَنِي إِسْرَٰئِيْلَ ؕ اِنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ

اور اُسے رسول بنا کر بھیجے گا طرف بنی اسرائیل کے (کہ کہے گا) میں لایا ہوں تمہارے پاس نشانی تمہارے رب کی طرف سے

اِنِّیْ اَخْلَقْتُ لَكُمْ مِّنَ الطَّیْنِ كَهَیْئَةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخْ فِیْهِ فِیْکُوْنُ

میں بناتا ہوں تمہارے سامنے مٹی سے ایک پرندہ کا ڈھانچہ پس اس میں پھونکتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے

طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاُبْرِئُ الْاَکْمَهٗ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ السَّوْتِی

پرندہ ہو جائے گا اور تندرست کرتا ہوں نابینا اور مبرص کو زندہ کرتا ہوں مردوں کو

بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاَنْبِئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدْخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِكُمْ

بازن خدا اور تمہیں خبر دے سکتا ہوں جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ ذخیرہ بناتے ہو اپنے گھروں میں

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمۡ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنٰیۙ

تحقیق اس میں تمہارے لئے نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو

سے نہ تھے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل کی طرف رسول تھے حالانکہ ان پر ایمان لانے والے بہت سے لوگ۔ مثلاً حبشہ، بخران اور روم وغیرہ بنی اسرائیل سے نہ تھے اور قرآن مجید میں نصاریٰ کا جہاں بھی ذکر ہوا ہے خواہ مدح کی صورت میں یا مذمت کی صورت میں صرف بنی اسرائیل کے نصاریٰ کے لئے اس کا اختصا ص نہیں بلکہ تمام دین نصاریٰ رکھنے والوں کو شامل ہے۔ پس معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ ہر دو کی رسالت اگرچہ محدود تھی۔ لیکن اُن کی نبوت پوری دنیا کیلئے تھی۔ اَخْلَقْتُ لَكُمْ۔ روایات ائمہ علیہم السلام میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو پرندہ بنا کر اس میں نفخ رُوح کیا تھا۔ وہ چمکا ڈر تھا۔ جیسا کہ بحار الانوار میں صادقین علیہا السلام سے منقول ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں سے احیا ہر مرنے والے اور خلق طیر چونکہ ایسے معجزے تھے کہ ان کو دیکھ کر لوگوں کے گمراہ ہونے کا ڈر تھا اس لئے ان کے ذکر کے بعد فوراً بِاِذْنِ اللّٰهِ کا اضافہ کیا گیا ہے تاکہ لوگ حضرت عیسیٰ کو خدا مان کر مشرک نہ ہو جائیں اور سمجھ لیں کہ یہ کام صرف اللہ ہی کر سکتا ہے یا کر سکتا ہے وَاَنْبِئُكُمْ۔ بروایت تفسیر قمی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل کو فرماتے تھے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ مٹی سے پرندے کا بوتہ بنا کر اس میں پھونکتا ہوں۔ وہ اللہ کے حکم سے جیتا جاگتا پرندہ بن جاتا ہے اور نابینا و مبرص کو شفا یاب بھی کر سکتا ہوں تو اس کے جواب میں وہ کہتے تھے کہ یہ سب کچھ ہمیں تو جادو معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں کوئی ایسی چیز دکھائیے جس سے ہم مان جائیں کہ آپ سچے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا۔ اگر میں تمہیں یہ بتا دوں کہ تم نے کیا کھایا اور کیا بچا کر گھر میں

وَمَصَدَّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَإِلَّا حِلٌّ لَّكُمْ بَعْضُ

اور تصدیق کرنے والا ہوں اس کی جو میرے سامنے ہے تورات سے اور تاکہ حلال کروں تمہارے لئے بعض چیزیں

الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا ۝۵۰

جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں اور لایا ہوں میں تمہارے پاس نشانی تمہارے رب کی طرف سے پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو

إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَأَعْبُدُوا هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝۵۱

تحقیق اللہ میرا اور تمہارا رب ہے۔ پس اسی کی عبادت کرو۔ یہ سیدھا راستہ ہے

ذخیرہ کیا تو پھر میری صداقت مان لو گے؟ کہنے لگے ”جی ہاں“ تب آپ فرماتے تھے کہ تو نے فلاں فلاں چیز کھائی ہے فلاں چیز پی ہے اور فلاں چیز حج کی ہے پس بعض لوگ تسلیم کرتے ہوئے ایمان لاتے تھے لیکن بعض پھر بھی راہ کفر اختیار کر لیتے تھے۔

وَأُحْيِي الْمَوْتَى۔ حضرت عیسیٰؑ کے اصحاب نے آپ سے مردہ کے زندہ کرنے کی درخواست کی تو آپ حضرت سام بن نوح کی قبر پر تشریف لائے اور فرمایا: **بِسْمِ اللَّهِ**۔ پس قبر شکافتہ ہوئی اور پھر وہی کلمہ فرمایا تو مردہ میں حرکت پیدا ہوئی۔ پھر سہ بارہ فرمایا تو سام بن نوح باہر آگئے۔ آپ نے فرمایا کہ رہنا چاہتے ہو یا واپس جانا چاہتے ہو؟ تو اس نے جواب دیا: اے روح اللہ میں واپس جانا چاہتا ہوں کیونکہ موت کی سوزش اور تکلیف اس وقت تک میرے اندر موجود ہے۔

ایک شخص سے حضرت عیسیٰؑ کی بڑی محبت تھی اور آپ اکثر اس کے ہاں جایا کرتے تھے ایک مرتبہ آپ کافی عرصہ کے بعد جب اس کو ملنے گئے تو اس کی ماں نے آپ کا سلام کیا۔ آپ نے اپنے دوست کے متعلق دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ وہ مر چکا ہے آپ نے فرمایا کہ تو اُسے زندہ دیکھنا چاہتی ہے تو اُس نے جواب دیا: ہاں۔ آپ نے کل کا وعدہ کیا اور چلے گئے۔ دوسرے روز اس کی ماں کو ساتھ لے کر اس کی قبر پر پہنچے اور دعا مانگی۔ پس وہ زندہ ہوا اور ماں بیٹا رو رو کر ایک دوسرے کے گلے ملے۔ پس حضرت عیسیٰؑ نے اس سے پوچھا کہ کیا تو اپنی ماں کے پاس دنیا میں زندہ رہنا چاہتا ہے؟ اُس نے عرض کی: جی ہاں! پس آپ نے اسے اپنی ماں کے حوالہ کیا اور وہ بیس برس زندہ رہا۔ اس نے شادی بھی کی۔ اور اولاد بھی ہوئی۔ (البرہان)

وَمَصَدَّقًا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ تورات کے مصدق تھے لیکن وہ تورات جو دراصل حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی نہ کہ یہ تورات جس کو تحریف کے ظالم ہاتھوں نے اپنے اصلی مقام سے ہٹا دیا اور نیز اس کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیے کہ حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام تورات کے غیر محرف ہونے کی تصدیق فرمانے والے تھے جس طرح کے قرآن مجید تورات و انجیل ہر دو کا مصدق ہے لیکن تورات و انجیل اصلی کا نہ کہ موجودہ تورات و انجیل کے غیر محرف ہونے کا مصدق ہے۔

وَإِلَّا حِلٌّ لَّكُمْ۔ یہودیوں کی سرکشیوں کی وجہ سے جو چیزیں ان پر حرام کر دی گئی تھیں۔ انہی کی تحلیل کے متعلق ارشاد ہے اس کلام سے

فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ ط قَالَ

پس جب محسوس کیا (حضرت عیسیٰ نے اُن سے کفر فرمایا) میرے انصار کون ہوں گے طرف اللہ کے؟ تو حواریوں

الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ آمَنَّا بِاللَّهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿۵۲﴾

نے جواب دیا کہ ہم اللہ کے انصار ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ ہوں کہ ہم مسلمان ہیں

رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا

اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے نازل فرمائی اور اطاعت قبول کی رسول کی پس ہمیں درج فرما

مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿۵۳﴾ وَمَكْرُؤًا وَمَكْرًا لِلَّهِ ط وَاللَّهُ خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ ﴿۵۴﴾

شہادت دینے والوں کے ساتھ اور انہوں نے تدبیر کی اور خدا نے بھی تدبیر کی اور خدا اچھی تدبیر کرنے والا ہے

صاف ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ تورات کے احکام کے مضاد کرنے والے تھے صرف بعض احکام شقہ کے نسخہ تھے پس مقصد یہ ہوا کہ میں تورات کے اوامر و نواہی کی تصدیق کرنے والا ہوں۔ البتہ بعض وہ احکام جن کی حرمت تم پر لازم کر دی گئی تھی۔ ان کو منسوخ کر کے ان کی جگہ حلیت کا حکم لایا ہوں

إِنَّ اللَّهَ سَرِيعٌ۔ چونکہ اس سے پہلے احیاء موتی اور خلق طیسر وغیرہ کا ذکر تھا۔ مبادا لوگ ان باتوں کو دیکھ کر خدا نہ کہہ دیں لہذا حضرت عیسیٰ نے اپنے مذکورہ اداء کے بعد اللہ کی ربوبیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی عبادت کا حکم دے دیا۔ اور اسی کو صراطِ مستقیم سے تعبیر فرما دیا۔ گویا حضرت عیسیٰ کو بذریعہ وحی علم تھا کہ لوگ ایسا کہیں گے لہذا پہلے سے ہی ان کے عذر کو ختم کر دیا اور حجت تمام کر دی۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان چار سو سال کا فاصلہ تھا اور انجیل میں صرف پند و نصائح تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں جو باتیں شاق تعین اس میں ان کی تحقیق تھی اس کے علاوہ انجیل میں قصاص، حدود، اور میراث وغیرہ کے احکام نہیں تھے بلکہ یہ احکام وہی تھے جو تورات میں مندرج تھے۔

فَلَمَّا أَحَسَّ الْجَنُّ۔ چونکہ جب حضرت مریمؑ کو فرزند کی بشارت دی گئی تو اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بہت سی خصوصیات کا ذکر کر دیا گیا۔ لہذا یہاں تتمہ کے طور پر حضرت عیسیٰ کے قصہ میں سے آخری جملہ کو ذکر فرما دیا تاکہ اختصار بھی رہے اور افادیت میں بھی کمی اور تشنگی باقی نہ ہو۔

قَالَ مَنْ أَنْصَارِي۔ جب کوئی تائید کسی تحریک کو جاری کرتا ہے اور اس کے پرچار میں شب و روز کی محنت و کوشش کو عمل

میں لاتا ہے تو اسے اپنی تحریک کو جاری اور باقی رکھنے کے لئے ایک خصوصی گروہ کا انتخاب کرنا پڑتا ہے جن کے دل میں درد ہو اور جن پر اعتماد ہو کہ یہ لوگ اس کو آگے چلائیں گے چنانچہ دعوت اسلام میں بیعت عقبہ اور بیعت شجرہ اسی دینی تحریک کی ہمہ گیری کے لئے ایک منظم جماعت کی تشکیل کا پروگرام تھا۔ پس اسی قاعدہ کے ماتحت جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنا تبلیغی پروگرام شروع کیا۔ معجزات دکھائے اور شب و روز اپنی انتھک کوششوں سے لوگوں کو کسی حد تک اپنی تحریک سے مانوس کر لیا اور دیکھا کہ بہت سے لوگ کچھ اعلانیہ اور کچھ خفیہ طور پر میری ان تبلیغی سرگرمیوں کو ختم کرنے کے درپے ہیں اور میری ایذا رسانی پر ٹٹے ہوئے ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اپنے اس ناپاک ارادہ میں کامیاب ہو جائیں تو ایسا نہ ہو کہ میرے بعد ترویج دین کا سلسلہ بالکل ختم ہو جائے۔ لہذا انہوں نے ایک منظم جماعت کی تشکیل کا پروگرام مرتب فرمایا۔ اور منافق لوگوں کے اعمال و کردار سے بدینتی اور کفر پر آمادگی کو بجانب کر اپنے خصوصی انصار اور غلصہ جان شاعر علیحدہ معلوم کرنے کے لئے فرمایا: مَسْنُونُ الْاَنْصَارِ مَجِی یعنی کوئی ہے میرا سہمہ و جو میرے اس دین کی ترویج میں غلصہ سے آگے بڑھنے والا ہو، تب حواریوں کی جماعت نے آپ کی آواز پر صدائے لبیک بلند کی۔

الْحَوَارِیُّونَ: اصل اس کی حور ہے جن کا معنی سفیدی ہے لیکن اس کا استعمال کسی انسان کے خواص پر ہوتا ہے اور قرآن میں صرف حضرت عیسیٰ کے خواص پر اس لفظ کا استعمال ہے

وَمَكَرُوا مَكْرًا كَبِيرًا: ان کے مکر و تدبیر سے مراد ہے۔ ایذا رسانی کے درپے ہونا اور اللہ کے مکر و تدبیر سے مراد ہے حضرت عیسیٰ کو بچالینا۔ اور آسمان پر اٹھالینا اور یہ واضح رہے کہ نصاریٰ بخران کے مقابلہ میں حضرت عیسیٰ کے قفقہ کی جس حد تک ضرورت تھی اتنا ہی بیان فرمایا۔ اسی لئے پورا قفقہ نہیں دہرایا گیا۔

امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ سے حواریین کی وجہ تسمیہ دریافت کی گئی تو آپ نے فرمایا۔ کہ لوگوں کے نزدیک تو ان کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ دھوبی تھے اور کپڑوں سے میل اتارتے تھے اس لئے ان کو حواری کہا جاتا ہے کیونکہ خنجر حواری سے مشتق ہے یعنی خالص سفید روٹی۔ اور ہمارے نزدیک ان کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ خود بھی گناہوں کی میل کچل سے پاک تھے اور لوگوں کو بھی بذریعہ وعظ و نصیحت گناہوں کی میل سے بچاتے تھے۔

کتاب توحید میں آپ سے مروی ہے کہ ان کی تعداد بارہ تھی اور ان سب سے افضل و اعلم ہوتا تھا۔

۲۴۲
اِذْ قَالَ اللّٰهُ: مَرْغُلَامُ اٰمِدْ قَادِیَانِیْ نَعِیْ مَسِیْحُ مَوْعُوْدُ بَنَیْ کِی شَوْقِیْ مِیْنِ حَضْرَتِ عِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ
حیات مسیح علیہ السلام کی موت کا اعلان کیا جس طرح کہ حضرت عیسیٰ کے متعلق یہودیوں نے انواہ عام پھیلائی تھی کہ انہیں سولی پر چڑھا دیا گیا اور قتل کر دیا گیا۔ قادیانی لوگ اپنے عقائد کے دعویٰ کو سچا ثابت کرنے کے لئے عام مسلمانوں کو قرآن کی اُن آیات سے دھوکا میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں جن میں حضرت عیسیٰ کے متعلق قرآنی لفظ کو استعمال کیا گیا ہے اور ان کا معنی موت بیان کر کے مسیح موعود کا خطاب میرزائے قادیانی پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور عوام بیچارے اکثر اُن کے پلندے میں اگر دین سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

إِذْ قَالَ اللَّهُ لِيَعْسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ

جب فرمایا اللہ نے اے یسے! تجھے پورا لینے والا اور اپنی جانب اٹھانے والا اور تجھے نجات دینے والا ہوں

الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ

ان لوگوں سے جو کافر ہیں اور کرنا والا ہوں تیرے تابعداروں کو بلند ان سے جو کافر ہیں قیامت تک

الْقِيَامَةِ ثُمَّ إِلَىٰ مَرْجِعِكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿۵۵﴾

پھر میری جانب تم سب کی بازگشت ہوگی پس میں فیصلہ کروں گا تمہارے درمیان جس چیز میں تم اختلاف کرتے تھے۔

خداوند کریم نے اس آیت مجیدہ میں جہاں یہودیوں کے غلط پروپیگنڈے کی غیر مبہم الفاظ میں تردید کرتے ہوئے ان کے منہ میں لگام دی ہے اسی طرح بعد میں اگر مسیحیت کا لباس اور مٹنے کے شدید اثرات کا بھی حیات مسیح کا اعلان فرما کر ناطقہ بند کر دیا ہے بروایت اکمال حضرت صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ حضرت عیسیٰ کو خدا نے نور علم حکمت اور انبیائے سابقین کے علوم کے علاوہ انجیل بھی عطا فرما کر بیت المقدس میں بنی اسرائیل کی تبلیغ کے لئے بھیجا۔ آپ وہاں تینتیس برس مقیم رہے اور اس کے بعد یہودیوں نے اس کے ساتھ مکر کیا۔ اور خدا نے ان کو محفوظ کرتے ہوئے اپنی طرف اٹھا لیا درایت میں تینتیس برس صرف تبلیغی عمر ہے نہ کہ کل عمر لہذا کہوت میں ان کے کلام کرنے سے متعارض نہیں۔

بروایت تفسیر قمی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضرت عیسیٰ نے اپنے بارہ حواریین کو اسی شام اپنے پاس طلب کیا۔ جس رات کو وہ اٹھائے جانے والے تھے پس وہ آئے اور آپ نے ان کو ایک کمرہ میں داخل کیا اور آپ زادیہ گھر میں جو تالاب تھا اس میں غوطہ لگا کر باہر نکلے اور بالوں کو پانی سے جھاڑتے ہوئے ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ مجھے بخیر ودی اطلاع ہوئی ہے کہ خدا مجھے اپنی جانب اٹھانے والا ہے اور یہودیوں کے شر سے مجھے نجات دینے والا ہے پس تم میں سے کون جو میری قربانی کرے کہ اس کی میری شبیہ بنایا جائے تاکہ اس کو میری جگہ قتل اور پھانسی کی سزا دی جائے پس وہ میرے درجہ میں میرا شریک ہوگا۔ پس ایک جوان نے لبیک کہی۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تم میں سے ایک آدمی قبل از صبح کافر ہو جائے گا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تم لوگ فرقوں میں بٹ جاؤ گے۔ دو فرقے افتراء پر داز جہنمی ہوں گے اور ایک فرقہ جو شتموں (دھی عیسے) کا تابع ہوگا۔ جنتی ہوگا۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ ان کے دیکھتے ہی کمرہ کے ایک گوشہ سے بلند ہو کر ان کی نظروں سے چھپ گئے۔

اسی شب یہودی حضرت عیسیٰ کی تلاش میں آ پہنچے اور انہوں نے دو آدمیوں کو پکڑ لیا۔ ایک وہ جوان جو اپنے آپ کو مورت کے لئے پیش کر چکا تھا۔ پس اس کو قتل کر کے سولی پر لٹکا دیا اور دوسرا کافر ہو گیا جس کے متعلق حضرت عیسیٰ نے صبح سے قبل کافروں نے کی پیش گوئی کی تھی۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت عیسیٰ کی شبیہ اُس شخص پر ڈالی گئی جو یہودیوں کو حضرت عیسیٰ

فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَعَذَّبْنَا بِهِمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

پس وہ لوگ جو کافر ہیں تو ان کو عذاب دوں گا سخت دنیا اور آخرت میں

وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ۝۵۱ وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ

اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا اور لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمال نیک کئے پس پورا دے گا

أُجُورَهُمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝۵۲ ذَلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ

ان کو اجر ان کا اور اللہ نہیں دوست رکھتا ظالموں کو یہ ہم تلاوت کرتے ہیں تیرے اوپر کتاب

وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ ۝۵۳

اور ذکر حکیم

کے گرفتار کرنے کے لئے لایا تھا۔

امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضرت عیسیٰ کو زمین سے زندہ اٹھایا گیا اور آسمان وزمین کے درمیان ان کی قبض روح (توفی) کی گئی پھر آسمان پر لے جانے کے بعد ان کی روح واپس لوٹادی گئی جتنا پھر اپنی متوفی کے دس اضعاف الیٰ کا یہی مطلب ہے

سب سے پہلے وفات اور موت یا توفیٰ اور اِمَاتۃ کے معنی میں فرق سمجھنا ضروری ہے اور اس مسئلہ کا حل بھی اسی پر ہی موقوف ہے۔

موت اور وفات میں فرق

تَوَفَّیَ - کا مادہ اشتقاق و فی دواء ہے اور اس کا معنی ہے پورا دینا۔ مثلاً کہا جاتا ہے فلاں نے فلاں سے وفاق کیا۔ یعنی اس کو اپنا حق پورا دے دیا یا اس کا حق پورا ادا کر دیا اور تَوَفَّیَ کا معنی ہے پورا لے لینا جیسا کہ اس کی مطابقت کا تقاضا ہے جس طرح کہا جائے۔ وَفَّاهُ تَوَفَّیَ - یعنی اس نے اس کو پورا حق دے دیا۔ پس اُس نے پورا لے لیا۔

اِمَاتۃ موت سے اور اَحْیاء حیات سے ہے اور موت و حیات میں تقابل ہے پس موت کا معنی ہے۔ عدم الحیات (زندگی کا سلب ہونا) قرآن مجید میں تَوَفَّیَ اور موت ہر دو لفظیں استعمال کی گئی ہیں لیکن ان کے عمل استعمال میں غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے معانی الگ الگ ہیں اور تَوَفَّیَ کا معنی موت سے عام ہے کیونکہ اس کا معنی ہے پورا لے لینا اور موت میں بھی چونکہ نفس انسانی کو خدا اس کے بدن سے پوری طرح نکال لیتا ہے۔ اس لئے موت پر بھی تَوَفَّیَ کا اطلاق کر دیا جاتا ہے جس طرح انہی مناسبات و خصوصیات کی بناء پر ارتحال اور قضا کی لفظیں بھی موت کے معنی میں استعمال ہوتی ہیں۔ حالانکہ معنی کے لحاظ سے اس سے عام ہی اور ہماری زبان میں بھی یہ استعمال بعینہ موجود ہے مثلاً کہا جاتا ہے۔ فلاں

کی موت آگئی، قضا آگئی، اجل آگئی۔ پوری ہو گئی، ختم ہو گئی، لیکن ان استعمالات سے ہرگز یہ دھوکا نہیں کھایا جاسکتا۔ کہ قضاء، اجل پوری، رحلت اور ختم وغیرہ کی لفظیں جہاں بھی استعمال ہوں گی ان سے مراد موت کی جانے لگی۔ اب قرآن مجید میں تَوَفَّی کے استعمالات ملاحظہ فرمائیے:-

تَوَفَّیْنَا سُلَیْمٰنَ (سورۃ النعام) ہمارے فرستادہ (ملائکہ) اس کو پورا لے لیتے ہیں یعنی اس کی رُوح کو قبضہ میں کر لیتے ہیں اور ملائکہ کے رُوح کو قبضہ میں لینے سے چونکہ قوائے جسم سے حیات رخصت ہو جاتی ہے۔ بنا بریں اسے موت کی جگہ پر استعمال کیا گیا:- فَتَوَفَّیْنَاکُمْ مَلَکُ الْمَوْتِ الَّذِیْ دُوِّنَ بِکُمْ (سورۃ مسجدہ) تمہیں پوری طرح لے لیتا ہے یعنی تمہاری رُوحیں قبض کر لیتا ہے وہ موت کا فرشتہ جو تمہارے اوپر وکیل ہے تَوَفَّی کو موت سے کنایہ کیا گیا ہے اللہ تَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا وَالتَّی لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَاہِہَا فِیْمَسِکُ الَّذِیْ قَضٰی عَلَیْہَا الْمَوْتِ وَیُؤَسِّلُ الْاُخْرٰی (سورۃ نازعہ) اللہ پوری طرح لے لیتا ہے (محفوظ کر لیتا ہے) نفسوں کو جن کی موت آچکی ہے اور جن کو موت نہیں آئی (نیںد میں) پس اپنے پاس روک لیتا ہے اُن کو جن کی موت کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے اور دوسروں کو چھوڑ دیتا ہے اس آیت میں صاف ظاہر ہے کہ تَوَفَّی موت سے عام ہے یعنی بوقت نیند تمام نفسوں کی وفات ہو جاتی ہے یعنی تمام نفسوں کو قبض کر لیا جاتا ہے اور محفوظ کر لیا جاتا ہے پس جن کی موت آچکی ہو اُن کو روک لیا جاتا ہے اور جن کی اجل باقی ہو، ان کو واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تَوَفَّی کو قرآن مجید میں جس مقام پر موت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے وہاں اسی پورا لینے اور محفوظ کرنے کے معنی کو ملحوظ رکھ کر کنایہ موت سے کیا گیا ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ اس جگہ موت کا معنی بالکل فنا اور باطل ہو جانا نہیں ہے بلکہ اللہ اپنے پاس محفوظ کر لیتا ہے اور جب چاہے اُسے واپس بھیج سکتا ہے۔ بہر کیف جہاں بھی قرآن میں تَوَفَّی کا معنی موت لیا گیا ہے وہ صرف کنایہ ہے کیونکہ موت میں بھی نفس کو پورا لے لیا جاتا ہے اور تَوَفَّی کا معنی بھی یہی ہے ورنہ درحقیقت تَوَفَّی کا مفہوم موت سے عام ہے۔

پس اس مقام پر ترجمہ آیت یہ ہے کہ ارشادِ قدرت ہوا:- اے عیسے میں تجھے پورا لینے والا اور محفوظ کرنے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں اور تجھے کافر لوگوں سے پاک و منزه کرنے والا ہوں۔ یعنی نجات دینے والا ہوں اور یہودیوں کے اعداء قتل کو دوسرے مقام پر اس طرح رد فرماتا ہے چنانچہ ارشاد ہے:- تَرْجِیْہِ اَنْ کَاہِنَا کہ ہم نے مسیح عیسے بن مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا۔ حالانکہ نہ انہوں نے اس کو قتل کیا ہے۔ نہ سولی چڑھایا ہے لیکن ان کو شبہ دیا گیا اور وہ لوگ جو اس بارے میں اختلاف کرتے ہیں ان کو اشتباہ ہے ان کے پاس کوئی علمی خبر نہیں سوائے اطاعت ظن کے اور یقیناً انہوں نے اس کو قتل نہیں کیا بلکہ اس کو خدا نے اپنی طرف اٹھا لیا۔ اور اللہ عز و جل حکیم ہے اور کوئی اہل کتاب نہیں جو اس کی موت سے قبل اس پر ایمان نہ لائے اور وہ بدو قیامت ان پر گواہ ہوگا (سورۃ نساء)

پس قرآن مجید واضح اور غیر مبہم الفاظ میں حیاتِ حضرت مسیح کا اعلان کر رہا ہے اور جو لوگ اُن کی موت کا ڈھنڈورا

پٹیتے ہیں وہ صرف اپنے مسیح موعود ہونے کے دعوے کی تصدیق کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں اور عوام جہلاء کی آنکھوں میں دھول جھونک کر قرآن مجید کے بعض الفاظ کو اپنے استنبہاد میں لاتے ہیں۔ خداوند کریم جملہ مومنین کو ان کی تسویلات باطلہ و تادیلات عاطلہ کی گرفت سے محفوظ و مصون فرمادے۔

موت مسیح ثابت کرنے کے لئے یہ لوگ کشمیر میں ایک مفروضہ قبر پیش کر کے جہلاء کو اس دھوکا میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہی حضرت عیسیٰ کی قبر ہے جو یہودیوں کے ڈر سے یہاں بھاگ آئے تھے اور پھر اسی جگہ دفن ہوئے حالانکہ یہ صرف فرضی انسانہ اور من گھڑت ترشی نرشانی ہوتی ہے بنیاد اور بے سرو پا داستان ہے جس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں اور مدعی مسیحیت کے دعوئی کی تکذیب کے لئے یہی کافی ہے کہ دنیا بھر کے اہل کتاب اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان لانا تو درکنار اس کو جانتے تک نہ تھے کہ یہ کس بانع کی مولا ہے۔ ہاں بعض شاذ و نادر افراد سے اس کے راہ و رسم ان یسن اھل الکتاب کے استغراقی مفہوم کی خانہ پڑی نہیں کر سکتے پس معلوم ہوا کہ وہ مسیح جس کی موت سے پہلے تمام اہل کتاب اس پر ایمان لائیں گے وہ ابھی زندہ موجود ہیں اور وہ حضرت مہدی علیہ السلام کی معیت میں دوبارہ تشریف لائیں گے اور ان کی تشریف آوری کے بعد آیت مذکورہ کی عملی تصدیق ہوگی اور خدا کا وعدہ سچا ثابت ہو کر رہے گا۔

وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ - خداوند کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے وعدہ فرمایا ہے کہ میں تیرے تابعداروں کو کافروں پر فوقیت دوں گا قیامت تک کے لئے۔ اور تابعداران حضرت عیسیٰ جناب رسالت کی اطاعت کا حکم دے گئے تھے پس مطلب یہ ہوا کہ قبل از بعثت کے اطاعت گزار عیسائی اور بعد بعثت کے اطاعت گزار مسلمان کافر لوگوں پر قیامت تک فوقیت رکھنے والے ہوں گے اور فوقیت سے مراد نہ ملکی و سیاسی فوقیت بلکہ روحانی و علمی بلندی ہے۔ لیکن یہ توجہ دو درجہ سے درست نہیں ہے۔

اولاً تو خداوند کریم یہودیوں کی ایذا رسانی کے مقابلہ میں فرما رہا ہے کہ تجھے محفوظ کر کے اپنی طرف اٹھاؤں گا اور تیرے اطاعت گزاروں کو غلبہ عطا کروں گا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ کو بالفعل یہودیوں سے مغلوب ہونے کی وجہ سے جو کوفت و تکلیف تھی اس کے بدلہ میں خدا ان کے اطاعت گزاروں کے غلبہ کی خوشخبری سے ان کی تالیف خاطر فرما رہا ہے تاکہ ان کا رنج و غم سرور سے متبدل ہو جائے تو حضرت عیسیٰ کی مغلوبیت جس نوع کی ہوگی۔ یہ غلبہ بھی اسی قسم کا ہوگا۔ جس کی بشارت دی جا رہی ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ کی مغلوبیت روحانی و علمی قسم کی نہ تھی بلکہ اس حیثیت سے تو وہ یقیناً غالب تھے تو یقیناً ان کی مغلوبیت یہی ظاہری قسم کی تھی جو قوت و طاقت کے فقدان کا نتیجہ ہوا کرتی ہے لہذا ان کی تالیف قلبی و تسکین خاطر کے طور پر ان کے اطاعت گزاروں کے روحانی و علمی تفوق کی خوشخبری سنانا بے محل اور بے معنی ہے۔

ثانیاً:- روحانی و علمی غلبہ یعنی دلیل و برہان کا تفوق ایک ایسی بلندی ہے جو ناقابل زوال ہے۔ پس قیامت کی قید لگانا

خلافِ بلاغت ہے۔ پس نابریں زیادہ موزوں و مناسب یہی ہے کہ اس فوقیت سے مراد سطرتِ ظاہری و سلطنتِ ملکی ہو۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے اطاعت گزار قبل از بعثت تو عیسائی لوگ تھے لیکن بعد از بعثت ان کے اطاعت گزاروں سے مراد مسلمان ہیں اور مسلمانوں کو بہ نسبت کفار کے تفوقِ ملکی کب حاصل ہے؟ بلکہ دیکھنے میں تو کفار کو بدرجہا تفوق و غلبہ حاصل ہے تو اس کا حل یہ ہے کہ اَلَّذِينَ كَفَرُوا سے مراد یہودی ہیں اور اَلَّذِينَ اتَّبَعُوْكَ سے مراد نصاریٰ ہیں اور اگرچہ موجودہ نصاریٰ لوگ حضرت عیسیٰ کے صحیح اطاعت گزار نہیں ہیں لیکن چونکہ ان کے گذشتہ آباء جو بعثت سے پہلے تھے، حضرت عیسیٰ کی مشریت پر صحیح طور پر گامزن تھے اور یہ لوگ ان لوگوں کی اطاعت پر راضی ہیں بلکہ فخر کرتے ہیں۔ لہذا ان کو بھی اس خطاب میں متبعین عیسیٰ سے شمار کر لیا گیا جس طرح قوم یہود کو اپنے آباء کے افعالِ شنیعہ پر راضی ہونے کی وجہ سے موردِ طعن و تشنیع قرار دیا گیا۔ پس آیت مجیدہ میں خوشخبری ہے حضرت عیسیٰ کو کہ ان کے تابعدار جو اپنے تئیں عیسائی کہلانے والے ہوں گے ان کافر لوگوں پر تسلط و اقتدار کے مالک ہوں گے اور ان کا اقتدار تاقیامت رہے گا اور قوم یہود پر معنوی و بتی کا عذاب دائمی رہے گا اور سب سے انسب یہی ہے کہ اس سے مراد زمانِ ظہور حضرت قائم لیا جائے کیونکہ ان کی معیت میں حضرت عیسیٰ بھی دوبارہ اٹھیں گے پس ان کے اطاعت گزاروں کا بول بالا ہوگا اور پوری دنیا پر وہ اقتدار کے مالک ہوں گے واللہ اعلم۔

نَتَلُوْهُ عَلَیْكَ : کتاب سے مراد مطلق وحی اور ذکر سے مراد قرآن اور حکیم یعنی حکم اس کی صفت ہے۔ پس کتاب کے بعد ذکر حکیم تخصیص بعد تعمیم ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی ۲۷۵: اس کے شانِ نزول کے متعلق وارد ہے کہ دند بخران کے دو مستہ آدمی جو ان کے پادری تھے ایک کا نام سید

نصاریٰ بخران کے قول کی استدلالی تردید

اور دوسرے کا نام عاقب تھا۔ وہ حضرت رسالتِ کتب کے پاس آئے اور حضرت عیسیٰ کے متعلق بحث کا آغاز ہوا تو اُن دونوں نے احتجاج کے طور پر یہ بات کہی کہ ہر انسان کے لئے باپ ضروری ہوا کرتا ہے آپ عیسیٰ کے متعلق بتائیں کیونکہ ان کا باپ تو ہے نہیں دگیا وہ حضرت عیسیٰ کی الوہیت ثابت کرنا چاہتے تھے پس یہ آیت اُتری۔

اس بیان سے حضرت عیسیٰ کی الوہیت کی نفی پر دو وسیلیں مستفاد ہوتی ہیں۔

(۱) حضرت عیسیٰ کو خدا نے خلق فرمایا ہے اور جو مخلوق ہو خواہ باپ کے بغیر ہی پیدا ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا۔

(۲) حضرت عیسیٰ کی شانِ خلقت حضرت آدم کی شان سے زیادہ نہیں ہے کیونکہ یہ صرف باپ کے بغیر پیدا ہوئے اور

حضرت آدم بغیر ماں باپ دونوں کے پیدا ہوئے تھے اگر باپ کے بغیر پیدا ہو جانا الوہیت کا موجب ہے تو اس بارہ میں حضرت آدم کو فوقیت حاصل ہے پس اس کو بدرجہ اولیٰ خدا کہنا چاہیے حالانکہ نصرائی اس کی خدائی کے قائل نہیں تو پس انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے متعلق بھی اس غلط رویہ کو ترک کر دیں۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ

تحقیق عیسے کی مثال اللہ کے نزدیک آدم جیسی ہے کہ اس کو بھی پیدا کیا مٹی سے پھر فرمایا اس کو ہو جا

قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٥٩﴾ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿٦٠﴾

پس وہ ہو گیا حق تیرے رب کی طرف سے ہے پس آپ شک کرنے والوں سے نہ بنیں

فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ

پس اگر جھگڑیں وہ اس بارے میں بعد اس کے کہ تیرے پاس علم آچکا ہے تو زما دیجئے اؤ بلا لیں ہم اپنے

أَبْنَاءَنَا وَابْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ

بیٹوں کو اور تم اپنے بیٹوں کو - ہم اپنی عورتوں کو اور تم اپنی عورتوں کو اور ہم اپنے نفسوں کو اور تم اپنے نفسوں کو پھر

نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلُ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ﴿٦١﴾

دُعا مانگیں اور معتذر کریں اللہ کی لعنت جھوٹوں پر

كُنْ فَيَكُونُ : ظاہر بیان کے لحاظ سے درست تو اس طرح ہوتا کہ کہا جاتا كُنْ فَيَكُونُ - لیکن ظاہر اس کو حکایت حال یا ماضی قرار دیکر یكُونُ استعمال کیا گیا ہے مقصد یہ ہے کہ جب بھی کسی شے کی ایجاد کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے ارشاد كُنْ سے شے فَيَكُونُ کی منزل تک پہنچ جاتی ہے پس حضرت آدم کو پیدا کرنے کے لئے بھی اُس نے ارشاد كُنْ کیا اور وہ فَيَكُونُ کی منزل تک پہنچ گیا۔

حضرت آدم کی مثال دے کر حضرت عیسے کی بغیر باپ کی پیدائش کے متعلق نصرائیوں کے شبہ کا حل کرنا مطلوب ہے کہ خالق حکیم کسی شے کی تخلیق میں اسباب و علل اور مواد کا محتاج نہیں اور نہ مرد و زمانہ اور تخیل و وقت کا حاجت مند ہے جس طرح وہ آدم کو تدریجی طریق سے مستثنیٰ قرار دے کر فوریت تکوینیہ سے خلق فرما سکتا ہے ورنہ نبت عیسے کو بھی اس طرح پیدا کرنے پر قادر ہے۔ اور اس نے ایسا ہی کیا ہے پس عیسے اس کا بندہ ہے خدا نہیں۔

جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ : حضرت عیسے کی الوہیت کی نفی کے لئے گذشتہ آیت بیان خداوندی ہونے کے

تفسیر آیت مباہلہ

علاوہ ایک ناقابل تردید برہان ساطع اور دلیل قاطع بھی تھی اسی لئے اس کو دوسری آیت میں علم سے تعبیر فرمایا ہے یعنی اگر وہ آیت نہ بھی ہوتی تب بھی اس کی برہانیت یقین دہانہ کے لئے بذات خود کافی تھی پس مَنْ بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فرمایا اور مَنْ بَعْدَ مَا بَيَّنَّا مَنِينًا نہیں فرمایا۔

جاسکتی تھیں جو دعوت اسلام میں اور دعویٰ عبدیت عیسیٰ میں جناب رسالتا کے ساتھ برابر کے شریک تھے چنانچہ آیت کے اختتام میں صَادِقِیْن جمع کا صیغہ اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ رسول کے ہمراہ جانے والے صَادِقِیْن تھے اگر دعوت نصاریٰ کے علمبردار اور مدعی صرف آپ ہی ہوتے اور ساتھ جانے والے افراد کی حیثیت گواہ کی سی ہوتی تو صَادِقِیْن جمع نہ لایا گیا ہوتا کیونکہ نصاریٰ کی نگاہوں میں اگر معاذ اللہ کا ذبیح تھے تو سب کے سب جانیوالے تھے اور خدا کے علم میں اگر صَادِقِیْن تھے تو بھی سب جانے والے تھے تو معلوم ہوا کہ نصاریٰ کی نظر دل میں بھی یہ سب کے سب دعوت دہندہ اور مدعی عبدیت عیسیٰ تھے اور عند اللہ بھی یہ سارے جناب رسالتا کے شریک کار تھے۔

(۲) اِنْسَاء - نِسَاء اور اَنْفُس - یتیموں صیغے جمع ہیں اور مضاف بھی اور ظاہر ہے کہ جمع مضاف سے استغراق مستفاد ہوا کرتا ہے گویا معنی یہ ہوا کہ اپنے تمام بیٹوں، عورتوں اور نفسوں کو لاؤ۔ لیکن چونکہ لانا صرف انہی کو تھا جو دعوت مذکورہ اور دعویٰ عبدیت عیسیٰ میں شریک رسول تھے تو مقصد یہ ہوا کہ تمام وہ بیٹے وہ عورتیں اور وہ نفس جو اس مدعا میں بحیثیت مدعی کے ہیں بلائے جائیں پس نظر انتخاب رسالت میں اس معیار کے لحاظ سے بیٹوں میں سے سوائے حسین کے کوئی بچہ اس قابل نہ تھا اور عورتوں میں سے سوائے خندومہ کائنات خاتون جنت کے اور کوئی نہ تھی اور مردوں میں سے سوائے علی کے اور کوئی نہ تھا۔

سوال :- رسول کریم کے دیگر جلیل القدر اور اکابر صحابہ جو اس وقت موجود تھے اسی طرح زوجات محترمت بھی سب کے سب مذکورہ دعویٰ اور دعوت میں شریک رسول تھے اور ان کو پورا پورا اطمینان حاصل تھا اور میدانِ مباحلہ میں جانے کے اہل تھے لیکن چونکہ دہاں صرف بطور نمونہ کے مختصر افراد کو لے جانا تھا۔ اس لئے جناب رسالتا نے صرف حسینؑ اور فاطمہؑ اور حضرت علیؑ کے لے جانے پر اکتفا کر لی۔

جواب :- ابتداء، نساء، و انفس کی اضافت جو مفید استغراق ہے نمونہ کے طور پر چند افراد کو ہمراہ لے جانے کے خلاف ہے اور اگر بالفعل استغراق نہ مانا جائے تب بھی جمع ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں اور نمونہ کے لئے بھی لے جانا تھا تو کم از کم اتنے افراد کا انتخاب ہر صفت سے ضروری تھا کہ اقل جمع تو صادقی آسکتی پس اس صورت میں ابتداء کے لئے تین اور نساء کے لئے بھی تین البتہ انفس کے لئے صرف ایک اور بڑھانا پڑتا کیونکہ آپ خود بنفس نفیس مل کر تین ہو جاتے پس اس طرح نہ ہونا صاف بتلاتا ہے کہ اس میدان میں سوائے ان ہستیوں کے جانے کا کوئی دوسرا اہل نہیں تھا؟

(۳) نصاریٰ بخران کی تہمید کے لئے جب قرآن کی پیش کردہ دلیل و برہان کارگر نہ ہوئی تو میدانِ مباحلہ کی تشکیل دیتے ہوئے عترت طاہرہ کو پیغمبر کا ساتھ لے جا کر حق و باطل کے درمیان امتیازی نشان قائم کرنا تا قیامت امت اسلامیہ کے لئے دعوتِ فکر ہے کہ جس طرح نصرانیوں کے مقابلہ میں یہ لوگ رسول کے شریک کار ہیں اور صرف قرآنی اولہ پر اکتفا نہیں کی جاسکتی اسی طرح تا قیامت اہل اسلام کے لئے بھی ان کی قیادت ضروری ہے اور صرف کتاب اللہ سے تسک پکڑ کر ان کو نظر انداز

اور پیچھے سے مسلمان جاتے ہوئے دیکھیں تو ان کے سامنے امامت کا پردہ آجائے اور عصمت مآب بنی پر کسی نامحرم کی نظر نہ پڑ سکے۔ حتیٰ کہ قدموں کے نشان بھی رسالت و امامت کے نقوش پا کے درمیان مستور ہو کر رہ جائیں۔

(۹) میدانِ مباحہ میں اس طرف سے پانچوں بزرگاردوں کا جانا اور مقابلہ میچ نصاریٰ کا جزیہ منظور کرتے ہوئے مباحہ سے ہٹ جانا اس امر کا کاشف ہے کہ پانچ ہستیوں کی صداقت کو وہ ان کی پر اطمینان روش اور بہترین سکون پیش قدمی سے بجانب گئے تھے اور مباحہ کے بعد انہیں یقین تھا کہ اگر ایسا ہوا تو موردِ عذاب ہو جائیں گے۔ پس انہوں نے جزیہ منظور کرنے کے عمل سے ان پانچوں کی صداقت کا اعتراف کر لیا اور قرآن کی آیت نے اس پر حقیقت کی مہر ثبت کر دی۔

(۱۰) اس پورے واقعہ اور قرآنی فرمان میں تدبیر کرنے سے انسان بخوبی و بآسانی اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ان کے مقابلہ میں آنے والے جھوٹے اور مستحیٰ لعنت تھے اور قلعہ کا تعلق اگرچہ صرف ایک واقعہ سے تھا۔ لیکن قرآن کا پورے اہتمام کے ساتھ ان کی صداقت اور ان کے مد مقابل کے جھوٹ کا اعلان کرنا اس امر کا کاشف ہے کہ ان کی صداقت صرف اسی جزیہ واقعہ میں منحصر نہیں تھی اور ان کا دعوتِ اسلام اور دعوائے عبدیت عینے میں جناب رسالت مآب کے ساتھ شریک کار ہونا بھی اسی کا شاہد ہے ورنہ اگر ان میں صداقت کا وجود صرف اسی دن کے لئے ہوتا تو یقیناً ان کا انتخاب اس قسم کے اہم مقابلہ کے لئے ناموزوں ہوتا۔ پس معلوم ہوا کہ یہ واقعہ صرف ان کی صداقت کے اعلان کا بہانہ تھا۔ ورنہ تمام صحابہ رسالت مآب میں سے کوئی آدمی ایسا موجود نہ تھا جو اس فضیلت میں ان کے ہم پلہ ہو سکتا اور اگر ایسا ہوتا تو آپ اس انتخاب میں یقیناً اس کو نظر انداز نہ فرماتے اس لئے کہ آیت کے الفاظ ابتداء، تسامد اور انفس کے جمع اور استغراق کے وسیع الذلیل الفاظ زیادہ سے زیادہ قابلِ انتخاب افراد کو اپنے دامن میں جگہ دینے کو تیار تھے اور جناب رسالت مآب کی نظر انتخاب میں بھی ٹھنک نہ تھا بلکہ وہ خلقِ عظیم کا مالک رسولِ کشادہ رُوئی سے ساتھ لانے کو تیار ہو جاتا۔ بشرطیکہ کوئی اور امر آنے کی صلاحیت رکھتا یا پس ثابت ہوا کہ اس معیار پر پورے اترنے والے صرف یہی تھے جن کو لے جایا گیا تو اس واقعہ میں ان کا انتخاب اور چننا اور ان کے مقابل والوں کو جھوٹے کی سند کا ملنا تاقیامت ایک دستور العمل ہے کہ جب بھی یہ لوگ کسی میدان میں پہنچیں اور حق و باطل میں امتیاز مشکل ہو جاوے تو معیار یہی ہے کہ جس طرف یہ لوگ گئے صداقت اور حق اسی جانب ہو گا اور ان کی مقابل جماعت کاذب و باطل پرست ہوگی۔

(۱۱) چونکہ حسنین شریفینؑ باوجود کم سنی کے مباحہ کے پروگرام میں شامل اور خداوند کریم کی جانب سے مدعو تھے۔ لہذا یہ آیت ان کے کمال عقل پر نص قطعی ہے کیونکہ ایسے پروگراموں میں ناقص العقل کی شرکت یقیناً ناموزوں ہے اور جناب تولیٰ معظمہ کی شہریت اور ان کا مدعو ہونا بھی ان کے کمال عقل کی برہان قطعی ہے یعنی جس طرح بچپنہ حسنینؑ کے کمال عقل سے مانع نہیں اسی طرح نسوانیت جناب زہراؑ کے کمال میں غل نہیں اور یہی اس خالوادہ عصمت کا امت کے عام مردوں اور عورتوں سے امتیازی نشان ہے

بتابہ مشہور ۲۴ ذوالحجہ ۱۱۰۰ھ کو بعد از فتح مکہ یہ واقعہ پیش آیا کہ ان کے اپنے اطراف میں دعوتِ اسلام کے خطوط بھیجے چنانچہ ایک خط نصاریٰ بخران کو بھی

واقعہ مباحہ کے متعلق روایات

لکھا پس تحقیق کے لئے ان کا وفد مدینہ میں آیا اور انہوں نے پہلے مناظرہ کیا اور بعد میں مباہلہ کا فیصلہ ہوا۔
 ۱۱۔ بروایت تفسیر قمی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ نصاریٰ بخران کا وفد جب جناب رسالت کے پاس پہنچا تو ان کے سردار تین شخص تھے۔ اہتم، عاقب اور سید۔ جب ان کی نماز کا وقت آیا تو انہوں نے ناقوس بجائے اور پھر نماز ادا کی۔ صحابہ کرام کو مسجد رسول میں ان کا یہ فعل ناگوار گزرا اور بارگاہ رسالت میں دینی زبان سے عرض بھی کی۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ رہنے دیجئے۔ جب وہ فارغ ہو چکے تو آپ کے قریب آکر کہنے لگے۔ آپ کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ فرمایا: اللہ کی توحید اور اپنی رسالت کی طرف اور یہ کہ حضرت عیسیٰ عبد خدا اور مخلوق خدا تھے، کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے تھے۔ انہوں نے کہا۔ اگر یہ صحیح ہے تو فرمائیے ان کا باپ کون تھا؟ پس وحی نازل ہوئی کہ ان سے سوال کیجئے۔ تمہارا آدم کے متعلق کیا خیال ہے کیا وہ عبد خدا تھا۔ کھاتا پیتا تھا اور نکاح وغیرہ کا محتاج تھا؟ تو آپ نے ان سے یہی سوالات کئے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں! آپ نے فرمایا کہ بتائیے۔ اس کا باپ کون تھا؟ پس وہ شرمسار ہو کر لا جواب ہو گئے۔ چنانچہ ان مَثَلِ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہ سے لے کر آیت مباہلہ کے آخر تک یہ آیتیں اُٹریں۔ پس آپ نے فرمایا کہ تم میرے ساتھ مباہلہ کر لو۔ اگر میں سچا ہوں گا تو تم پر خدا کی لعنت اور عذاب نازل ہوگا اور اگر تم سچے ہو گے تو مجھ پر خدا کی لعنت نازل ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ واقعی یہ منصفانہ فیصلہ اور مباہلہ کا وعدہ کر کے چلے گئے تو ان کے رؤسا سید۔ عاقب اور اہتم نے کہا کہ اگر وہ مباہلہ کرنے کے لئے اپنی قوم کو لائے۔ تو ہم مباہلہ کریں گے کیونکہ وہ نبی نہ ہوگا اور اگر وہ اپنی اہلیت کو ہمراہ لا کر مباہلہ کرے گا تو ہم مباہلہ نہ کریں گے کیونکہ اس کا اپنی اہلیت کو ساتھ لانا اس کی صداقت کی دلیل ہے جب صبح ہوئی تو آپ نے حضرت امیر المومنین اور جناب فاطمہ اور حسن اور حسین علیہم السلام کو ساتھ لیا۔ نصاریٰ نے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ تو ان کو جواب دیا گیا کہ ایک اس کا چچا زاد وصی اور داماد علی بن ابی طالب ہے اور ایک اس شہزادی جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا ہے اور دو بیٹے حسن اور حسین علیہما السلام ہیں پس یہ تین کو باہلہ رسالت میں عرض گزار ہوئے۔ یا رسول اللہ! ہم آپ کی مرضی کے تابع ہیں۔ ہمیں مباہلہ سے معافی دیجئے پس آپ نے جزیہ پر ان سے صلح کر لی اور وہ چلے گئے۔

۱۲۔ عیوان الاخبار سے منقول ہے کہ حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ہارون نے دریافت کیا تھا کہ تم کیسے ذریت پیغمبر کہلاتے ہو حالانکہ ہمارے پیغمبر کی نسل نہیں ہے کیونکہ نسل بیٹوں سے ہوا کرتی ہے نہ کہ بیٹیوں سے اور تم بیٹی کی اولاد ہو؟ آپ نے فرمایا کہ میں تجھے قرابت اور قبر رسول اور صاحب قبر کا واسطہ دے کر اس سوال کے جواب سے معافی چاہتا ہوں۔ تو ہارون نے جواب دیا کہ مجھے جہانک خبر پہنچی ہے آپ اولاد علی میں سردار اور ان کے امام وقت ہیں لہذا میرے ساتھ اس مسئلہ میں دلیل دبر بان سے بات فرمائیے اور میں جو کچھ آپ سے دریافت کر رہا ہوں۔ اس کی ہرگز معافی نہ دوں گا۔ جب تک آپ قرآن مجید سے اپنے دعویٰ کا ثبوت نہ دیں اور اسے اولاد علی نہ تمہارا تو یہ دعویٰ ہے کہ قرآن کی کوئی چیز تم سے پوشیدہ نہیں ہے اور اس کا کوئی حرف نہیں جس کی تاویل تمہارے پاس نہ ہو اور تم اس کے احتجاج میں پیش کرتے ہو۔ مَا قَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ

شئی اور دیگر تمام علماء کے قیاسات اور خیالات سے تم استغنا ظاہر کرتے ہو،
آپ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا: اچھا مجھے اجازت دیجئے تاکہ کچھ کہوں۔ ہارون نے کہا: اجازت ہے بیان کیجئے۔
فرماتے ہیں کہ میں نے پڑھا۔

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے:-

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدُ وَسُلَيْمَانُ وَأَيُّوبُ وَيُوسُفُ وَمُوسَى وَهَارُونُ وَكَذَٰلِكَ يَجْزِي
الْمُحْسِنِينَ ۝ وَنُوحًا نَحْنُ يُحْسِنِي ۝ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيُحْيَىٰ
وَالْيَاسِينَ ۝

اور اس کی ذریت سے داؤد، سلیمان اور ایوب
یوسف موسیٰ اور ہارون ہیں۔ اور ہم احسان کرنے
والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ اور نوحؑ اور یحییٰؑ اور عیسیٰؑ
اور الیاسؑ دہبی ان کی ذریت سے تھے الخ

پس میں نے دریافت کیا بتائیے۔ حضرت عیسیٰ کے باپ کون تھے۔ ہارون نے جواب دیا: کہ عیسیٰ کا باپ نہیں
تھا۔ پس میں نے کہا: کہ خدا نے حضرت عیسیٰ کو ماں کی وجہ سے ذریت انبیاء میں داخل فرمایا اور اسی طرح ہمیں بھی ماں
کے ذریعے سے ذریت پیغمبر قرار دیا۔

پھر میں نے کہا: کچھ اور بھی کہو؟ اُس نے کہا: کہ ہاں! پس میں نے آیت مباہلہ تلاوت کی اور کہا کہ کوئی نہیں کہہ سکتا
کہ جناب رسالتؐ نے نصاریٰ کے مباہلہ کے دن علی ابن ابی طالبؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے علاوہ کسی اور کو بھی
دعوت دی ہو اور آیت میں ابناءنا سے مراد حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔ ابناءنا سے مراد جناب فاطمہؑ ہیں اور اَنْفُسَنَا
سے مراد جناب علی ابن ابی طالبؑ ہیں۔

۳، امام علی رضا علیہ السلام سے مامون نے جو سوالات کئے تھے من جملہ اُن کے ایک یہ بھی تھا۔ کہ مامون نے دریافت
کیا کہ آپ کے جد پاک حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ کی خلافت پر دلیل کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: آیت
اَنْفُسَنَا۔ مامون نے کہا: ٹھیک ہے بشرطیکہ ابناءنا کا لفظ نہ ہو، آپ نے فرمایا: ہاں اگر ابناءنا نہ ہو۔ روایت
کے الفاظ یہ ہیں: ما الدلیل علی خلافتہ جدک علی بن ابی طالب؟ قال آیتہ اَنْفُسَنَا قال لولا ابناءنا
قال لولا ابناءنا۔

اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ جب مامون نے حضرت علیؑ کی خلافت کی دلیل طلب کی تو آپ نے فرمایا کہ اَنْفُسَنَا
کی آیت یعنی آیت مباہلہ۔ کیونکہ اس آیت میں علیؑ کو نفس رسولؐ کہا گیا ہے اور علیؑ کا نفس رسولؐ ہونا مستحق خلافت کے
لئے کافی ہے کیونکہ جن پر رسولؐ کو افضلیت حاصل ہے ان پر نفس رسولؐ کو بھی افضلیت حاصل ہوگی اور شیئی اور نفس شیئی
کا حکم ایک ہی ہوا کرتا ہے اس پر مامون نے اعتراض کیا کہ لولا ابناءنا یعنی اَنْفُسَنَا سے حضرت علیؑ کا نفس رسولؐ

ہونا ثابت نہیں۔ کیونکہ یہاں انفس سے مراد مطلق مرد ہیں اور حضرت علیؑ ان میں ایک فرد ہے اور اس پر قرینہ یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں خدا نے نساءؑ کا ذکر فرمایا ہے اور اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انفس سے مراد مرد ہیں۔ ہاں اگر نساءؑ کی لفظ نہ ہوتی تو علیؑ کا انفس رسولؐ ہونا اس آیت سے سمجھا جاسکتا تھا۔ آپؐ نے اس کی ترویج میں فرمایا کُذِّلَا اَبْنَاءَنَا یعنی اگر نساءؑ کے قرینہ سے اَنْفُسَنَا کا معنی مطلق مرد ہوتا تو اَبْنَاءَنَا کیوں ذکر کیا گیا یہ بھی تو مردوں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ یا یوں کہتے کہ نساءؑ کے مقابلہ میں اگر اَبْنَاءَنَا کا ذکر نہ ہوتا تو نساءؑ سے مراد عورتیں اور ان کے مقابلہ میں انفس سے مراد مرد لائے جاسکتے تھے لیکن جب ان کا مقابلہ اَبْنَاء سے ہو تو باصطلاح قرآن نساءؑ سے مراد لڑکیاں ہو جایا کرتی ہیں لہذا انفس اپنے معنی حقیقی پر رہتے ہوئے حضرت علیؑ کے فضیلت مذکورہ کے اثبات کا موجب ہو جائے گا۔

اور ممکن ہے کہ مراد یہ ہو۔ کہ حضرت امام رضا علیہ السلام نے چونکہ اَنْفُسَنَا سے حضرت علیؑ کا انفس رسولؐ ہونا ثابت کر کے ان کا استحقاق خلافت بیان فرمایا۔ تو امون نے اعتراض کیا کہ حضرت علیؑ کو انفس رسولؐ کہنے میں ایک خرابی لازم آتی ہے اور وہ یہ کہ خاتونِ جنت حضرت علیؑ کی زوجہ ہے اور رسولؐ کی دختر ہے پس علیؑ انفس رسولؐ کیسے ہو سکتے تھے جبکہ وہ رسولؐ کی شہزادی کے شوہر ہیں تو آپؐ نے اس کے اس شبہ کا جواب اس طرح دیا کہ حسین شریفینؑ کو جب خدا نے رسولؐ کے بیٹے قرار دیا تو علیؑ انفس رسولؐ ثابت ہوئے کیوں کہ علیؑ کے بیٹوں کو خدا رسولؐ کے بیٹے فرما رہا ہے۔ گویا معنوی طور پر حضرت علیؑ کا انفس رسولؐ ہونا ظاہری رشتہ سے مانع نہیں ہو سکتا۔

(۴) اہلسنت کی تفسیر ثعلبی سے منقول ہے کہ حضرت رسالتؐ نے جب قوم نصاریٰ کو مباہلہ کی دعوت دی تو نصاریٰ نے کہا۔ کہ ہم سوچ کر جواب دیں گے جب علیؑہ مجلس مشاورت قائم ہوئی تو انہوں نے بل جمل کر عاقب سے کہا۔ جو ان کا مہارائے تھا۔ عبد السبع (یہ اس کا لقب ہے) تیرا کیا مشورہ ہے؟ اُس نے جواب دیا۔ اے نصرانیو! خدا کی قسم تمہیں معلوم تو ہے ہی کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ نبی مرسل ہے اور اللہ کی جانب سے بھیجا ہوا ہے اور خدا کی قسم کبھی کسی قوم نے کسی نبی سے مباہلہ کی جرات نہیں کی مگر یہ کہ اس کا پوری طرح ستیاناس ہو گیا۔ ان کے چھوٹے بڑے سب فنا ہو گئے اگر تم ایسا کر دو گے تو یقیناً ہم سب تباہ ہو جائیں گے۔ ہاں اگر تم اپنے مذہب کے غیر خواہ ہو اور اسی دین پر رہنے کے متمنی ہو تو چپ چاپ واپس جانے میں اپنی خیر سمجھو؟

پس جب صبح ہوئی تو جناب رسالتؐ نے حسین کو گود میں لیا اور حسن کا ہاتھ پکڑا اور جناب فاطمہ ان کے پیچھے روانہ ہوئیں اور حضرت علیؑ جناب فاطمہ کے پیچھے تھے اور آپؐ ان کو فرما رہے تھے کہ دیکھنا جب میں دعا مانگوں تو تم سب آمین کہنا۔ بخران کے اسقف (پادری) نے نصاریٰ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں۔ اگر وہ اللہ سے سوال کریں کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو ہٹ جائے گا۔ پس ان لوگوں سے مباہلہ نہ کرو۔ ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ اور قیامت تک زمین پر کوئی نصرانی باقی نہ رہے گا۔ پس انہوں نے یہ بات مانتے ہوئے بارگاہ رسالت میں عرض کی کہ ہماری

رہے یہ ہے کہ ہم مباہلہ چھوڑ دیں۔ آپ اپنے دین پر رہیں اور ہم اپنے دین پر رہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم مباہلہ سے انکار کرتے ہو تو پھر تمہیں اسلام قبول کرنا چاہیے۔ پس مسلمانوں کے ساتھ تم نفع اور نقصان میں شریک ہو جاؤ گے تو انہوں نے اس بات سے انکار کیا۔ آپ نے فرمایا کہ پھر جہاد کی دعوت دیتا ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم آپ کے ساتھ لڑنے کی جرات نہیں کرتے۔ البتہ ہم آپ سے مصالحت کے خواہشمند ہیں جس کی شرائط یہ ہوں گی (۱) آپ ہمیں نہ چھیڑیں گے (۲) ہمیں خوفزدہ بھی نہ کیا جائے گا بلکہ پُر امن زندگی گزارنے کی سہولت بھی دی جائے گی۔ (۳) ہمیں اپنے دین کے چھوڑنے پر مجبور نہ کیا جائے گا۔ (۴) ہم ہر سال ۲ ہزار لباس ایک ہزار ماہ صفر میں اور ایک ہزار رجب میں اور تین زرعہ لوسہ کی ادا کرتے رہیں گے۔ پس آپ نے منظور فرمایا اور فرمایا کہ مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تحقیق موت اہل بخران پر اپنے پر کھول چکی تھی اور اگر وہ مباہلہ کرتے تو بندر اور سور کی شکل میں مسخ ہو جاتے اور پوری دادی اُن کے لئے آگ سے بھرک اٹھتی اور خدا بخران اور اہل بخران کو تباہ کر دیتا یہاں تک کہ درختوں پر پرندے بھی زندہ نہ رہ سکتے اور ایک سال کے اندر اندر تمام روئے زمین کے نصرانی لقمہ اجل ہو جاتے۔

نوٹ :- اس روایت میں جزیہ کی شرائط میں ہے کہ دو ہزار لباس سالانہ ادا کریں گے ایک ہزار ماہ صفر میں اور ایک ہزار ماہ رجب میں۔ لیکن یہاں صفر سے مراد ماہ محرم ہے کیونکہ عرب رگ ماہ محرم کو صفر اول اور ماہ صفر کو صفر ثانی کہا کرتے تھے جب اسلام نے صفر اول کے مہینے کو بھی حرمت والے مہینوں میں شمار کر دیا تو اس کا نام شہر اللہ المحرم پڑ گیا اور آہستہ آہستہ شہر اللہ کا لفظ بھی کٹ گیا اور صرف محرم مشہور ہو گیا۔

(۵) تفسیر درمنثور سے مروی ہے کہ جناب رسالت نے اہل بخران کو دعوت نامہ لکھا کہ میں تم لوگوں کو اللہ کی عبادت اور اُسی کی ولایت کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اگر انکار کرو گے تو تمہیں جزیہ ادا کرنا پڑے گا۔ ورنہ ہم تمہارے ساتھ جہاد کریں گے جب خط وہاں پہنچا اور وہاں کے اسقف نے خط پڑھا تو بہت گھبرایا اور خوفزدہ ہوا اور اہل بخران کے ایک شخص شرجیل بن دواع کو بلا بھیجا اور اس کو یہ خط پڑھنے کے لئے دیا جب وہ خط پڑھ چکا تو اسقف نے اُس سے اس بارہ میں مشورہ طلب کیا۔ شرجیل نے جواب دیا کہ تجھے معلوم ہے کہ خداوند کریم نے ابراہیم کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ ذریت اسمعیل میں نبوت کو قرار دوں گا تو ممکن ہے یہ وہی شخص ہو۔ بہر کیف مجھے نبوت کے معاملہ میں دخل اندازی کی مجال نہیں البتہ کوئی دنیا داری کا مشورہ ہوتا تو اپنی رائے ظاہر کر سکتا اور تجھے کوئی صحیح نقطہ یہ قائم کر کے مطلع کرتا۔ اس کے بعد اسقف نے اہل بخران کے ہر شخص کو یہ خط پڑھا کہ اُن سے فردا فردا رائے طلب کی اور ہر ایک نے وہی جواب دیا جو شرجیل نے دیا تھا۔ اس کے بعد تمام کی رائے اس بات پر جم گئی کہ شرجیل بن دواع اور عبد اللہ بن شرجیل اور جبار بن فیض کو معلومات حاصل کرنے کے لئے مدینہ روانہ کیا جائے اور اس کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے۔

پس یہ وفد مدینہ پہنچا حضرت عیسیٰ کے متعلق بات چیت ہوئی جب انہوں نے بغیر باپ کے پیدا ہونے کا سوال کیا

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ

فرا دیجئے کہ اے اہل کتاب آؤ طرف ایسی بات کے جو یکساں طور پر (قابل قبول ہے) ہمارے اور تمہارے درمیان یہ کہ کسی کی عبادت

إِلَّا اللَّهُ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا

نہ کریں سوائے خدا کے اور نہ شریک کریں اس کے ساتھ کوئی چیز اور نہ پکڑے ہمارا بعض بعض کو اپنا رب

مِّنْ دُونِ اللَّهِ ۖ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿۱۴۳﴾

بغیر اللہ کے پس اگر نہ مانیں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو۔ کہ ہم مسلمان ہیں

تو آپ نے فرمایا کہ میں کلی جواب دوں گا چنانچہ اسی رات کو یہی آیات اِنْ مَّشَىٰ عِيسَىٰ سے لے کر آخر تک نازل ہوئیں بالآخر جب ماباہ تک نوبت پہنچی اور صبح کو جناب رسالتؐ صبح ساتھیوں کے میدان ماباہ میں پہنچے تو شریحیل نے ساتھیوں سے کہا کہ ان سے ماباہ ہماری ہلاکت کا موجب ہو گا چونکہ اس کو اپنے ساتھیوں نے اپنی طرف سے کلی اختیار دے دیا تھا پس شریحیل نے جزیہ دینا منظور کر کے آپ سے مصالحت کر لی۔

بہر کیف نصاریٰ کے وفد کے ناموں میں اختلاف ہے لیکن تمام مفسرین کو اس بات پر پورا اتفاق ہے کہ جناب رسالتؐ کے ہمراہ سوائے علی وبتول وحنین علیہم السلام کے اور کوئی نہ تھا اور اس روایت کو شیعہ سنی مفسرین نے متفقہ طور پر لکھا ہے اور ابن طاووس فرماتے ہیں کہ میں نے روایت ماباہ کو اکاون صحابہ و تابعین سے نقل کیا ہے کہ مصداق آیت حضرت علی و فاطمہ و حسن و حسین ہیں۔ اور جو لوگ اس قسم کی متواترات سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے پاس سوائے عناد و حسد و بغض و کینہ کے اور کچھ نہیں اور خدا خود ہی ان سے حساب لینے کے لئے کافی ہے۔

رکوع ۱۵۷

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ :- اس آیت میں یہود و نصاریٰ ہر دو کو دعوت اسلام دی گئی ہے پہلے پہل ان کو کلمہ توحید لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کے اقرار کی دعوت دی گئی اور اس کے بعد صرف زبانی اقرار کو ناکافی قرار دیتے ہوئے ان کو عملی طور پر شرک سے منع کیا گیا۔ کیونکہ یہودی عزیر کو اور نصرانی مسیح کو اللہ کا بیٹا قرار دے کر شرک کے مرتکب تھے۔ اعتقاد اور عبادت کی اصلاح کے بعد دوسرے معاملات میں ان کو اپنے اجار (طاؤں) کی رتبہ سے باز رہنے کی دعوت دی۔ مروی ہے کہ جب یہ آیت اُتری کہ اپنے اجار و رہبان کو انہوں نے اپنا رب مان لیا ہے تو عدی بن حاتم نے عرض کی۔ یا رسول اللہ! ہم ان کی عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا جس چیز کو وہ لوگ تمہارے اوپر حلال حرام کر دیتے تھے

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنْزِلَتِ التَّوْرَةُ

اے اہل کتاب تم کیوں جھگڑتے ہو ابراہیم کے بارے میں حالانکہ نہیں انجیل تورات

وَالْإِنْجِيلُ الْإِمْنِ بَعْدَ هَٰذَا أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۲۵﴾ هَٰ أَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ حَاجُّوهُ

دائجیل مگر اُس کے بعد کیا تم نہیں سوچتے دیکھئے تم نے ایسی بات میں جھگڑا کیا ہے

فِي مَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِي مَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ

جس کا تمہیں علم تھا پھر ایسی بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تم کو علم ہی نہیں؟

وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۲۶﴾

اور خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے

کیا تم اس کی اطاعت نہیں کرتے تھے؟ اس نے کہا۔ بے شک ایسا ہی تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ ان کی ربوبیت سے یہی تو مراد ہے۔ ربط۔ خداوند کریم نے اہل کتاب کو دعوت اسلام منانے کیلئے کیا خوب طریقہ استعمال فرمایا۔ پہلے پہل تو حضرت مریمؑ کی ولادت کا قصہ۔ پھر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا واقعہ اس انداز سے پیش کیا کہ منصف مزاج خود بخود اس کی الوہیت کے قول سے دست بردار ہو جائیں کیونکہ ولادت کے یہ ادوار و اطوار ان الوہیت کے سراسر منافی ہیں لیکن اگر ان کو تسلی نہ ہو تو پھر استدلالی طور پر حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کی تردید فرمائی اور حضرت آدمؑ کی خلقت سے تشبیہ دے کر ان کے جملہ اعتراضات کا قطع قمع فرمایا۔

بعد ازاں انتہائی کند ذہن طبقہ کی تسلی و اطمینان کے لئے مباہلہ کی دعوت دی جب ان تمام باتوں سے ان کے منصف مزاج گروہ کی ذہنی خلش کسی حد تک دور ہو گئی تو ان کو ضد اور ہٹ دھرمی سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہوئے نہایت پیار و محبت کے لہجہ میں ان کے سامنے ایک قابل قبول اور قرین عقل دستور العمل پیش فرمایا کہ عبادت صرف اللہ کی ہونی چاہیے اور غیر اللہ کو اس کے ساتھ قطعاً شریک نہیں ماننا چاہیے اور اس بارہ میں ملا اور پادری لوگوں کی دجل فریبی سے بچتے ہوئے ان کی اندھی تقلید سے گریز کر کے صرف اللہ کی ربوبیت کو دل میں بٹھالینا چاہیے بعض مورخین نے ذکر کیا ہے کہ سترھویں جہاں رسالتابؐ نے قیصر کسری اور نجاشی کو بذریعہ وفود اسی مضمون کے دعوت نامے ارسال فرمائے تھے (میزان)

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ رَكَتَيْ يَوْمَ الْيَوْمِ لَمْ يَكُنْ فِيكُمْ شَيْءٌ مِّنْ ذَلِكَ وَلَكِن مَّا كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۷﴾ هَٰ أَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ حَاجُّوهُ فِي مَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِي مَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۲۸﴾

اس صورت میں ابراہیمؑ کو یہودیت یا نصرانیت میں داخل ماننا بے عقلی و بے وقوفی ہی ہے اور درمنثور میں ابن عباس سے مروی ہے کہ نصاریٰ بخیران اور احبار یہود کے درمیان اسی موضوع پر بارگاہ رسالت میں بحث ہوئی۔ تو آپؐ نے یہی جواب دے کر ان کو ساکت کیا۔

ہَا أَنتُمْ - اس آیت مجیدہ کے کئی معانی بیان کئے گئے ہیں۔

۱) تم نے ایسی چیز میں جھگڑا کیا ہے جس کے متعلق کچھ نہ کچھ تمہیں علم ہے اور وہ ہے ان کی نبوت و رسالت کا علم، اب اس کے متعلق ایسی بحث کا آپس میں تم کیوں آغاز کرتے ہو جس سے تم قطعاً بے خبر ہو اور وہ ہے اس کی یہودیت یا نصرانیت کا فیصلہ۔

۲) تعامل تم نے ایسی بات میں نزاع کیا جس کا کسی حد تک تمہیں علم تھا اور وہ ہے حضرت عیسیٰؑ کا معاملہ۔ اب تمہیں ایسی بات میں الجھنے کی کیا ضرورت ہے جس کا تمہیں قطعاً علم ہی نہیں اور وہ ہے حضرت ابراہیمؑ کی یہودیت یا نصرانیت۔

۳) اے گروہ یہود و نصاریٰ تم نے آپس میں پہلے تو اس بات میں مناظرہ کیا جس کا تم کو علم تھا اور وہ تھا یہودیوں کی طرف سے نصرا نیوں کے مقابلہ میں حضرت عیسیٰؑ کی ابن اللہ ہونے کی نفی اور نصرا نیوں کی طرف سے یہودیوں کے مقابلہ میں حضرت عیسیٰؑ کی نبوت و بعثت کا اثبات۔ پس اب تم ایسی بات میں ایک دوسرے کے دست و گریباں کیوں ہو رہے ہو جس کے علم سے دونوں گروہ غاری ہو اور وہ ہے حضرت ابراہیمؑ کی یہودیت یا نصرانیت کا ثبوت۔

۴) اے گروہ یہود و نصاریٰ پہلے تو تم ہمارے ساتھ ایسی چیز میں ازراہ عناد جھگڑتے تھے جس کا تمہیں علم تھا اور وہ ہے جناب رسالتؐ کی توہرات و انجیل میں بیان شدہ صفات و علامات۔ اب تم ایسی بات میں جھگڑنے لگے ہو جس کا تمہیں علم ہی نہیں۔ حالانکہ خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

مفسرین نے اپنے اپنے ذوق کے ماتحت بعض اقوال کو ترجیح دی ہے۔

مَا كَانَ إِبْرَاهِيمَ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ

نہ حضرت ابراہیمؑ یہودی اور نہ نصرانی تھے بلکہ وہ تو سچے مسلمان تھے اور نہ وہ

مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۶۵ إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَذَا النَّبِيُّ

مشرک تھے تحقیق قریب ترین لوگوں میں سے ابراہیم کے ساتھ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ ۶۶ وَدَّتْ طَافِيفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ

اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اللہ ولی ہے ایمان والوں کا چاہا ایک گروہ نے اہل کتاب سے کہ تمہیں گمراہ کر دیں۔

لَوْ يُضِلُّوكُمْ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۶۷ يَا أَهْلَ

کتاب! اگر وہ تمہیں گمراہ کرتے مگر اپنے نفسوں کو اور سمجھتے نہیں اے اہل

الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ ۶۸ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ

کتاب تم کیوں کفر کرتے ہو آیات خدا کا حالانکہ تم گواہ ہو؟ اے اہل کتاب

لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۶۹

کیوں ملوث کرتے ہو حق کی ساتھ باطل کے اور حق کو چھپاتے ہو جانتے ہوئے؟

مَا كَانَ إِبْرَاهِيمَ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ

پہلے گزر جانے کی وجہ سے جب حضرت ابراہیمؑ کو یہودیت یا نصرانیت کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا تو انہیں مسلمان کیونکر کہا جاسکتا ہے جبکہ وہ جناب رسالتؐ سے تقریباً اڑھائی ہزار برس پہلے تھے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دین اسلام جو

ایک فطری اور اللہ کا پسندیدہ دین ہے حضرت ابراہیمؑ اسی دین پر تھے۔ تو رات اپنے وقتی مصالح کے لحاظ سے اسی دین کے کمال کا کورس تھی اور انجیل بھی اپنے زمانہ کے مقتضیات کے پیش نظر اسی فطری دین کے کمال کا پروگرام لے کر آئی پس یہ دونو

دین اسی اصل دین اسلام کے کمال کے شعبے تھے اور شریعت قرآنیہ بھی اسی اصل دین اسلام کے کمال و عروج کا نصاب ہے لہذا حضرت ابراہیمؑ کو مسلمان کہنا اسی اصل کے لحاظ سے ہے نہ کہ فرعی اعتبار سے کیونکہ فرع کو اصل سے منسوب کیا جاتا ہے اور اصل کو فرع

سے منسوب نہیں کیا جاتا اور بعض فرعی احکام کا نسخ اس کی تصدیق کے منافی نہیں ہوتا کیونکہ منسوخ احکام اپنے وقت میں بجائے اور

ناسخ احکام اپنے وقت میں موزوں ہیں پس دونوں اپنے اپنے وقت میں درست اور واجب العمل ہیں۔ حَنِيفًا مُّسْلِمًا۔ کہتے ہیں کہ جس طرح

وَقَالَتْ طَافَتْهُ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ امْنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجِ

کہا گروہ اہل کتاب نے ایمان لاؤ اس پر جو انزل ہوئی اُن لوگوں پر جو ایمان لائے دن کے پہلے سبتہ میں اور

النَّهَارِ وَكُفُّوا اٰخِرًا لَّعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَلَا تَوَعُّمُوا الْاِلٰهَیْنَ تَبِعَ

کفر کردہ آخری حصہ میں تاکہ وہ پھر جائیں اور نہ مانو مگر اس کی جو تمہارے دین کی اتباع کرتا ہو

دِیْنُکُمْ قُلْ اِنَّ الْهُدٰی هُدٰی اللّٰهِ اَنْ یُّوْتٰی اَحَدٌ مِّثْلَ مَا اُوْتِیْتُمْ اَوْ

فرما دیجئے تحقیق ہدایت وہی ہے جو اللہ ہدایت کرے کہ دیا جائے کسی کو مثل اس کے جو تمہیں دیا گیا یا یہ کہ

یَحَاجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّکُمْ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بَیْدُ اللّٰهِ یُوْتِیْهِ مَنۢ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ

وہ حاجت قائم کریں تم پر اللہ کے ہاں فراہم کیجئے تحقیق فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور خدا وسعت د

عَلِیْمٌ ﴿۶۸﴾ یَخْصُصُ بِرَحْمَتِهٖ مَنۢ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۶۹﴾

علم والا ہے مخصوص فرماتا ہے اپنی رحمت سے جسے چاہتا ہے اور اللہ فضل عظیم کا مالک ہے

یہودی اور نصرانی حضرت ابراہیمؑ کو اپنی اپنی طرف منسوب کرتے تھے اسی طرح مشرکین عرب بھی دعویٰ کرتے تھے کہ دین حنیف اور ملت ابراہیمؑ ہم میں چنانچہ اہل کتاب ان کو حقایقینی ملت حنیفیہ پر چلنے والے کہتے تھے اور حنیفیت و تنبیہ مراد لیتے تھے تو خداوند کیم نے جہاں حضرت ابراہیمؑ کی یہودیت اور نصرانیت کی تردید فرمائی ساتھ ساتھ مشرکین عرب کے قول کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ حنیف تھے یعنی تمام ادیان باطلہ اور مل فاسدہ سے کنارہ کش اور صراط حق پر گامزن تھے لیکن وہ مشرک کرنے والے نہیں تھے بلکہ بچے مسلمان تھے۔

وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا: تفسیر صافی میں کافی وعیاشی سے مروی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا اس سے مراد اللہ اور ان کی اطاعت کرنے والے ہیں نیز اپنے عمر بن یزید سے فرمایا کہ خدا کی قسم تم لوگ آل محمدؐ سے ہو وہ کہتا ہے میں نے عرض کی قربان جاؤں کیا ہم نفس آل محمدؐ سے ہیں؟ تو آپ نے تین بار فرمایا ہاں۔ اللہ کی قسم تم لوگ آل محمدؐ سے ہی ہو پس آپ نے مجھے دیکھا اور میں نے اُن کی طرف نگاہ کی تو فرمانے لگے اے عمر! اللہ فرماتا ہے اِنَّ اَوْلٰی النَّاسِ لَیَالِی تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا انبیاء کے قریب ترین وہ لوگ ہوا کرتے ہیں جو اُن کی شریعت کے احکام پر عمل پیرا ہوں پھر آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا کہ جناب رسالت کا دوست اور قریبی وہی شخص ہے جو اللہ کا فرمانبردار ہو خواہ رشتہ میں آپ سے کتنا ہی دور ہو اور اُن کا دشمن وہ شخص ہے جو اللہ کا نافرمان ہو خواہ اس کو رشتہ میں آپ سے کتنا ہی قرب حاصل ہو۔

قَالَتْ طَافَتْهُ: یہ تجویز ان کی چالاکی اور فریب کاری تھی جس کا خدا نے پردہ چاک کر دیا ان کا مطلب یہ تھا کہ
رکوع ۱۶ مسلمان یہ سمجھیں گے کہ آخر کوئی نقص اور عیب اس دین میں ضرور ہے کہ یہودی لوگ ایمان لا کر پھر دوبارہ کافر ہو گئے

لہذا وہ دین اسلام سے شک و شبہ کی بناء پر برگشتہ ہو جائیں گے۔
وَلَا تُؤْمِنُوا: اس آیت کے کئی معانی کئے گئے ہیں

(۱) یہ کلام یہود ہے اور قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هٰذِہِ الْاِیْمٰنُ۔ درمیان میں جملہ معترضہ خطاب خداوندی ہے اور اَنْ یُّؤْتٰی تَمَتُّہٗ کلام یہود ہے معنی یہ ہوگا۔ اے گروہ یہود تم کسی کے متعلق یہ بات نہ گزرو کہ اس کو تمہاری طرح علم و حکمت، کتاب اور حجت وغیرہ عطا ہوئی سوائے اس کے جو تمہارے اس دین یہودیت کا پیرو ہو کہتے ہیں خیر کے یہودیوں نے مدینہ کے یہودیوں کو یہ بات کہی تھی تاکہ مبادا وہ اسلام کے حلقہ بگوش ہو جائیں۔

(۲) صرف پہلا حصہ کلام یہود ہے اور قُلْ اِنَّ الْهُدٰى کے بعد آخر تک خطاب الہی ہے اور اَنْ یُّؤْتٰی دراصل اَنْ لَا یُّؤْتٰی تھا یا کہ یہ اَنْ کا مضاف لفظ کَسْرًا ھِیۃً محذوف قرار دیا جائے پس معنی یہ ہوگا کہ یہودیوں نے اپنے عوام کو یہودیت پر ڈٹے رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ تم کسی کی بات پر یقین و باور نہ کرو۔ سوائے اس کے جو تمہارے دین پر ہو تو خدا ان کی تردید میں فرماتا ہے کہ اے مومنین۔ ہدایت وہی ہے جو اللہ کی جانب سے ہو اور یہ کہ کسی کو نہیں عطا ہوئیں وہ نعمتیں جو تمہیں عطا ہوئیں یا یہ کہ ناپسند فرماتا ہے اللہ کہ کسی کو عطا کرے وہ نعمتیں جو اس نے تم کو عطا فرمائیں اور اللہ کے نزدیک بزرگ محشر بھی تمہیں حجت سے کوئی مغلوب نہ کر سکے گا کیونکہ تمہارا دین حق ہے۔

(۳) اول سے آخر تک سب خطاب خداوندی ہے اور معنی یہ ہے کہ اے گروہ مسلمان تم کسی کی بات پر باور نہ کرو۔ سوائے اس کے جو تمہارے دین اسلام پر عمل کرنے والا ہو۔ کیونکہ دین صرف دین خدا ہی ہے اور کسی کے متعلق یہ یقین نہ کرو کہ اُسے تم جیسی نعمات عطا ہوئیں۔ یا وہ تمہیں قیامت کے دن اپنی حجت سے مغلوب کرے گا اس لئے کہ یہ دین دین حق ہے اس پر کسی کو حجت کے اعتبار سے غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۴) صاحب تفسیر میزان نے ذکر کیا ہے کہ اہلیت عصمت سے اس سے پہلے آیت کے متعلق منقول ہے کہ وہ یہودیوں کا اس وقت کا قول ہے جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا یعنی جناب رسالت صبح بیت المقدس کی طرف پڑھ چکے تھے جو یہود کا قبلہ تھا پھر تحویل قبلہ کے حکم سے نماز ظہر خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے پڑھی تو یہودیوں کی ایک جماعت نے کہا کہ جو حکم مسلمانوں پر دن کے پہلے حصہ میں اُتر ا تھا۔ اس پر ایمان لاؤ یعنی بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے کا حکم مان لو اور جو حکم دن کے آخر حصہ میں کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا ہے اس کا انکار و کفر کرو اور چونکہ تورات کی بشارت ایک یہ بھی تھی کہ نبی آخر الزمان دو قبلوں کی طرف نماز پڑھے گا۔ پس انہوں نے ایک دوسرے کو یہ کہنا شروع کر دیا۔ کہ یہ راز کی بات کسی کے سامنے نہ کہو اور کسی پر وثوق و باور نہ کرو سوائے اپنے ہم مذہب و ہم خیال لوگوں کے مبادا اُن کے قبلہ کا حکم پختہ ہو جائے اور مسلمانوں کو ہماری طرف سے اپنے قبلہ کی صحت کا اطمینان ہو جائے پس ہماری صاحب قبلہ ہونے کی خصوصیت ختم ہو کر وہ جلسے کی اور علاوہ بریں وہ میدان قیامت میں بھی ہمارے اُپر احتجاج کرنے کے قابل ہو جائیں گے پس خداوند کریم نے اس زعم فاسد کی تردید فرمائی کہ ہدایت وہی ہے جو اللہ کی جانب سے ہو اور فضل اُسی کے ہاتھ

وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنَهُ بِقِطَارٍ يُؤَدِّيهِ إِلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ

اہل کتاب میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر اس کو دیناروں کی تفصیلی کا امین بنایا جائے تو وہ واپس ادا کر دیں گے اور بعض اُن سے

إِنْ تَأْمَنَهُ بِدِينَارٍ لَا يُؤَدِّيهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا ذَلِكَ

ایسے بھی ہیں کہ اگر اُن کو ایک دینار بطور امانت دیا جائے تو نہ ادا کر دیں گے مگر در صورتیکہ اُن پر کھڑے رہو یہ اس لئے

بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيَّاتِ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبُ

کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم پر نہیں ہے ان پڑھ لوگوں کے بارہ میں کوئی گناہ اور بولتے ہیں اللہ پر جھوٹ

وَهُمْ يَعْمَلُونَ ﴿۵۶﴾ بَلَى مَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ وَاتَّقَى فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴿۵۷﴾

جان بوجھ کر ہاں جو شخص اس کے عہد کی دفا کرے اور ڈرے تو خدا ڈرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

میں ہے وہ جسے چاہے عطا فرماتا ہے۔ خواہ تم ایمان لاؤ۔ یا کفر کرو اور خواہ تم اس امر کا اظہار کر دیا اس کو چھپانے کی کوشش کرو اور انہوں نے اسی معنی کو ترجیح دیتے ہوئے اقوال گذشتہ کو سیاق آیت سے بعید قرار دیکر رد کر دیا ہے اور صاحب تفسیر صافی نے فرمایا کہ یہ آیت متشابہات میں سے ہے اور آئمہ طاہرین علیہم السلام سے اس کے حل کے متعلق کوئی روایت ہم تک نہیں پہنچ سکی۔

وَصْنِ أَهْلِ الْكِتَابِ: عبداللہ بن سلام کو ایک شخص نے دو ہزار دینار بطور امانت دیئے تھے اور اُس نے نہایت خوش اسلوبی سے واپس کر دیئے تھے لہذا اس کی مدح ہے اور فخاص بن عازور اس کو ایک شخص نے صرف ایک دینار بطور امانت دیا تھا لیکن اُس نے خیانت کر کے ادا نہ کیا لہذا اس کی مذمت ہے بعض مفسرین نے امانت ادا کرنے والوں سے مراد نصاریٰ اور خیانت کرنے والوں سے مراد یہودی لئے ہیں۔ بہر کیف تنزیل کا تعلق اگرچہ بعض موارد سے مختص ہو لیکن تاویل کے اعتبار سے ہر وہ شخص اس کا مصداق ہو سکتا ہے جو ان صفات کا حامل ہو۔

الْأُمِّيَّاتِ: یہاں اُن پڑھ لوگوں سے اُن کی مراد وہ لوگ ہیں جو اُن کے دین یعنی یہودیت پر نہیں تھے اور اُن کا خیال یہ تھا کہ خدا کے نزدیک ان لوگوں کے حق میں خیانت کرنا ہم پر مباح اور حلال ہے اور بروز محشر ہم سے اُن کے مال کی کوئی باز پرس نہ ہوگی اور یہ خدا پر اُن کا دیدہ و دانستہ بہتان ہے کیونکہ تورات میں صاف طور پر اس فعل بد کے ارتکاب سے منع کیا گیا ہے۔ مَنْ أَوْفَى: سیاق آیت کی رُو سے یہاں دفائے عہد سے مراد ادائے امانت ہے جناب رسالتاً سے ایک روایت میں منقول ہے کہ امانت کا ادا کرنا واجب ہے خواہ نیک کی ہو یا بد کی ہو اور آپ نے فرمایا کہ جس شخص میں تین عادتیں پائی جائیں وہ منافق ہے خواہ نمازی، روزہ دار اور اپنے آپ کو مومن کہلانے والا ہو (۱) جھوٹا (۲) خلاف وعدہ کرنے والا (۳) امانت کی خیانت کرنے والا۔ نیز فرمایا کہ جو شخص امانت کو ادا کرے گا۔ بروز محشر خدا اس کو حور عین عطا فرمائے گا۔

رَبَّانِيَّةً، سَبَّانِيَّہ کی جگہ ہے اور ربّانی رب کی طرف منسوب ہے لیکن رب کی طرف نسبت دیتے ہوئے اس میں الف و نون کا اضافہ کیا گیا ہے جس طرح لحدیہ کی طرف نسبت دیتے ہوئے لحدیّی کہہ دیتے ہیں اور اس سے مقصود صرف مبالغہ نہ ہو کر تلبس بنا بریں لحدیّی کا معنی ہوا کرتا ہے بڑی ڈاڑھی والا۔ اور یہاں معنی ہو گا رب کے ساتھ خصوصی نسبت رکھنے والا۔

وَلَا يَأْمُرُكُمْ :- اس سے پہلی آیت کی نسبت اگرچہ قوم نصاریٰ سے زیادہ ہے کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ کی طرف اپنے دعویٰ کو منسوب کرتے تھے لیکن اس کے مفہوم کا حصر صرف اُن ہی میں نہیں تھا۔ بلکہ تمام انبیاء کی شان یہی ہے اور اسی اعتبار سے دوسری آیت میں باقی انبیاء سے اپنے آپ کو منسوب کرنے والوں کے غلط عقائد کی بھی اُسی لہجہ میں نفی فرمادی کہ جس طرح کسی نبی سے یہ ناممکن ہے کہ اپنے لئے خدائی دعویٰ کرے اسی طرح کسی نبی سے یہ بھی ممکن نہیں کہ لوگوں کو ملائکہ اور انبیاء کی رُبوبیت کا درس دے پس اس میں صابی۔ عرب جاہلی اور یہود کے اقوال کی تردید ہو گئی کہ صابی باوجود اہل کتاب کہلانے کے ملائکہ کی عبادت کرتے تھے اور اسی کو اپنے دین کا جزو سمجھتے تھے اور عرب جاہلی اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کی طرف نسبت دیتے ہوئے حنفاء کہلاتے تھے اور باوجود اس کے ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے اور یہود حضرت عزرائیل کو ابن اللہ کہتے تھے۔

اَيَا مَوْكُفْر :- ان عقائد فاسدہ کی نسبت انبیاء سے دینے کا استبعاد بیان فرمایا ہے کہ تمام انبیاء تو دین اسلام کی طرف ہلانے والے تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ تم کو اسلام کی دعوت دیں اور تم اسلام قبول بھی کر لو اور پھر وہ تمہیں اس قسم کے کفریہ عقائد کی تعلیم دیں بلکہ یہ صرف تم لوگوں کی بہتان تراشیاں اور افتراء پر دازیاں ہیں اُن کا دامن عصمت اس قسم کی گندہ خیالیوں سے بالکل صاف اور متبرک ہے اور اس جگہ اسلام سے مراد دین فطرت ہے جس کی تبلیغ کے لئے جملہ انبیاء تشریف لائے اگرچہ جزوی فردعی اختلافات شریعتوں میں تھے لیکن وہ دین اسلام کے کلی عقائد سے منافات نہیں رکھتے تھے پس مقصد یہ ہے کہ کسی نبی کی شریعت میں بھی ان خرافات کی کوئی گنجائش نہیں۔

تَسْنِيْع :- یہ فرمائش صرف ان لوگوں تک محدود نہیں جو گذر چکے ہیں بلکہ قیامت تک کے لوگوں کے لئے تازیانہ عبرت ہیں جس طرح گذشتہ کسی نبی کو رب کہنے والے اس کی زد میں آتے ہیں اسی طرح تاقیامت کسی مخلوق کو رب کہنے والے اسی کے تحت میں آئیں گے اسی بناء پر حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ کہ میرے بارے میں دو قسم کے لوگ ہلاک ہوں گے ایک وہ جو میرے فضائل پر پردہ ڈالتے ہوئے مجھے اپنے عہدہ سے گرائیں گے اور دوسرے وہ جو مجھے میرے مرتبہ سے بڑھائیں گے یعنی جو میری رُبوبیت کے قائل ہوں گے جس طرح کہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں اسی قسم کے دو گروہ گمراہ ہو گئے۔ ایک یہودی جنہوں نے ان کی نبوت کا انکار کیا اور دوسرے نصاریٰ جنہوں نے ان کو خدا مان لیا پس جس طرح حضرت عیسیٰ نبی تھے اور مخلوق خدا تھے اسی طرح حضرت علی بھی عبد اللہ اور ولی اللہ ہیں اور یہی عقیدہ باعث نجات و فلاح ابدی ہے اور جو لوگ ان کی خدائی کے قائل ہیں وہ مذہب حق امامیہ کے اصول کے مطابق کافر اور مشرک ہیں۔ اسی طرح جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خدا نے سب کچھ اُن کے حوالہ کر دیا اور اب بے کار و بے اختیار ہے وہ بھی کافر و مشرک ہیں اور اس کو تفسیر کی پہلی جلد یعنی مقدمہ میں زیادہ واضح کیا گیا ہے۔

کتاب و اہل کتاب

بعض روایات میں اگرچہ جو سیوں کو بھی اہل کتاب کہا گیا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کون سی کتاب کی طرف منسوب ہیں اور قرآن مجید بھی اُن کے ذکر سے خاموش ہے قرآن میں جہاں کہیں اہل کتاب کا تذکرہ ہے اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہی ہیں۔

یہودیوں کے پاس جو کتب مقدسہ موجود ہیں جن کو وہ کتب سماویہ کی منزلت دیتے ہیں ان کی تعداد پینتیس بتائی گئی ہے۔

۱، تورات جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی یہ پانچ سفروں پر مشتمل ہے ۲، کتاب یوشع ۳، کتاب قضاۃ بنی اسرائیل ۴، کتاب راعوت ۵، سفر اول صموئیل ۶، سفر ثانی صموئیل ۷، سفر اول من اسفار الملوک ۸، سفر ثانی من اسفار الملوک ۹، سفر اول من اسفار الایام ۱۰، سفر ثانی من اسفار الایام ۱۱، سفر اول عزرا ۱۲، سفر ثانی عزرا ۱۳، سفر استیر ۱۴، کتاب الوب ۱۵، زبور داؤد ۱۶، کتاب الامثال ۱۷، کتاب الحجامہ ۱۸، کتاب تسلیح السابح (یہ تینوں کتابیں حضرت سلیمان کی طرف منسوب ہیں) ۱۹، کتاب نبوت اشعیا ۲۰، کتاب نبوت ارمیا ۲۱، مراثی ارمیا ۲۲، کتاب حزقیال ۲۳، کتاب نبوت دانیال ۲۴، کتاب نبوت یوشع ۲۵، کتاب نبوت یوسیل ۲۶، کتاب نبوت عاموس ۲۷، کتاب نبوت عزکیا ۲۸، کتاب نبوت یونان ۲۹، کتاب نبوت میخا ۳۰، کتاب نبوت ناحوم ۳۱، کتاب نبوت حقیق ۳۲، کتاب نبوت صفونیا ۳۳، کتاب نبوت حجی ۳۴، کتاب نبوت زکریا ۳۵، کتاب نبوت ملاخیا۔ لیکن قرآن میں ان مذکورہ کتب میں سے صرف تورات اور زبور کا صراحتاً ذکر موجود ہے نصاریٰ کے پاس کتب مقدسہ میں سے چھ کتابیں اور اکیس رسالے موجود ہیں جن کو صحف سماویہ سمجھا جاتا ہے۔

۱، انجیل متی ۲، انجیل مرقس ۳، انجیل لوقا ۴، انجیل یوحنا ۵، کتاب اعمال الرسل ۶، روایے یوحنا اور بولس کے چودہ رسالے۔ بطرس کے دو رسالے۔ یوحنا کے تین رسالے۔ رسالہ یعقوب اور رسالہ یہودا۔ لیکن قرآن مجید میں صرف اسی قدر ہے کہ حضرت عیسیٰ پر ایک کتاب نازل کی گئی جس کا نام انجیل تھا اور وہ صرف ایک انجیل تھی نہ کہ زیادہ۔ (میزان) حضرت موسیٰ کے بعد حضرت یوشع یہودیوں کے مذہبی پیشوا تھے اور ان کے بعد یہود کی قیادت قاضیوں کے ہاتھ میں ایک عرصہ تک رہی اور پھر بادشاہت نے اس کی جگہ لے لی۔ چنانچہ ان کا پہلا بادشاہ طاوت تھا جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے اور پھر حضرت داؤد، حضرت سلیمان، یکے بعد دیگرے بادشاہ ہوئے اور حضرت سلیمان کے بعد ان میں اختلاف شدید پیدا ہو گیا۔ جس سے ان میں کمزوری روز افزوں پیدا ہوتی گئی۔ اور تقریباً تیس تک ان میں بادشاہ ہوئے۔ جب بخت نصر (بخت نصر کی وجہ تسمیہ کے متعلق کہتے ہیں کہ اس نے کتیا کے دودھ سے پرورش پائی تھی جس کا نام بخت تھا اور اس کتیا کے الٹ کا نام نصر تھا پس اس بناء پر اس کا نام بھی بخت نصر مشہور ہو گیا اور بعض روایات میں سورنی کے دودھ سے اس کا پرورش پانا بھی ملتا ہے۔ نیز بعض نے کہا ہے کہ بخت کا معنی بیٹا اور نصر اُس بُت کا نام تھا جس کا یہ پجاری تھا اس وجہ سے اس کا نام بخت نصر یعنی نصر کا بیٹا مشہور ہو گیا) بابل کا بادشاہ ہوا تو اس نے یروشلم (بیت المقدس) کو فتح کر لیا اور یہودیوں پر اس کی حکومت کا سکہ جم گیا لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں انہوں

تورات اور یہودیت

لی۔ چنانچہ ان کا پہلا بادشاہ طاوت تھا جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے اور پھر حضرت داؤد، حضرت سلیمان، یکے بعد دیگرے بادشاہ ہوئے اور حضرت سلیمان کے بعد ان میں اختلاف شدید پیدا ہو گیا۔ جس سے ان میں کمزوری روز افزوں پیدا ہوتی گئی۔ اور تقریباً تیس تک ان میں بادشاہ ہوئے۔ جب بخت نصر (بخت نصر کی وجہ تسمیہ کے متعلق کہتے ہیں کہ اس نے کتیا کے دودھ سے پرورش پائی تھی جس کا نام بخت تھا اور اس کتیا کے الٹ کا نام نصر تھا پس اس بناء پر اس کا نام بھی بخت نصر مشہور ہو گیا اور بعض روایات میں سورنی کے دودھ سے اس کا پرورش پانا بھی ملتا ہے۔ نیز بعض نے کہا ہے کہ بخت کا معنی بیٹا اور نصر اُس بُت کا نام تھا جس کا یہ پجاری تھا اس وجہ سے اس کا نام بخت نصر یعنی نصر کا بیٹا مشہور ہو گیا) بابل کا بادشاہ ہوا تو اس نے یروشلم (بیت المقدس) کو فتح کر لیا اور یہودیوں پر اس کی حکومت کا سکہ جم گیا لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں انہوں

اس کی اطاعت سے سرکشی کی تو اس نے لشکرِ جزار بھیج کر اُن کو بُری طرح ذلیل کیا اُن کے خزانے لوٹ لئے مسجدِ اقصیٰ کو خراب کیا اور ان کے قریباً دس ہزار سربر آوردہ افراد کو اسیر کر لیا اور اُن پر اُن ہی میں سے ایک شخص صدقیا کو بادشاہ مقرر کیا جس سے اپنی اطاعت کا عہد لے لیا لیکن دس سال کے عرصہ میں فرعون مصر سے ساز باز کر کے اس نے پھر بخت نصر کی ماتحتی سے بغاوت کا اعلان کیا جس کے نتیجہ میں اُس نے دوبارہ اُن پر فوج کشی کی اور تقریباً ڈیڑھ سال تک ان کا محاصرہ جاری رکھا اور آخر کار فتح کر لیا۔ اور اس دفعہ اُس نے اُن کو پوری طرح تباہ و برباد کر ڈالا۔ بروایت چھ لاکھ کی فوجی سپاہ کے ساتھ یہ حملہ آور ہوا تھا۔ (سفینہ) اس واقعہ میں بخت نصر نے یہودیوں کی تمام عبادت گاہوں اور مذہبی کتابوں کو ختم کر ڈالا تھا اور اس کے پچاس سال بعد تک یہودیوں کے پاس نہ کوئی کتاب تھی نہ کوئی دوسری مذہبی نشانی باقی رہی تھی۔ آخر حکومت نے پلا کھایا۔ بنی اسرائیل بابل کے قید خانہ سے آزاد ہوئے ان میں سے ایک شخص عزرا جو بادشاہ وقت کا مقرب ہو گیا تھا اس کو بنی اسرائیل کا امیر مقرر کیا گیا۔ اور اس کو تورات کے لکھنے اور عبادت گاہوں کی از سر نو تعمیر کی اجازت دی گئی پس یہ لوگ واپس بیت المقدس کی طرف پلٹے اور عزرا نے پرانی کتابوں کی تلاش کر کے تورات کو از سر نو لکھا اور یہودیوں کی پاس اب تک وہی تورات موجود ہے یہ واقعہ صاف بتلاتا ہے کہ تورات موجودہ کی سند حضرت موسیٰ سے متصل نہیں ہے اور نیز کتاب تورات کا جامع عزرا نامی شخص بھی ایک غیر معلوم آدمی ہے لہذا نسخہ تورات کی پوزیشن کافی مخدوش ہے اور اس کے بعد اس پر تحریف و تحریف کا استبدادی دور تو اس کو اپنی اصلی صورت سے کہیں کا کہیں دور لے گیا۔ تاہم قرآن مجید کے اقتباسات سے اس قدر پتہ ضرور چلتا ہے کہ دور نبوت کی موجودہ تورات میں بعض احکام اپنی اصل پر باقی بھی تھے جن کی طرف رجوع کرنے کا بعض اوقات ان کو حکم دیا جاتا تھا۔

(لمحض ازبیران)

موجودہ چار انجیلیں جو اس وقت قوم نصاریٰ کے پاس ہیں اور انہی پر ان کی تبلیغ کا انحصار ہے۔ پہلی انجیل مٹی کی ہے جو سنہ ۳۰ء میں یا قبل اسے سنہ ۳۰ء کے درمیان

لکھی گئی کہتے ہیں کہ اس کی اصل عبرانی زبان میں تھی جس کا ترجمہ یونانی و دیگر زبانوں میں کیا گیا۔ نسخہ اصل کا کسی کو پتہ نہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ ترجمہ کس نے کیا تھا؟

دوسری انجیل مرقس کی ہے یہ خود حواریں میں سے نہ تھا بلکہ یہ بطرس کا شاگرد تھا اور اسی کے حکم سے اُس نے سنہ ۷۰ء میں یہ کتاب لکھی۔ تیسری انجیل لوقا کی ہے نہ یہ حواری تھا اور نہ حضرت عیسیٰؑ کا صحابی تھا بلکہ دین عیسائی اُس نے بولس سے سیکھا تھا۔ بولس پہلے ایک متعصب قسم کا یہودی تھا۔ کہتے ہیں یہ مرضِ صرع میں مبتلا ہوا تو عالم بے ہوشی میں حضرت مسیحؑ نے اس کو عیسائیت کی مخالفت پر ملامت کی پس وہ مسیح پر ایمان لایا اور پھر تبلیغ پر بھی مسیح کی طرف سے مامور ہوا اور موجودہ عیسائیت کا پرچار اسی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ نجاتِ اخروی میں صرف عیسیٰ پر ایمان لانا کافی ہے اور عمل کی کوئی ضرورت نہیں۔ مرور اور سور وغیرہ اسی نے حلال کئے اور ختنہ سے اسی نے روکا۔ پس لوقا نصرائیت میں اسی بولس کا شاگرد تھا۔ اور

اس نے انجیل مرقس کی انجیل کے بعد لکھی جبکہ بطرس اور بولس مرچکے تھے۔

چوتھی انجیل یوحنا کی ہے اور یہ یوحنا حضرت عیسیٰ کا محبوب ترین حواری زبیدی صیاد کا بیٹا تھا کہتے ہیں کہ ایشیا دیگر اطراف کے تمام پادری ۹۶ء میں یوحنا کے پاس جمع ہوئے اور اس سے ایک نئی انجیل کے لکھنے کی انہوں نے خواہش کی اور کہا کہ اس نئی انجیل میں ایسی چیزوں کا اضافہ ضروری ہے جس سے پہلی انجیلیں خالی ہیں چنانچہ اس نے ان کے امثال امر میں ایک نئی انجیل کی تصنیف کی اور بعض کہتے ہیں کہ یہ یوحنا کی تصنیف نہیں بلکہ یہ مدرسہ اسکندریہ کے ایک طالب علم نے لکھی تھی اور بعض کہتے ہیں کہ دوسری صدی عیسوی کے ادائل میں یہ کتاب لکھی گئی تھی اور اسکو مقبول علم کرنے کیلئے اسے یوحنا کی طرف منسوب کیا گیا بہر کیف یہ چار انجیلوں کی تصنیفی حقیقت ہے ان کا مرجع متی، مرقس، لوقا، یوحنا، بطرس اور بولس ہیں اور ان سب کے قدیم ترجموں کو ان سب کا مرجع قرار دیا جاسکتا ہے وہ انجیل متی کی ہے لیکن وہ بھی ایک ترجمہ ہے جس کی اصل مفقود ہے پس یہ بنیاد ہے مشرق و مغرب میں پھیلے ہوئے مذہب عیسائیت کی۔ نیز یہ تو اصلی چار انجیلوں کی حقیقت ہے لیکن نہ معلوم تحریف کے زبردست ہاتھوں نے اسے کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا اور بائیس ہزار قرآن صرف ایک انجیل کے متعلق تصدیق کرتا ہے اور اس قدر قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں کے ہاتھوں میں موجودہ انجیل بعض بعض جگہ احکام حق پر بھی مشتمل ہے جیسا کہ ان کو تصدیق رسالت کے لئے اپنی کتاب کی طرف رجوع کرنے کے حکم سے ظاہر ہوتا ہے (ملخص از میزان)

میتاق انبیاء

مجمع البیان میں منقول ہے حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ حضرت آدم سے لے کر آج تک تمام نبیوں کا عہد لیا گیا کہ جب جناب محمد مصطفیٰ مبعوث ہوں گے تو اگر تم زندہ ہو تو اس پر ایمان بھی لانا اور اس کی مدد بھی کرنا اور میری عہد تمام نبیوں نے اپنی امتوں سے بھی لیا تھا اور تفسیر صافی میں قمی و عیاشی سے منقول ہے کہ حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ تمام انبیاء ایک دفعہ پھر رجعت کریں گے اور امیر المومنین کی نصرت میں داخل ہوں گے۔

لَتَوْمِنَنَّ بِهِ سے مراد یہ ہے کہ جناب رسالت اکبر پر ایمان لائیں گے اور لَتَنْصُرُنَّهُ سے مراد ہے کہ حضرت امیر المومنین کی نصرت کریں گے اور حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی ایک طویل روایت منقول ہے جس کا ماحصل یہی ہے۔ نیز ایت کا ترجمہ یہ بھی کیا گیا ہے کہ تمام نبیوں سے عہد لیا گیا تھا کہ جو کچھ تمہیں کتاب و حکمت دی جائے پھر تمہارے پاس کوئی نبی تمہارے پاس والی چیز کی تصدیق کرنے والا ہو کر آئے تو اس کی نصرت کرنا اور اس پر ایمان لانا گویا تمام انبیاء سے باہمی ایمان و نصرت کا عہد و پیمان لیا گیا تھا اور بعض روایات میں اس طرح ہے کہ تمام انبیاء کی امتوں سے اپنے اپنے نبی پر ایمان لانے اور نصرت کرنے کا عہد لیا گیا یعنی نبیین کا مضاف اُمم لفظ مجزوف ہے اور معنوی طور پر مراد ہے۔

ایت کا تحت اللفظ جو ترجمہ موجود ہے وہ اس بناء پر ہے کہ حاکم کو شرط یہ معنی ہمارا قرار دیا گیا ہے اور لَتَوْمِنَنَّ بِهِ کو اس

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ

اور جب لیا خدا نے عہد نبیوں سے کہ البتہ جب دوں تم کو کتاب و حکمت سے کچھ پھر آئے تمہارے

كُم رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ

پس رسول جو تصدیق کرنے والا ہو اس کی جو تمہارے پاس ہو ضرور ایمان لانا اس پر اور اس کی مدد کرنا۔ فرمایا کیا تم نے اقرار کیا

وَإِذْ أَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَلِكُمْ أَصْرِي طَالُوا أَأَقْرَرْنَا ط قَالَ فَاشْهَدُوا وَإِنَّا مَعَكُمْ

اور قبول کیا۔ اس بات پر میرا عہد؟ سب نے کہا کہ ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا۔ گواہ ہو اور میں بھی تمہارے ساتھ

مِّنَ الشَّاهِدِينَ ﴿٨١﴾ فَمَنْ تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿٨٢﴾

گواہوں سے ہوں پھر جو پھرے گا اس کے بعد۔ پس وہ فاسق ہوں گے

أَفْغَيْرَ دِينٍ اللَّهُ يَبْغُونَ وَلَئِنَّ أُسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا

کیا دین خدا کے سوا کچھ اور چاہتے ہیں حالانکہ اس کی اطاعت قبول کر لی ہر آسمان و زمین کی چیرنے بونشی سے اور ناخوشی سے

کی جزا قرار دیا گیا ہے ورنہ اگر صاف کو موصولہ مانا جائے اور لَتُؤْمِنُنَّ کو جواب قسم بنایا جائے تو یہی دوسرا معنی صحیح ہوگا لیکن ترکیب اول اور معنی تحت اللفظی زیادہ مناسب ہے اور اس باب کی روایات بھی اسی کی تائید کرتی ہیں۔

أَفْغَيْرَ دِينٍ اللَّهُ یَبْغُونَ۔ کہتے ہیں جب یہود و نصاریٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق جھگڑا کیا اور جناب رسالت کا نام فیصلہ فرمایا کہ وہ نہ یہودی تھے اور نہ وہ نصرانی تھے تو دو لوگوں کو ناراض ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ ہمیں آپ کے فیصلے سے اتفاق نہیں ہے تب یہ آیت اتری۔

آیت مجیدہ کی تاویل حضرت قائم اہل محمد علیہ السلام کے زمانہ سے کی گئی ہے کہ اس وقت زمین خدا پوری طرح اسلام والوں سے آباد ہوگی اور کفر کا نام و نشان تک نہ ہوگا۔

چنانچہ تفسیر صافی میں اسی کو ترجیح دی گئی ہے اور عیاشی سے اسی مطلب کی روایت بھی نقل کی گئی ہے۔

وَمَنْ يَبْتَغِ الْوَعْدَ الْمُبْتَغَىٰ۔ تفسیر درمنثور سے منقول ہے کہ بروز محشر سب اعمال پیش ہوں گے تو اسلام بھی پیش ہوگا پس خدا اسی کو فرمائے گا کہ میرا مواخذہ اور جزا صرف تجھ ہی سے وابستہ ہے یعنی پہلے اسلام دیکھا جائے گا اور پھر اعمال کی باری آئے گی۔ اگر اسلام سے دشمنی ہوگی تو باقی اعمال کی تو کوئی قیمت ہی نہ ہوگی اور آیت مجیدہ کا بھی یہی مطلب ہے۔

كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ بَنِي إِسْرَءِيلَ۔ اس کے معنی کی کئی وجوہ ہیں، کس طرح خدا ایسے لوگوں سے ہدایت یافتہ لوگوں کا سا سلوک کرے

وَكُرْهَا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ﴿۴۶﴾ قُلْ أَمَّا بِإِلَهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ

اور اسی کی طرف بازگشت ہے فرمادیجئے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو کچھ ہم پر اتاری اور جو کچھ اتری

عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ

ابراہیم پر اسماعیل اسحق یعقوب اور ان کی اولاد پر اور جو کچھ عطا ہوئی

مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَالسَّيِّئُونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نَفِرُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ

موسے و عیسیٰ اور تمام نبیوں کو اپنے پروردگار سے (سب پر ہم ایمان لائے) اور کوئی فرق نہیں کرتے درمیان کسی کے

وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿۴۷﴾ وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ

ان میں سے (ایمان میں) اور ہم اسی کے اطاعت گزار ہیں اور جو شخص چاہے اسلام کے سوا کوئی اور دین توہرگز وہ اس سے

وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَسِرِينَ ﴿۴۸﴾ كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ

قبول نہ کیا جائیگا اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا کیسے ہدایت کرے اللہ اس قوم کو جنہوں نے کفر کیا بعد ایمان لانے

إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي

کے اور انہیں معلوم ہے کہ رسول برحق ہے اور آچکیں ان کے پاس واضح دلیلیں اور اللہ انہیں ہدایت فرماتا

جو اسلام کے بعد کفر پر چلے گا ۴۶، یہ اس طرح ہے جیسے کہا جائے کہ میں تجھے کونسا راستہ بتاؤں مالاںکہ راستہ تو وہی تھا جس

کو تو چھوڑ چکا ہے ۴۷، ایسے لوگوں کو خدا کیسے جنت کے راستہ پر گامزن کرے گا جنہوں نے اسلام کے بعد کفر کا ارتکاب کیا (میں)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ کہتے ہیں یہ ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جنہوں نے گزشتہ نبیوں پر ایمان لانے کے بعد حضرت

عیسیٰ کی نبوت و کتاب کا انکار کیا اور کافر ہو گئے اور پھر جناب رسالت کی نبوت کا کفر کر کے زیادتی کفر کے مرتکب ہوئے ان

کی توبہ قابل قبول نہ ہوگی بشرطیکہ وہ موت کے ڈر سے توبہ کر رہے ہوں ورنہ اگر اپنی زندگی میں بصحت و اس اپنے سابقہ کوتاہیوں

سے پشیمان ہو کر اپنے دل میں ایمان کو جگہ دیں اور اللہ سے معافی طلب کر لیں تو یقیناً ان کی توبہ مقبول ہوگی جس طرح کہ گزشتہ

آیت کا مضمون اس امر کا شاہد موجود ہے۔ اور اگلی آیت بھی صاف طور پر بتلا رہی ہے کہ دائمی عذاب صرف ان لوگوں کیلئے

ہے جو بحالت کفر مر جائیں لہذا قبل از آثار مرگ توبہ کرنیوالا یقیناً ناجی ہوگا اور آیت کا نزول اگرچہ معین اشخاص سے مختص ہو لیکن تاویل

کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے جاری ہے تو جس طرح گزشتہ انبیاء پر ایمان رکھنے والے اگر موجودہ وقت کے نبی کا کفر کریں تو اس کے

الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿۱۷﴾ أُولَٰئِكَ جَزَاءُ وَهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۱۸﴾ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ

قوم ظالمین کو ایسے لوگوں کی جزا یہ ہے کہ تحقیق ان پر اللہ کی لعنت اور فرشتوں اور

النَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۱۸﴾ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ

تمام لوگوں کی (لعنت) ہے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے کہ نہ تخفیف ہوگی ان سے عذاب کی اور نہ وہ مہلت دیئے

يُنظَرُونَ ﴿۱۹﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ

مبائیں گے مگر وہ لوگ جو توبہ کر لیں اس کے بعد اور اپنی اصلاح کر لیں تو تحقیق اللہ غفور

رَحِيمٌ ﴿۲۰﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ أَزَادُوا كُفْرًا لَّنْ يُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ

رحیم ہے تحقیق وہ لوگ جو کافر ہو گئے بعد ایمان لانے کے پھر زیادہ ہوئے کفر میں ہرگز نہ مقبول ہوگی ان کا توبہ

وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ ﴿۲۱﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَأَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ

اور وہی نہیں بچے گمراہ تحقیق وہ لوگ جو کافر ہوئے اور مر گئے حالت کفر میں تو ہرگز قبول نہ کیا جائے گا ان میں سے کسی

مِلُّ الْأَرْضِ ذَهَابًا وَلَوْ افْتَدَىٰ بِهِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نَّاصِرِينَ ﴿۲۲﴾

سے زمین کی پڑی کے برابر سونا اگرچہ وہ اس کا فدیہ دے دے ایسے لوگوں کے لئے عذاب دردناک ہے اور نہ ہوگا ان کا کوئی مددگار

مصدق میں داخل ہیں اسی طرح نبی پر ایمان لانے کے بعد اگر اس کے برحق وحی کی پیروی سے منہ موڑیں تو وہ بھی یقیناً اسی آیت کے مصداق میں داخل ہوں گے کیونکہ آیات قرآنیہ کے مضامین صرف ایک زمانہ تک کے لئے محدود نہیں ہیں۔

پس جس طرح قرآن قیامت تک زندہ ہے اس کی ہر ہر آیت قیامت تک زندہ ہے اور اس کے مصداق بھی قیامت تک کے لئے موجود ہونے چاہئیں۔ پس اس زمانہ میں حضرت حجت والی العصر علیہ السلام کے منکرین بھی اس آیت کے مصداق ہیں۔ ازراہ تاویل جس طرح کہ وہ لوگ ازراہ تنزیل اس کے مصداق تھے۔

یہ جلد یہاں ختم ہوئی اور چوتھی جلد جو تھے پارہ سے شروع ہوگی۔ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ہر عزم مصداق ۲۰ جون بروز منگل

دوسرا ایڈیشن ماہ اپریل ۱۹۶۲ء